صُبحانے فسانے

اشفاق احمد

www.hallagulla.com

"اپنے محلے کے امام مسجد کے نام! "

www.HallaGulla.com
پاک سوسائٹی
Virtual Home for Real People
ڈاٹ کام

ترتیب

اماں سردار بیگم

میری والدہ کا نام سردار بیگم تھا اور گھر کے سب چھوٹے بڑے ان کو "اماں جی'' کہہ کر بلاتے تھے لیکن ان میں میرے حساب سے کوئی ایسی خاص بات نہ تھی جس کی وجہ سے ان پر کوئی مضمون لکھا جائے ان کو ادب اور تاریخ کے فورم سے ہو کر گزرنے کی اجازت دی جائے۔ وہ ایک عام سی سیدھی سادھی اور گھر چوکھٹ کی بی بی تھیں جو زندگی کی پگڈنڈی پر سیدھے سبھاؤ چلتی ادھر سے ادھر پہنچ جاتی ہیں اور جن کے چلے جانے کے بعد کسی قسم کی کمی محسوس نہیں ہوتی اور وہ پیچھے رہ جانے والوں کے لیے کوئی خلا بھی نہیں چھوڑ تیں!

اس وقت بھی' جب میں یہ چند سطریں جلدی جلدی گھسیٹ رہا ہوں تو مجھے اپنی اماں کا چہرہ' ان کی باتیں اور ان کا زمانہ یاد کرنے میں بڑی دقت ہو رہی ہے۔ وہ ہماری زندگیوں میں بہت قریب ہوتے ہوئے بھی کبھی شدت سے نظر نہیں آئیں۔ معدوم معدوم سی رہیں اور موہوم سے زندگی گزار کر ایک روز گھر کے پچھلے دروازے سے نکلیں اور میانی صاحب چلی گئیں۔ وہ دبدبہ اور طنطنہ اور جاہ وجلال جو آٹھ کامیاب بچوں کی ماں میں ہوتا ہے کہ اس کا سایہ بھی ٹیڑھا نہیں پڑتا' میری ماں میں سرے سے مفقود تھا۔ وہ زمین سے' آسمان سے' زمانے سے اور ان کے خالق و مالک سے بہت ڈرتی تھیں اور کچھ اس دیواروں سے لگ لگ کر زندگی گزارتی تھیں کہ کسی کو ان کے بچوں کی خبر نہ ہو جائے۔ کوئی گنتی نہ کر لے۔ کسی کو ان کے گھرانے کے ''ہونے'' کا علم نہ ہو جائے۔ ان کے بس میں ہوتا تو وہ ہم کو بھی اپنے جیسا گمنام اور بے نام بنا کر اس دنیا میں داخل کر دیتیں اور پھر کسی کو علم تک بھی نہ ہوتا کہ اس عہد کے گوہر نایاب کس طرح مٹی میں مل گئے!

اس زمانے میں بچے نوکر نہیں پالتے تھے' مائیں پالتی تھیں۔ غریب مائیں' امیر مائیں' بھونڈی مائیں پھوہڑ مائیں' اور اپاہج مائیں' پاک باز اور طوائف مائیں سبھی اپنے بچے خود پالتی تھیں۔ ان کے پاس بچے پالنے کا سستا اور آسان نسخہ تھا کہ وہ گھر سے باہر نہیں نکلتی تھیں۔ بچے اپنی ماں سے چالیس پینتالیس گز کے ریڈیس میں کہیں بھی جاتے' کہیں بھی ہوتے' کہیں کھیلتے ان کو اچھی طرح سے معلوم ہوتا تھا کہ مشکل وقت میں ان کی پکار پر اماں بجلی کی طرح جھپٹ کر مدد کے لیے آموجود ہو گی اور وہ اپنی مشکل اپنی ماں کے گلے میں ڈال کر گھر کے اندر کسی محفوظ کونے میں پہنچ جائیں گے۔ اس زمانے کی مائیں بچوں کو اپنی عقل و دانش سے یا نفسیاتی ذرائع سے یا ڈاکٹر سپوک کی کتابیں پڑھ کر نہیں پالتی تھیں بلکہ دوسرے جانوروں کی طرح صرف ممتا کے زور پر پالتی تھیں۔ بچے بھی کھلونوں' تصویروں' ماؤں کی گودیوں اور لمبی لمبی کمیونٹی کمیشنوں کے بغیر پروان چڑھتے تھے اور ذہنی' جسمانی اور روحانی طور پر بڑے ہی سرسبز ہوتے تھے۔ ان کے پاس یقین کی ایک ہی

دولت ہوتی تھی کہ ماں گھر پر موجود ہے وہ ہر جگہ سے ہماری آواز سن سکتی تھی۔ جس طرح پکے پکے خدا پرست کو پورا پورا یقین ہوتا ہے کہ خدا اس کے حلقے میں ہر وقت موجود ہے اور وہ جب اسے پکارے گا، رگ جان سے بھی قریب پائے گا اسی طرح بچے کو بھی اپنی پکار اور ماں کے جواب پر مکمل بھروسہ ہوتا تھا!

میری ماں کچھ پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ گاؤں میں اپنے عالم فاضل، نوکری پیشہ چچاؤں کے چھٹی آنے پر جلدی جلدی جو کچھ پڑھ لیا' پڑھ لیا اس کے بعد انہوں نے کوئی کوشش نہیں کی۔ اخبار بڑی آسانی سے پڑھ لیتیں اور مظمونوں اور اداریوں کے رخوں کو بھی سمجھ لیتی تھیں لیکن لکھنے کے معاملے میں ان کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ گرمیوں کی لمبی اور بھرپور دوپہر لگا کر وہ ایک کاپی کا صفحہ لکھ تو لیتی تھیں لیکن اسے پڑھنا کافی مشکل ہو جاتا تھا۔ اماں کے ہجے بہت خراب تھے لیکن وہ اردو کے موثر الفاظ مثلاً مصداق' تضحیک' القصہ اور وغیرہ بڑے شوق سے استعمال کیا کرتی تھیں۔ گو ان الفاظ کے سپیلنگ ہمیشہ غلط ہوتے تھے لیکن یہ فقرے میں سجتے بہت تھے۔ ان کے خط کا کوئی لفظ کٹا ہوا نہیں ہوتا تھا ماسوائے ''طولعمرہ'' کے۔ وہ ہر بچے کے ساتھ طولعمرہ لکھنا ضروری خیال کرتی تھیں اور یہ لفظ بار بار کٹنے سے ہر بچے کے حصے میں کم از کم چھ طولعمرہ آ جاتے تھے اور نام کے سامنے ایک خوبصورت سی تجریدی جھالر بھی بن جاتی تھی ______ ان کے خطوں میں اکثر دو شعر بھی ہوا کرتے۔ جب کسی وجہ سے انہیں یہ احساس ہوتا کہ ہم میں تکبر' رعونت یا گھمنڈ کا کوئی شائبہ پیدا ہو گیا تو وہ اکثر لکھا کرتیں:

کبیرا ایسے ہو رہو جیسے نربل نیر
پیچھے پیچھے ہر پھرے کہت کبیر! کبیر!!

اور دوسرے جب انہیں ہمیں ''بک اپ'' کرنا مقصود ہوتا تو اپنی مخصوص لکھائی میں رقم کیا کرتیں:

الوالعرفان دانش مند جب کرنے پہ آتے ہیں
سمندر پھاڑتے ہیں' کوہ سے دریا بہاتے ہیں

جب میں نے ہوش سنبھالا تو میں نے دیکھا کہ اماں کو صبح تین بھینسوں کا دودھ دوھنا پڑتا تھا' بڑے ٹوکے کا گول پہیہ چلا کر دو پوے چارہ کترنا پڑتا تھا اور اٹھارہ آدمیوں کی روٹی پکانی پڑتی تھی۔ کبھی کبھی کچھ مہمان آ جاتے تو اٹھارہ سے بڑھ کر یہ تعداد اٹھائیس تک بھی پہنچ جاتی تھی لیکن ان کو یہ بوجھ ناگوارہ نہیں گزرتا تھا کہ ایک تو مہمان اپنا رزق ساتھ لاتے تھے' دوسرے ان کے آنے سے گھر کی برکتوں میں اضافہ ہو جاتا تھا' تیسرے ان کی وجہ سے بچوں سے ہر قسم کی بلائیں دور ہو جاتی تھیں۔

اماں کا چولہا کھلے صحن میں تھا۔ نہ اس پر دھوپ سے بچنے کی کوئی اوٹ تھی نہ بارش سے بھیگنے میں کوئی رکاوٹ۔ چودہ مرلے کے کھلے آنگن میں آسانی سے ایک چھتی ہوئی رسوئی بن سکتی تھی لیکن پتہ نہیں اباجی نے ایسا کیوں نہ کیا۔ اماں گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں بھٹیوں کی طرح گرم اور الاؤ سے زیادہ سرخ چولہوں کے پاس بیٹھ کر مزے سے روٹی پکایا کرتیں اور ہم اپنا اپنا کھانا اٹھا کر برآمدے میں پنکھے تلے چلے جایا کرتے۔ ان کے سرخ و سفید چہرے پر پسینے کی دھار نمودار ہوتی تو وہ ہاتھوں میں پیڑا پکڑے پکڑے آستین سے اپنا چہرہ پونچھ لیتیں

لیکن جب ان دھاروں کا دوابہ قابو سے باہر ہو جاتا تو وہ اپنے کھردرے دوپٹے کا ''بنوں'' سا بنا کر اس سے اپنا شرابور چہرہ رگڑ رگڑ کر خشک کر لیتیں۔ اگلی روٹی پر پھر یہی عمل دہرانا پڑتا۔ آفتاب بھائی اگر گھر پر ہوتے تو وہ چولہے کی دیوار کے ساتھ ایک منجی کھڑی کر کے اس پر مجنوں ڈال دیتے اور اماں کے لیئے سایہ مہیا ہو جاتا۔ بڑے مزے کا زمانہ تھا۔ ہم علم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ صحت جسمانی کے حصول میں بھی کوشاں تھے اور اماں ہمہ وقت ہماری خدمت گزاری پر مامور تھیں۔

اب جب میں اپنی بہوؤں اور بھانجیوں بھتیجیوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے اماں کا وہ ہولناک زمانہ یاد آتا ہے جب رات کے بارہ بجے کام کاج سے فارغ ہو کر دودھ کو جامن لگا کے ہارے میں رکھ کر چارپائی پر لیٹتی تھیں اور ملا کی اذان سے پہلے صبح کے کام کی چیزیں چولہے کے سامنے نصف دائرے میں رکھ کر بانگ کے ساتھ ہی مصلے پر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ نماز سے عجلت کے ساتھ فارغ ہوتے ہی وہ اپنے مخصوص انداز میں تلاوت شروع کر دیتیں اور پاؤ بھر پارہ خالص پنجابی لہجے میں تلاوت کرنے کے بعد دوپٹہ گردن سے لپیٹ کر دودھ بلونے لگتیں۔ اماں کی دھانی آواز پر ہم سب جاگ جاتے لیکن اپنے بستروں میں اسی طرح پڑے رہتے۔ میری دونوں آپائیں ایک ساتھ وضو کر کے ایک ساتھ تخت پوش پر چڑھتیں اور روشنی پھیلنے تک برابری ایک ساتھ نفل پڑھا کرتیں۔

جب لسی رڑکنے کی آواز بند ہو جاتی اور سارے میں پراٹھوں کی دھواں دھار خوشبو پھیلنے لگتی تو ہم ایک ایک کر کے اٹھتے اور منہ پر کچے پکے چھپا مار کر اماں کے سامنے پیڑھیوں پر آ بیٹھتے۔ بس یہی ایک وقت تھا جب ہمارے اور اماں کے درمیان کچھ واضح قسم کی گفتگو ہوتی ورنہ باقی کا سارا وقت تو اپنے اپنے کام میں بھسم ہو جاتا تھا۔

اب سوچتا ہوں تو کچھ عجیب طرح کے خیال اور انوکھی باتیں ذہن میں آ جاتی ہیں۔ اس وقت ان کا احساس ہو بھی جاتا تو پھر بھی ہم کچھ نہ کرتے۔ اب بھی تو بہت سی چیزوں کا احساس ہو چکا ہے اور احساس کی اس وسیع و عریض جھیل میں نت نئے احساس کے صاف پانی ہر روز شامل ہوتے رہتے ہیں لیکن کچھ بھی نہیں ہو پاتا۔ انسان دراصل بہت سہل انگار اور آرام طلب شے ہے۔ جب کبھی اس کا احساس اسے شدت سے تنگ کرنے لگتا ہے تو وہ دوسروں کے درپے ہو جاتا ہے اور ان کو شرم دلانے لگتا ہے کہ تم کو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیئے۔ کچھ جھڑکیوں اور الہنوں کا انداز تو اس غضب کا ہوتا ہے کہ وہ دنیائے ابلاغ میں کلاسیک کا درجہ اختیار کر جاتے ہیں!

میری ماں کے زمانے میں عورت محبت کے میدان میں سب سے آگے ہوتی تھی اور جب انعام تقسیم ہونے کا وقت آتا تو غائب غلہ ہو جاتی۔ اس کو مکٹ سجا کے، پہنچیاں پہن کے اور سرمہ کا جل لگا کے مہان خصوصی بننے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ نظروں سے اوجھل ہو کر ایسے اوہلے میں چھپ جاتی تھی کہ مدتوں اس کا اثر آثار کا پتہ تک نہ چلتا تھا۔ یہ مہارت شاید اس نے پردہ نشینی سے حاصل کی تھی۔ بڑے سے بڑا کام کرنے کے بعد بھی وہ ہیروئن کی سٹیج پر آنے سے کتراتی تھی۔ اس زمانے میں عورت کا روپ پری کا سا تھا۔ جب کوئی بھی نہ ہوتا تو وہ باغ لگا کر، پھول کھلا کر، تخت بچھا کر اور پکوانوں کے ڈھیر لگا کر غائب ہو جاتی تھی اور کہیں دور چھپ کر نوع انسانی کو خط و سرور کی محفل انبساط سے لطف اندوز ہوتے دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ وہ ہر کارکردگی کے پیچھے اپنی لاموجودگی کا امپریشن برقرار رکھ کے خلاقی کے وسیع تر دائرے کا مرکز بنی رہتی اور اس کو اس بات کا احساس تک نہ ہوتا کہ وہ یہ کام شعوری طور پر کر رہی ہے یا کسی مقصد کے لیئے کر رہی ہے۔

اماں کا ہر روز باریک باریک پالک' موٹے موٹے آلو اور گول گول ٹماٹر کاٹ کر انہیں بڑے پریم اور چاؤ کے ساتھ دھونا' ساتھ ساتھ کچھ پڑھتے پڑھتے جانا' گھی پیاز نمک مرچ ہلدی دھنیا اس طرح دیگچی میں اتارنا کہ کسی کی نظر ڈالنے سے بھی گریز کرنا' ڈوئی کی ہر گھومتا کے ساتھ پانی کا چھینٹا دینے کے بجائے چوڑے پیندے اور بڑے منہ کے ڈگمگاتے گلاس' ایلومینیم کے کٹورے' ہشت پہلو تانبے کی رکابیاں جو قلعی کے گھس جانے سے باتصویری ہو گئی تھیں' اصلی ریتی کی چھری جو درمیان سے گھس گھس کر کیلا کاٹنے والوں کی بانک بن گئی تھی اور مراد آباد جگ جس پر بڑے بڑے ابھرنواں پھول بنے تھے ________ چونکہ اس عہد کی عورتیں بور ہونے کے فن سے نا آشنا تھیں اسلیئے وہ گیارہ گیارہ سال تک ایک ہی قسم کے برتنوں کو دھوئے جاتی تھیں اور ان کی کمپنی میں خوش رہتی تھیں۔ میری ماں کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ اب جو تھالی دھونے کے لیئے اٹھائی ہے اور جس کے گلاب کی ساری پنکھڑیاں گھس گئی ہیں لیکن اسکی ناشپاتی کی ڈنڈی بالکل سلامت ہے' یہ طشتری اسحاق کی ہے۔ جس کا سب کچھ معدوم ہو چکا ہے' اس میں افتخار کھاتا ہے اور جس کا گلاب اور ناشپاتی اپنے اصل رنگ روپ کے ساتھ قائم ہیں' وہ اشتیاق کی پلیٹ ہے۔ اب جن برتنوں کی نامزدگیاں اس قدر محترم ہوں' ان سے کوئی ماں کس طرح سے بور ہو سکتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں تو ہر بے جان برتن کیسٹ کی طرح بولتا ہے اور کچن میں ریڈیو کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ ہر طرف میلہ سا لگا رہتا ہے!

کھانا کھاتے وقت ہم بہن بھائی بڑے دقیق مسائل گہری وارفتگی سے سلجھایا کرتے اور بحثا بحثی میں ہمارے فقرے کٹ کٹ کر آدھے سے بھی کم رہ جاتے۔ اس بین الکلیاتی مباحثے کے دوران اپنی اماں سے ہماری گفتگو اکثر ان جملوں تک محدود ہوتی تھی:

اماں آج نمک پھر زیادہ ہے۔

ہلدی کچی ہے' گھی پرانا ہے۔

مرچیں تیز ہیں۔

گونگلو کچے ہیں' ادرک سخت ہے۔

کھانا بدذائقہ ہے۔

اماں کے پاس ہر اعتراض کا ایک ہی شافی جواب ہوتا تھا کہ بے خیالی اور بھلکڑ پن سے یہ صورت حال پیدا ہوئی ورنہ نمک مرچ اور سبزی گوشت تو سب ٹھیک ٹھاک تھے۔

کھانے کے بعد ان اوقات میں بڑی آپا اور آفتاب بھائی فلسفے کی پیچیدہ گتھیاں سلجھا رہے ہوتے تو کبھی کبھی اماں بھی اس میں دخل دے دیا کرتیں۔ جب بھائی جان بنی نوع انسان کی ذبوں حالی اور ہندوستان کے پائمال و پریشان مسلمانوں کی بے بسی اور بے آبرو کا نقشہ کھینچتے تو وہ سب کی آنکھوں یں آنسو آ جاتے۔ اس سلسلے میں جب بے حس امیر مسلمانوں اور بدکردار مسلم رؤسا کا ذکر چلتا تو ہماری آنسوؤں سے لبریز آنکھوں میں خون اتر آتا۔ اماں ہلکے سے خوف' ذرا اسی ہچکچاہٹ کے ساتھ دبی ہوئی آواز میں کہتیں'' ہمیں اپنے غریب بہن بھائیوں کی حالت زار دیکھ کر اور ان کے بے سروسامانی اور بے آبروئی پر ترس کھا کر ان کی مدد نہیں کرنی چاہیئے بلکہ اللہ رسول کے حکم کی وجہ سے ان کی دستگیری کرنی چاہیئے۔ ترس کھانے اور آنسو بہانے کے مقابلے میں اللہ کے رسول کا حکم زیادہ زور آور اور زیادہ ڈاڈھا ہے۔ ہم کو

حکم ماننا ہے، ترس نہیں کھانا۔''

منجھلے بھائی ہاتھ اٹھا کر سنجیدگی سے کہہ دیتے ''اماں یہ باتیں آپ کی سمجھ سے اوپر کی ہیں اس لیئے آپ ان میں دخل نہ دیا کریں۔ ہو سکے تو ان کو غور سے سنا کریں اور ان پر عمل کی کوشش کریں۔'' اماں معذرت بھرا، شرمندہ سا چہرہ لے کر خاموش ہو جاتیں۔ لیکن کبھی کبھی پھر ایسا موقع آ جاتا کہ ان کے منہ سے ایسی ہی کوئی بات نکل جاتی اور ابا جی سمیت ہم سارے پنجے جھاڑ کر ان کے پیچھے پڑ جاتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان سے محبت نہیں کرتے تھے یا ہمارے گھر میں ان کی کوئی عزت نہیں تھی یا ہم ان کو مان نہیں دیتے تھے۔ ایسی بات نہیں تھی۔ ہمارے نزدیک وہ اتنی ہی معزز و محترم تھیں جس قدر پڑھے لکھے گروہ کے نزدیک ان پڑھ عوام الناس کا ٹولہ ہوتا ہے ماں ہونے کے رشتے سے اور انسان ہونے کے حوالے سے ہم اپنی ماں کا بڑا احترام کرتے تھے لیکن تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باعث ہم ان کو اپنے برابر کا نہیں سمجھتے تھے۔ وہ بڑی خوبصورت، بہت ہی حسین اور بے حد وجیہہ خاتون تھیں لیکن ان کے اور ہمارے درمیان کوئی علم کی قدر مشترک نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اور ہمارے درمیان کوئی ڈائیلاگ نہیں تھا۔ کبھی کبھار جب ہم اپنی شرافت علمی کی بدولت ان کے قریب آنے کی کوشش بھی کرتے تو وہ کوئی ایسا جملہ بول جاتیں جس کی پڑتال ہماری کتابوں سے نہیں ہوتی تھی، اس لئے ہم ایک مرتبہ پھر ان سے دور ہو جاتے۔ مثلاً ایک مرتبہ میرے والد اور بڑے بھائی زندگی اور موت پر اپنی خوبصورت آرا کا اظہار کر رہے تھے اور ہم سارے چھوٹے مبہوت ہو کر ان کے فلسفیانہ افکار سے مرعوب ہو رہے تھے کہ میرے والد نے کہا ''بات یہ ہے آفتاب میاں کہ موت ایک معمہ ہے اور اس کا کچھ پتا نہیں چلتا ''۔ اماں جو قریب بیٹھی بھنڈیاں کاٹ رہی تھیں، رہ نہ سکیں اور سر اٹھا کے بولیں ''موت اگر ایک معمہ ہے ڈاکٹر صاحب تو موت ہی اس کا حل بھی تو ہے!'' ابا جی نے غضب ناک آنکھوں سے اماں کی طرف دیکھ کر کہا ''جس بات کی سمجھ نہ ہو سردار بیگم، اس میں دخل نہیں دیا کرتے''۔ اماں پھر سر جھکا کر بھنڈیاں کاٹنے میں مشغول ہو گئیں۔

اماں کی یہ باتیں مجھے اب یاد آ رہی ہیں تو میں انہیں زور لگا کر بیان کرنے لگا ہوں۔ اس وقت تو میں بھی ابا اور اپنے دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ شامل ہوتا تھا۔

ہمارے گھر میں میری بڑی آپا کے مضمون ''تہذیب نسواں'' اور ''عصمت'' میں شائع ہونے لگے تھے اور اماں گرمیوں کی لمبی دوپہر صرف کر کے ان مضامین کو بڑی مشکل سے اٹھاتی تھیں۔ آپا نے کئی مرتبہ کہا بھی کہ اماں یہ آپ کے پڑھنے کی چیزیں نہیں ہیں کہ ان میں عورتوں کے مشکل مسائل کی نشان دہی کی گئی ہے لیکن وہ آپا کی بات کا جواب دیئے بغیر بڑی کاوش سے ان پرچوں کو ڈھونڈتیں اور اپنی بیٹی کے مضامین کا مطالعہ کر کے خوش ہوتیں۔ آپا کو ہندوستان کے دور دراز شہروں سے تعریفی خط آنے شروع ہو گئے تھے اور ہم سب بڑے فخر کے ساتھ ان خطوں کو با جماعت پڑھا کرتے تھے۔ اماں بھی گھومتے پھرتے، کام کاج کرتے، بہانے بہانے ہمارے پاس رک کر خطوں کی عبارت سنا کرتیں اور دل ہی دل میں اترایا کرتیں۔ ایک روز جب بڑی آپا نے ابا جی کی موجودگی میں اعلان کیا کہ اس وقت ہندوستان کے سبھی پڑھے لکھے لوگ میری تعریف کرتے ہیں اور میرا مان بڑھاتے ہیں تو اماں نے واشگاف الفاظ میں کہا ''جب سبھی لوگ کسی شخص کی تعریف کرنے لگ جائیں تو اس شخص کو آپ ہی شرم آنی چاہیے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ جب سب لوگ تمہاری تعریف و توصیف اور قدر افزائی پر

یکجا ہو جائیں تو تمہیں چوکنے ہو جانا چاہیے۔ یہ بہت ہی بری بات ہے''۔ یہ بات سن کر میری مضمون نگار آپا کا چہرہ اتر گیا اور ان کی آنکھیں بھر آئیں تو اباجی نے ہاتھ کے فہرآ گیں اشارے سے اماں کو کمرے سے نکال دیا۔ دراصل بڑی آپا ہمارے ابا کی ساری اولاد میں سب سے زیادہ لاڈلی تھیں اور ہم سب ان کے جلو میں باادب باملاحظہ ہوشیار ہو کر چلا کرتے تھے۔

کھانے پینے کے معاملے میں اماں کا دستور نرالا تھا۔ جب گھر کے سب لوگ' نوکر چاکر' مہمان اور کبھی کبھی آنے والے فقیر بھی کھا چکتے تو اماں کی باری آتی۔ وہ پہلے تو دیگچیوں میں آدھی چپہ روٹی پھیر کر انہیں درو تہہ جام سے لتھیڑتیں' پھر انہیں نیبو یا آم کے اچار سے کھاتیں اور ساتھ دھنیا گھولوا چٹنی میں انگلی ڈبو ڈبو کر لقمے کے ساتھ ساتھ چاٹتی جاتیں۔ اس وقت اماں چند ایسی لامعلوم بیماریوں میں مبتلا تھیں جن کے علاج دریافت نہیں ہوئے تھے۔ مثلاً پھل کھا کر ان کے معدے میں جلن ہونے لگتی تھی' مٹھائی کھانے سے ان کی آنکھیں سوج جاتیں اور پتی اچھلنے لگتی' دودھ پینے سے سر درد شروع ہو جاتا او پلاؤ کباب کھانے سے تنفس میں تیزی آ جاتی تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے پراٹھے کے ساتھ بھنا گوشت کھا لیا تھا تو مرتے مرتے بچیں۔ ٹھنڈا شربت' گرم چائے' آئس کریم اور فالودہ کھانے سے ان کی انتڑیوں میں سدے پڑ جاتے تھے اور مربہ کھانے سے ان کی نگاہ کمزور ہو جاتی تھی۔ ہم نے ساری زندگی ان کو کبھی ایسی بیماریوں میں مبتلا ہوتے دیکھا نہیں لیکن ان کی بیان حلفی پر یقین رکھا کہ اگر وہ ایسی بے اعتدالی کریں گی تو یقیناً ان خوف ناک بیماریوں میں مبتلا ہو جائیں گی۔

اماں باسی کھانے' پرانے ساگ' اترے ہوئے اچار اور ادھ کھائی روٹیاں بہت پسند تھیں۔ دراصل وہ رزق کی قدردان تھیں' شاہی دسترخوان کی بھوکی نہیں تھیں۔ میری چھوٹی آپا کئی مرتبہ خوف زدہ ہو کر اونچی آواز چیخا کرتیں:

''اماں حلیم نہ کھاؤ پھول گیا ہے۔ بلبلے اٹھ رہے ہیں''

''یہ ٹکڑا پھینک دیں اماں' سارا جلا ہوا ہے''

''اس سالن کو مت کھائیں' کھٹی بو آ رہی ہے''

''یہ امرود ہم نے پھینک دیئے تھے' ان میں کیڑا نکلا تھا''

''لقمہ زمین سے نہ اٹھائیں' اس سے جراثیم چمٹ گئے ہیں''

''اس کٹورے میں نہ پئیں' یہ باہر بھجوایا تھا''

لیکن اماں چھوٹی آپا کی خوف ناک للکاروں کی پرواکئے بغیر مزے سے کھاتی چلی جاتیں۔ چونکہ وہ تعلیم یافتہ نہیں تھیں اس لئے جراثیموں سے نہیں ڈرتی تھیں' صرف خدا سے ڈرتی تھیں!

اولاد کے بارے یں میری اماں کا بالکل دیہاتی ماؤں جیسا تھا۔ وہ جب بھی اپنے بچوں کی بھلائی کا سوچتیں' سب سے پہلے کل دنیا کی خیر مانگتیں۔ اس کے بعد دنیا بھر کے بچوں کی اور پھر ان کے طفیل اپنے بچوں کی صحت و سلامتی اور دین و دنیا میں سرخروئی کی طلب گار ہوتیں۔ میں نے ان کو بڑے بڑے سانحوں اور بڑی سے بڑی افتاد پر کبھی گھبرائے ہوئے یا بھرائے ہوئے نہیں دیکھا۔ لیکن جب کبھی بدقسمتی سے انہیں پولیس کی وہ وین نظر آ جاتی جس میں قیدی جیل سے کچہری لائے جاتے تھے تو ان کا رو رو کر برا حال ہو جاتا۔ وہ قیدیوں کو

مجرموں یا ملزموں کے بھیس میں نہیں دیکھتی تھیں بلکہ ماؤں کے بیٹوں کے روپ میں دیکھتی تھیں۔ ہاتھ باندھ کر اور چہرہ اوپر اٹھا کر ایک ہی التجا کئے جاتیں کہ یا اللہ ان کو معاف کر دے' ان کو' ان کو آزاد کر دے' ان کو اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے ملا دے۔ اماں کے ساتھ کبھی باہر جاتے ہوئے ایسی وین کا مل جانا ہم سب کے لئے سوہان روح بن جاتا تھا اور ہماری کوشش یہ ہوتی تھی کہ اس وین کو آتے دیکھ کر کسی بغلی گلی یا ملحقہ راستے سے نکل جائیں تا کہ اس پر اماں کی نظر نہ پڑے۔

جب میں ایف اے میں داخل ہوا اور میں نے درسی کتابوں کے علاوہ لائبریری میں دوسری غیر نصابی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا تو میں نے محسوس کیا کہ اماں میں علمی کے باوجود کچھ خوبیاں بھی ہیں جو عام لوگوں کو نظر نہیں آتیں۔ لیکن جب میں ان خوبیوں کو تلاش کرنے بیٹھا تو مجھے وہ تین سے زیادہ نظر نہ آئیں۔ اماں کو اپنا آپ' اپنی خوبیاں' اپنے کام اور اپنی مہربانیاں چھپانے کا ایسا اچھا ڈھنگ آتا تھا کہ وہ موہڑی ہو کر بھی بیک گراؤنڈ کے اندر زندگی بسر کرتی تھیں۔ کسی کو پتہ نہ چل جائے' کوئی جان نہ لے' کسی کو معلوم نہ ہو جائے کہ یہ کام اماں سردار بیگم نے کیا ہے اور اپنی کلا جگانے کے لئے کیا ہے __________ ایک مرتبہ جب میں نے ان سے پوچھا کہ آپ اپنی شادی پر توجہ کا مرکز ضرور بنی ہوں گی تو انہوں نے کہا "میری شادی دراصل میری شادی نہیں تھی' وہ تاج بی بی کی شادی تھی۔ اس شادی میں میرے گھر والوں نے مجھے بھی ساتھ بٹھا دیا اور تمہارے ابا سے میرا نکاح ہو گیا۔ اصل میں وہ شادی میری پھوپھی زاد بہن تاج بی بی کی تھی اور چونکہ اصل دلہن وہی تھی اس لئے سب کی توجہ اس ہی پر مرکوز تھی۔ میری شادی تو میری پھوپھی نے میرے والدین سے یہ کہہ کر نمٹا دی تھی کہ سردار بیگم کا پھاہا بھی ساتھ ہی کاٹ دو' پھر کہاں لوگ بار بار آتے پھریں گے!"

جب میں ادیب بن رہا تھا اور بڑی رات گئے گھر آتا تو اماں کو میرے اس دیر سے آنے پر بڑی تشویش تھی۔ جب تک میں نہ آتا' وہ چارپائی پر جھوٹ موٹ سوئی ہوئی کچھ پڑھتی رہتیں۔ جب میں آتا تو وہی اٹھ کر دروازہ کھولتیں اور وہی جلدی سے توا ڈال کر میرے لئے گرم گرم روٹی پکاتیں۔ میں نے ٹی ہاؤس سے اور کافی ہاؤس سے بہت کچھ کھایا ہوتا لیکن اماں کی خوشنودی کے لئے مجھے ان کے پاس چوکی پر بیٹھ کر باقائدہ کھانا کھانا پڑتا۔ ماں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "تو اتنی رات گئے کہاں سے آتا ہے؟" تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ اب میں یہ بات اپنی پیاری ماں کو کس طرح سے سمجھاؤں کہ میں ادیب بن رہا ہوں اور ادیب رات کو دیر سے ہی گھر آیا کرتے ہیں۔ مجھے اپنی بہت سی کمیوں کو پورا کرنا تھا اور کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنی تھیں۔ میرے تین افسانے چھپ چکے تھے اور مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ مرزا یاس یگانہ چنگیزی کون ہیں۔ میں اپنے کالج کی بڑی کلاس میں تھا' بڑی عمر کا تھا' پختہ کار تھا لیکن مجھے فراق کا "ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی" والا شعر نہیں آتا تھا اور اس کے اندرونی مطالب معلوم نہیں تھے۔ ہمارے کالج میں تھرڈ ائیر کا ایک لڑکا مظفر علی سید نامی علم کا دریا تھا اور اس کو مشرق و مغرب کے سارے رموز سے گہری آشنائی تھی۔ سنگ میل پشاور میں میرا چوتھا افسانہ شائع ہو چکا تھا لیکن مجھے ڈی ایچ لارنس کا علم نہ تھا۔ مظفر علی سید نے مجھے بتایا کہ لارنس کا ایک ناولٹ **"The man who died"** پنجاب پبلک لائبریری میں موجود ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ ایک نمبرڈ نسخہ ہے اور پرائیوٹ سرکیولیشن کے لئے چھاپا گیا ہے۔

اسی نے مجھے بتلایا کہ میرا جی کی نظم "لب جوئبار" کا کیا مفہوم ہے اور "کیسے تلوار چلی کیسے زمین کا سینہ۔۔۔۔" کا مطلب ہے۔

مظفر علی سید ہی نے مجھے میرا سین سے روشناس کرایا اور بتایا کہ میرا جی ساری عمر اس سے اپنا مدعا بیان نہیں کر سکا تھا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے بمبئی چلا گیا تھا' عین اسی طرح جس جارج مور کے ساتھ ہوا تھا۔ میں جارج مور کے بارے میں الف سے بے نہیں جانتا تھا لیکن میں نے اس طرح سے سر ہلایا جیسے میں نے اس کا سارا لکھا ازبر کر رکھا ہو۔ مظفر علی سید نے کہا" جارج مور اپنی ایک من پسند خاتون کو یہ بتلانا چاہتا تھا کہ وہ اس سے شدید محبت کرتا ہے اور اس کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں گزر سکتا۔ چنانچہ اس نے اپنی محبت کے اظہار کے لئے سڑک کے ایک ایسے موڑ کا انتخاب کیا جہاں اس کی محبوبہ ہر روز سیر کی غرض سے جایا کرتی تھی۔ اس نے کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ مور نے سوچا کہ اس موڑ پر نہ سہی تو اگلے پل پر میں اس سے ضرور بات کروں گا۔ لپک کر وہاں پہنچا تو اس کی محبوبہ دریا کنارے گل فروش سے ایک گلدستہ خرید رہی تھی۔ سوچا یہ مناسب مقام نہیں' خط لکھنا چاہئے۔ گھر آ کر ایک درد بھرا خط لکھا اور اپنی لینڈ لیڈی کے حوالے کر دیا کہ اسے احتیاط سے پوسٹ کر دینا۔ لینڈ لینڈی ڈاک خانے جا رہی تھی تو اسے آواز دے کر روکا کہ خط میں کچھ تبدیلیاں کرنی ہیں۔ تبدیلیاں ہو چکیں تو سوچا کہ ایسا خط مجھے خود پوسٹ کرنا چاہئے گھر سے نکل کر بڑی سڑک کے لال حصے پر پہنچا تو رک گیا کہ یہ لیٹر بکس ایسا ضروری خط پوسٹ کرنے کے لئے مناسب نہیں' اگلے چوراہے والے میں ڈالوں گا جہاں سے دن میں تین مرتبہ ڈاک نکالی جاتی ہے۔ مناسب حصے پر پہنچا تو خیال آیا کہ کیوں نہ ایسا اہم خط جی پی او جا کر سپرد ڈاک کیا جائے! جی پی او بہت دور تھا۔ معاملہ اگلے دن پر ڈال دیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خط جارج مور کی زندگی میں پوسٹ ہی نہ ہو سکا' ادھر ادھر ہو گیا۔ حال ہی میں اس کے سوانح نگار نے خط شائع کیا ہے جس میں وہی باتیں ہیں جو میرا جی' میرا سین سے کرنی چاہتا تھا۔

اماں نے دبی زبان میں مجھ سے پھر پوچھا کہ" تو اتنی رات گئے کہاں سے آتا ہے؟" میں رات رات گئے تک ادیبوں اور دانشوروں کی محفل میں رہتا تھا اور ان سے بڑی تیزی کے ساتھ وہ گر سیکھ رہا تھا جن کی بدولت وہ نامی گرامی شاعر' ادیب اور مفکرین بن گئے تھے اور لوگ سڑک کے دونوں کنارے منہ میں انگلیاں ڈال کر انہیں دیکھتے تھے۔ منٹو بمبئی سے لاہور آ کر لکشمی مینشن میں آباد ہو گیا تھا۔ وہ حلقہ ارباب ذوق اور انجمن ترقی پسند مصنّفین دونوں کی بزموں میں افسانے پڑھتا تھا اور آستین چڑھا کر پڑھتا تھا۔ اس نے میرے افسانے دیکھ کر کہا" خواجہ تم نے جب بھی اپنی کتاب چھاپی' میں اس کا فلیپ لکھوں گا۔ تم بڑے ڈرپوک سے افسانے لکھتے ہو اور چونکہ وہ میرے مزاج کے الٹ ہوتے ہیں' اس لئے مجھے پسند بہت ہیں۔"

محمد حسن عسکری' احمد ندیم قاسمی' مولانا صلاح الدین اور مختار صدیقی میرے پسندیدہ رائٹر تھے اور ان سے ایک محتاط حد تک بے تکلف بھی ہو گیا تھا۔ زوبی میرا واحد بے تکلف دوست تھا اور اس نے لارنس باغ کے اوپن ایئر تھیٹر میں اپنا سٹیڈیو بنا لیا تھا۔ دن کا میرا زیادہ وقت اس سٹوڈیو میں گزرتا اور راتیں ٹی ہاؤس' کافی ہاؤس اور مال روڈ کی مٹرگشت کے حوالے ہو جاتیں۔

اماں نے ایک مرتبہ پھر ہولے سے پوچھا" تو اتنی رات گئے کہاں سے آتا ہے؟" میں نے قیمہ مٹر لپٹے گرم روٹی کے لقمے کو ہاتھ میں روک کر کہا" اماں میں ادیب بن رہا ہوں' دانشور بن رہا ہوں' اور چونکہ ادیبوں اور دانشوروں کی راتیں عام طور پر گھروں سے باہر گزرتی ہیں اس لئے میں راتیں باہر گزارنے پر مجبور ہوں۔"

اماں نے حیران ہوکر پوچھا ''تو ادیب کیوں بننا چاہتا ہے؟''

میں نے کہا ''میں علم پھیلانا چاہتا ہوں اور لوگوں کو عقل سکھانا چاہتا ہوں۔ میں کتابیں لکھوں گا۔ تصنیف و تالیف کروں گا۔''

''اور یہ جو اتنی ساری کتابیں پہلے لکھی رکھی ہیں۔۔۔ا'' اماں نے پوچھا ''ان کا کیا بنے گا؟ ان کو کون پڑھے گا؟'' مجھے اپنی اماں کی سادہ لوحی پر ہنسی آ گئی اور میں یہ سن کر دنگ رہ گیا کہ میری اماں کو تصنیف و تالیف کے عمل سے بھی واقفیت نہیں ہے۔ میں نے ہنس کر کہا'' میری پیاری اماں! اب تک کی چھپی ہوئی کتابیں لوگوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں۔ میرے حساب سے اوسط درجے کی تحریریں ہیں اس لئے میں خود نئی کتابیں لکھ کر زمانے کے سامنے پیش کروں گا اور ان کے علم میں اضافہ کروں گا۔''

اماں کو میری یہ بات ٹھیک سے سمجھ آ گئی۔ اس نے اپنا چہرہ میری طرف کئے بغیر نئی روٹی بیلتے ہوئے پوچھا ''تو اپنی کتابوں میں کیا پیش کرے گا؟''

میں نے تڑپ کر کہا ''میں سچ لکھوں گا ماں اور سچ کا پرچار کروں گا۔ لوگ سچ کہنے سے ڈرتے ہیں اور سچ سننے سے گھبراتے ہیں ۔ میں انہیں سچ سناؤں گا اور سچ کی تلقین کروں گا۔''

میری ماں فکر مند سی ہو گئی۔ اس نے بڑی دردمندی سے مجھے غور سے دیکھا اور کوئلوں پر پڑی ہوئی روٹی کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا ''اگر تو نے سچ بولنا ہی ہے تو اپنے بارے میں بولنا' دوسرے لوگوں کی بابت سچ بول کر عذاب میں نہ ڈال دینا۔ ایسا فعل جھوٹ سے برا بھی ہوتا ہے۔''

مجھے اپنی اماں کی سادہ لوحی پر بہت ہنسی بھی آئی لیکن اس کے احترام کی وجہ سے میں ہنسا نہیں' آرام سے بیٹھ کر کھانا کھاتا رہا اور اس کے روٹی پکانے کی آواز سنتا رہا۔ میری ماں بے چاری یا تو کھانا پکا سکتی تھی یا گھر کے دوسرے کام کر سکتی تھی' اس میں باریک باتوں کی سمجھ مطلق نہیں تھی!

اصل میں اماں دماغ کے بجائے دل کو سوچ کا مرکز سمجھتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ جو بھی بات ہو' جو بھی سوچ یا تصویر کی جو بھی لہر پیدا ہوتی ہے' وہ انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے اس لئے دل ہی عقل کا اور فکر کا منبع ہے۔ دماغ کو وہ سر کے اندر استر کے طور پر خیال کرتی تھیں تاکہ اس پر مضبوطی سے پگڑی باندھی جا سکے یا برقعے کی ٹوپی فٹ کی جا سکے۔ ان کا خیال تھا کہ اللہ نے جو تدبر کا اور تفکر کا حکم دیا ہے تو دل کے تفکر اور تدبر کے لئے دیا ہے کیونکہ دماغ سے تو ایسی باتیں سوچی ہی نہیں جا سکتیں جن کا تعلق روح سے اور اللہ کے احکام سے ہوتا ہے۔

مجھ سے بڑے بھائی اسحاق نے اور ہمارے سب سے بڑے بھائی جان نے اماں کے ساتھ اس معاملے پر تفصیل سے بحث کی اور انہیں ہر چند قائل کرنے کی کوشش کی کہ سوچنے اور غور کرنے کا کام صرف دماغ کرتا ہے اور انسان کی ساری یادیں اور یادداشتیں اس کے دماغ میں محفوظ ہوتی ہیں جن کے کارڈ نکال نکال کر وہ نئے تجربات اور نئے مشاہدات کے ساتھ ملاتا ہے اور ان یں اصلاح و تطبیق کرتا رہتا ہے۔ لیکن اماں جو کبھی بھی ایسے مباحث میں دخل نہیں دیا کرتی تھیں' اپنی پر اڑی رہیں اور دل ہی کو فکر اور خیال کا ہیڈ کوارٹر سمجھتی رہیں۔ بلکہ اس گفتگو میں انہوں نے ایک اور عجیب بات کی جس پر ہم دل کھول کر ہنسے اور ''اماں پیاری زندہ باد'' اور ''اماں اماں ہپ ہپ ہرے'' کے

نعرے مارتے رہے۔

میری بڑی خالہ جو مزاروں مجاوروں اور دھمالوں قوالوں کی رسیا تھیں' ایک مرتبہ اماں کو اپنے پسندیدہ قوال عظیم پریم راگی کا گانا سنوانے لے گئیں۔ اماں عظیم پریم راگی کی شکل وصورت' اس کے بھیس لباس اور پوشش پیرہن سے اتنی متاثر ہوئیں کہ دیر تک بت بنی فن کی اور فنکار کی بولتی فلم اپنے قلب ونظر پر اتارتی رہیں۔ جب لوٹ کے گھر آئیں اور ہم نے ان سے ان کے نئے تجربے کی بابت پوچھا تو انہوں نے کوئی شافی جواب نہ دیا' بس غوں غاں سا کر کے رہ گئیں۔ لیکن جس روز اسحاق بھائی اور آفتاب بھائی جان نے ان سے دل اور دماغ کے بنیادی فرق پر سیر حاصل گفتگو کی تو انہوں نے اپنے مشاہداتی علم پر پوری ٹیک لگا کر بڑے یقین کے ساتھ کہا ''آفتاب میاں! یاداشت خالی دماغ میں ہی نہیں ہوتی بلکہ بدن کے ہر اس انگ میں ہوتی ہے جو کسی خاص فعل کی مسلسل پرورش کرتا ہے اور اس فعل کو محبوب جانتا ہے۔

'' بھائی جان نے بڑی حیرانی کے ساتھ عینک کے پیچھے اپنی روشن روشن آنکھیں گھما کر اسحاق بھائی کو دیکھا کہا'' اماں یہ آپ نے کیا بات کر دی۔ اسے ایک مرتبہ پھر تو دہرائیں۔ آپ سے تو ایک بڑا خیال سرزد ہو گیا ہے''۔

اماں نے شرمندگی کے ساتھ ہولے سے نفی میں اپنا سر ہلایا تو اسحاق بھائی نے دلاسا دیتے ہوئے کہا'' بتائیں بتائیں اماں ' گھبرائیں نہیں۔ آپ کے دل میں یہ خیال کیسے آیا؟'' اماں نے حوصلہ پا کر کہا'' جب عظیم پریم راگی باجہ بجا رہا تھا تو اس کی انگلیاں کالے اور سفید سروں پر جگہ دیکھے بغیر' رکے بغیر اور صحیح چابی کو پہچانے بغیر بجلی سی تیزی کے ساتھ چل رہی تھیں۔ ان ساری سروں کی یادداشت' ان کی مہارنی' ان کا حافظہ راگی کی انگلیوں میں تھا' اس کے دماغ میں نہیں تھا۔ اور جب عظیم پریمی راگی گا رہا تھا اور تان پلٹے لے رہا تھا تو سارا گیت اور اس کے سارے بول اس کے حلق کے حافظہ سے برآمد ہو رہے تھے' اس کے دماغ سے نہیں۔'' ہم نے اس وقت تو تالی بجا کر اور'' تھری چیرز فار ماما'' کر کے اماں کو ان کی تحقیق پر شرمندہ کر دیا لیکن آج میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اس وقت مغربی ممالک میں میموری کے ڈسپلن پر جو ریسرچ ہو رہی ہے' اگر کسی نے یہی بات سلیقے کے ساتھ کسی ولایتی زبان میں کھول کر بیان کر دی تو سائنسی دنیا میں ایک نمایاں تبدیلی آ جائے گی۔

ان ساری باتوں کے باوجود میری اماں میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی کہ اس پر باقاعدہ ایک مضمون لکھا جا سکے یا اس کو دنیا کی ان ماؤں کے مقابلے میں کھڑا کیا جا سکے جنہوں نے اپنی زندگیوں میں عظیم کارنامے سرانجام دیئے اور اپنی زندگیاں انسانیت کو عظمت عطا کرنے کے کئے وقف کر دیں۔۔۔۔ میری ماں تو ان عورتوں میں سے تھی جو گارڈ کی جھڑکی سے ڈر کر سامنے کے لباب ڈبے میں گھس جایا کرتی ہیں اور زندگی کے کمپارٹمنٹ میں مناسب جگہ نہ پا کر گاڑی کے فرش پر ہی بیٹھ جایا کرتی ہیں' وہ بھی ایسی جگہ پر جہاں غسل خانے میں جانے والی ہر بی بی کے لئے انہیں بار بار اٹھنا پڑتا ہے اور اس وقت تک کھڑے رہنا پڑتا ہے جب تک بی بی واپس آ کر اپنی سیٹ پر نہ بیٹھ جائے۔۔۔۔ میری ماں تو ان عورتوں میں سے تھی جن کو اگر رنگ ریز ڈانٹ کر کہے'' بی بی یہی رنگ پیلا کیا ہی ہے'' تو وہ ڈر کے مارے اپنے پلو سے پیسے کھول کر فوراً اسے دے دیتی ہیں اور یہ نہیں پوچھ سکتیں کہ'' بھائی اگر یہ پیلا کیا ہی ہے تو پھر اس کا رنگ جوگیا کیوں ہے!''

اب میں کیا کہوں اور کیا لکھوں اور کیسے بتاؤں کے میری اماں ان عورتوں میں سے تھی جو دن بھر گھاس کھود کر شام کو گوالمنڈی میں کسی اہلکار کی

ڈانٹ سہ کر اور اپنا سارا پولا اسے سے کر خالی ہاتھ گھر واپس آجایا کرتی ہیں اور پھر خالی ہاتھ گھر آنے پر گھر والوں کے طعنے الہنے بھی برداشت کرتی ہیں۔ میری ماں تو ان عورتوں میں سی تھی جو گھر سے ملکہ بننے کے لئے نکلتی ہیں اور رسم تاج پوشی ادا ہو چکنے کے بعد اپنے محل میں ٹا کی مارتی ہوئی عورت کے ہاتھ سے ٹا کی لے کر خود بھی اس کے ساتھ شامل ہو جایا کرتی ہیں۔ اب ایسی عورتوں پر تو ماضی میں کبھی مضمون لکھے گئے اور نہ آئندہ لکھے جانے کی توقع ہے۔ ایسی عورتیں تو ہوا کے جھونکے کی طرح ہوتی ہیں کہ اس کے لمس سے ٹھنڈک کا احساس تو ہوتا ہے مگر خود کہیں نظر نہیں آتا!

میری ماں جو اپنے چچاؤں کی بے حد لاڈلی بھتیجی اور اپنے خاندان کی پہلوٹھی کی اولاد ہونے کے رشتے سب کی آنکھوں کا تارا تھیں' بہ اختیار خود اور حسب دل خواہ اپنی برتری کو سستے داموں بیچ کران جھاڑ وٹو کرے والیوں کے گروہ میں شامل ہوگئی تھیں جن کا اول و آخر' ظاہر و باطن' ملجا و ماویٰ' رنج و غم اور سود زیاں صرفان کے بچے ہوتے ہیں۔ اگر میری ماں کے بچے نہ ہوتے تو وہ خود بھی نہ ہوتیں۔۔۔۔ادھر کا رخ کبھی بھی نہ کرتیں اور زندگی کے ان طول بلد سے تعلق ہی نہ رکھتیں۔ وہ اپنے بچوں کی تخلیق اور انہی کا حوالہ تھیں۔ ان کا صرف ایک ہی فریم ورک تھا: اور ان کے بچوں کا ایک ہی مقصد تھا: خدمت' حضوری' سروس اور بندگی کی طلب گاری۔ جس طرح ہر سمجھ دار بچہ اپنی ماں کو اپنی بچہ شدگی کا تحفہ اور تسلی دے کر اسی سے فل سروس لیتا ہے اس طرح ہم سب بہن بھائی اپنے ''اولادپنے'' کا لیٹر آف کریڈٹ کھول کر اماں سے ہر شے درآمد کر لیتے تھے، وہ خوشی سے اپنا سب کچھ سپلائی کئے جا رہی تھیں' اپنا سب کچھ نچھاور کئے جاتی تھیں اور ہم دونوں ہاتھوں سے ہر شے' ہنسی خوشی سمیٹنے جا رہے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں میرے بڑے بھائیوں کی شادیاں ہوئیں تو میری ماں دادی بن جانے کے بعد اپنے بیٹوں پوتوں' نواسے نواسیوں اور بہوؤں کے درمیان کافی مقبول ہوگئی تھیں۔ ہم لوگ بھی ان کے ساتھ بے تکلفی کے مظاہرے کر لیتے تھے اور وہ بھی اکثر اوقات بلا جھجک ہماری باتوں کے جواب دے دیا کرتی تھیں۔ لیکن انہی ایام میں بدقسمتی سے ایک موقع ایسا بھی آیا جب اماں ہم سب کی زندگیوں سے مکمل طور پر خارج ہوگئیں۔ ہم نے ان کے احترام میں کوئی کمی واقع نہ ہونے دی البتہ ان کے ذہنی طور پر ماؤف ہو جانے کی وجہ سے ان سے بصد ادب قطع تعلقی کر لی اور درگزر کرنے والے ایک نئے صوفی کی طرح ان سے تھوڑا بہت رابطہ ضرور رکھا لیکن اس رابطے میں پسرانہ بے تکلفی کو کوئی جگہ نہ دی۔

جس طرح گبن نے رومن ایمپائر کے زوال کے اسباب بڑی وضاحت سے بیان کئے ہیں اور سلطنت مغلیہ کے زوال جادو ناتھ سرکار نے روشنی ڈالی ہے اسی طرح اپنی ماں کے زوال پر میری بھی نظر ہے۔ اس کے زوال کی بہت سی وجوہات نہیں ہیں بلکہ سارے زوال کا ایک ہی باعث ہے۔ اس ایک باعث نے ہماری ماں کو جیتے جی ہم سے علیحدہ کر دیا اور ہم نے اختیاری طور پر اس سے اجتناب برتنا شروع کر دیا ہم ان کے ادب اور احترام میں کسی کمی کے روادار نہیں تھے لیکن ساتھ ساتھ ہم یہ بھی چاہتے تھے کہ ہمارے بچوں پر ہماری آئندہ نسلوں پر ان کی سوچ کا' ان کے رویے کا اور ان کی وضع کا کوئی اثر نہ پڑ جائے۔ ہمیں ڈر لگنے لگا تھا کہ اماں کے طرز فکر کی چھائیں ہماری اولاد پر ضرور پڑیں گی اور وہ اپنی ناروا تاثیر سے ہمارے بچوں کو رجعت پسندی کی طرف ضرور مائل کر دیں گی۔ اس خوف کے پیش نظر ہم

سب نے اپنے روابط ان سے قریباً قریباً ختم کر لئے اور ان کو آسودگی کو ساتھ اکیلے زندگی بسر کرنے پر مائل کر دیا۔

اس سارے سانحے میں ہم دونوں پارٹیوں کا کوئی قصور نہیں۔۔۔۔نہ اماں کا نہ ہمارا۔نہ ہی ہماری وجہ سے یہ واقعہ ظہور پزیر ہوا۔ یہ بھی امریکہ کا ایک شاخسانہ تھا۔ہمارا سارا گھر بیٹھے بٹھائے اس کی لپیٹ میں آ گیا اور اس نے ہمارے اور ہماری ماں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل کر دی۔

ہوا یہ کہ ایک دن پشاور کے بڈابیر ہوائی اڈے سے ایک امریکی یوٹو طیارہ اونچی پرواز پر اڑا اور اس نے روس کی سرحدوں میں داخل ہو کر فوجی ٹھکانوں کے بہت ہی حساس قسم کے فوٹو اتار لئے۔روس کے ریڈواروں نے چیخ چیخ کر یہ خبر روسی کنٹرول روموں میں نشر کی لیکن جب تک روس کے مدفعتی لڑاکا طیارے اپنی فضاؤں میں بلند ہوئے' امریکی یوٹو جہاز اپنی کاروائی مکمل کر کے واپس پشاور پہنچ گیا تھا اور تیز نظر کیمروں سے اتاری ہوئی تصویریں پراسس ہونے کے لئے لیبارٹری بھیجی جا چکی تھیں۔۔۔۔۔روس نے اپنے سارے ریڈیو سٹیشنوں کے دہانے کھول کر پوری دنیا میں یہ بات الم نشرح کر دی کہ چونکہ یہ جہاز پشاور کے امریکی اڈے سے اڑا رہا تھا اس لئے ہم نے اپنے ہر نقشے میں پشاور کے گرد ایک سرخ دائرہ ڈال دیا ہے اور اپنے ہوا بازوں کو اس شہر کے طول بلد اور عرض بلد کی جزائیات فراہم کر کے حکم دے دیا ہے کہ اب شہر پشاور کو دنیا کے نقشے سے اور کرہ ارض کے سینے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیا جائے۔اس شہر کو تباہ کرنے کی تاریخ اور وقت سے ہم جلدی ہی دنیا کو آگاہ کر دیں گے۔

جب روس کا یہ اعلان دنیا کے اخباروں میں چھپا تو ہم سب کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔روس ایسا ملک نہیں تھا جسے پاؤں پڑ کر منایا جاسکے اور معافی مانگی جاسکے۔پھر ہم سے غلطی بھی اتنے بڑے سٹینڈرڈ کی ہوئی تھی کہ اگر روس کی جگہ کوئی اور ملک ہوتا تو ہمیں کوشش کے باوجود معاف نہ کر سکتا۔

آکاش وانی نے اس خبر کو نون مرچ لگا کر دنیا کی تقریباً ہر زبان میں نشر کرنا شروع کر دیا۔ہر آدھ گھنٹے کے بعد بھارت کے دانشوروں کا ایک پینل اپنے ریڈیو پر جمع ہوتا اور اس واقعے کے آئندہ اثرات سے دنیا کو مطلع کرتا۔پاکستان میں بھی اس حماقت پر شدت کا ردعمل ہوا اور لوگوں نے بیک آواز پشاور سے امریکی اڈے اٹھانے اور امریکی بیس کو بند کرانے کے لئے احتجاج شروع کر دیا۔

اس وقت پاکستان میں شاید ہی گھر ہو جس میں اس خبر کا اور بعد ازاں اس واقعے کے متوقع ردعمل کا ذکر نہ چلتا ہو۔اور لوگوں کی طرح اس معاملے میں ہمارا گھرانہ بھی بہت پریشان تھا۔ہم سب بہن بھائی خوف اور رنج وغم کی اندھی غار میں اتر کر اپنی حکومت کا سیاپا کیا کرتے اور اپنے سربراہوں پر لعنت بھیجا کرتے۔بھائی جان کو اپنے جسور و غیور پٹھانوں کے مرکزی شہر کا آن واحد میں مٹ جانا تاریخ کا سب بڑا المیہ نظر آتا تھا۔میرا تایا زاد بھائی مجید خان جو میرے بچپن کا یار تھا' حال ہی میں صوبہ سرحد کے محکمہ جنگلات میں ایک آفیسر لگا تھا۔ اگلے مہینے اس کی شادی ہو رہی تھی۔میری ماں نے اس کی دلہن کے لئے اعلیٰ درجے کے جوڑے تیار کرائے تھے۔ابا جی نے اس کی شادی کے اخراجات کا ایک بنک ڈرافٹ بنوا کر اسے بھجوایا تھا لیکن اب دیکھتے دیکھتے سارا معاملہ الٹ گیا تھا۔جب پشاور ہی ختم ہو رہا تھا تو بھائی مجید خان کی شادی کیسے ہو سکتی تھی۔جب ان کا اور ان کی دلہن کا وجود ہی ختم ہو رہا تھا تو پھر جوڑے سلوانے اور ڈرافٹ بھجوانے کا فائدہ! میری

بڑی آپا کو پشاور کے تباہ ہونے کا سب سے زیادہ رنج تھا۔ وہ باڑے سے ہر سال چھ بڑے (Pears) سوپ اور تین (Stillman's) کریم کی ڈبیاں منگوایا کرتی تھیں۔ یہ سامان چونکہ چچا عبدالغنی خان کی معرفت پشاور سے آتا تھا اور اب پشاور کے گرد سرخ نشان لگ چکا تھا اس لئے آپا کی سپلائی بھی بند ہو گئی تھی۔

اتوار کے روز، چھٹی کے دن جب ہم سب بہن بھائی اپنی حکومت، اپنے ملک اور اپنے بڑوں پر مجموعی تبرا بھیج رہے تھے اور پشاور کے ختم ہو جانے پر پیشگی مرثیئے پڑھ رہے تھے تو اماں کو یہ بات بہت ہی بری معلوم ہوئی۔ اس نے عین ہمارے سامنے، یقین کی صورت ا..ستادہ ہو کر، پہلی مرتبہ سخت لہجے میں کہا "یہ تم کیا ہر وقت پشاور کے بارے میں منحوس باتیں کرتے رہتے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی"۔۔۔ تو افتخار بھائی نے فضا میں کھلے ہاتھ کی ڈگڈگی بجا کر کہا "بگدو بول گیا ہے اماں۔ اب روس پنجابے آوے گا تے سستی کنک وکاوے گا۔" اماں نے غصے میں آ کر کہا "لعنت ہو تم پر اور تمہارے روس پر۔۔۔ اور ساری دنیا کے کافروں پر۔"

"خبردار اماں" افتخار بھائی بپھر گئے "اگر تم نے روس کے خلاف کچھ کہا تو ہم سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" بڑی آپا نے افتخار بھائی کے لہجے پر ان کی سرزنش کی ماورہ سب نے آپا کا ساتھ دیا۔ بھائی جان نے اماں کو سمجھایا کہ "اماں روس اس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ وہ جب چاہے، کسی بھی ملک پر بمباری کر کے اسے تباہ کر سکتا ہے۔ پاکستان تو اس کے لئے ایک معمولی سی بستی ہے۔"

بڑی آپا نے کہا "اماں جی روس نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ پشاور کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"وہ اس پر بمبارڈمنٹ کرے گا" اقبال بھائی نے کہا "اور اسے سطح زمین کے ساتھ ملا دے گا۔"

"روس کو بمبارڈمنٹ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں" اسحاق بھائی نے بتایا "روس تو گھر بیٹھے بیٹھے جس شہر کو چاہے، تاخت و تاراج کر سکتا ہے۔ اس کے پاس سائنس کی ایسی کلا منتر ہے کہ وہ ہوائی جہاز بھیجے بغیر جس وکٹ کو چاہے، اس کی کلی اڑا سکتا ہے۔"

چھوٹی آپا نے ڈر کر کہا "اگر پشاور کے ساتھ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے تو کل لاہور کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوگا۔"

اقبال بھائی نے بڑی رنجوری میں سر ہلا کر کہا "افسوس! ابھی کل کی بات ہے پشاور سے کیا اعلیٰ درجے کا خشک میوہ آیا کرتا تھا، اور اب کچھ بھی نہیں۔"

اماں کو غصہ آ گیا۔ اس نے چارپائی کے پائے پر اپنا پاؤں جما کر کہا "میرے ڈرپوک اور خوف زدہ بچو، تم کو کیا ہو گیا ہے اور تم کن اونچائیوں سے کیسی گھاٹیوں میں اتر گئے ہو کہ تم کو اللہ پر کوئی یقین ہی نہیں رہا۔"

"اللہ پر تو ہمیں پورا یقین ہے اماں" آپا نے گرہ لگائی "لیکن ہم سامنے کی صورت حال پر آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ ہمیں اللہ نے سوچنے سمجھنے کی بھی صلاحیت دی ہے۔

اماں نے کڑک کر کہا "یہ تم کب سے صورت حالات کے نجومی بن گئے ہو جو گھر بیٹھے مستقبل کے فتوے جاری کر رہے ہو۔۔۔۔ کیا پتہ کل کو پشاور تو رہ جائے مگر تمہارا روس باقی نہ رہے اور کسی بمباری کے بغیر ہی ختم ہو جائے!"

اماں کا یہ کہنا تھا کہ ہم بھوکے بھیڑیوں کی طرح ان کے پیچھے پڑ گئے۔ جس کے منہ میں جو آیا، اس نے کہا اور بغیر کسی لحاظ کے، ادب

کی ساری حدوں کوکراس کرکے کہا۔ آفتاب بھائی جنہوں نے اماں ک سامنے کبھی اونچی سانس تک نہیں لی تھی، انہوں نے بھی زچ ہوکر کہا'' اماں جس بات کا علم نہ ہو اُس میں ٹکڑ نہ مارا کریں۔''

یہ دن اماں کی سلطنت میں ان کے زوال کا پہلا دن تھا اور یہ فقرہ کہ'' کیا پتہ پشاور رہ جائے اور روس نہ رہے'' ان کے تنزل اور انحطاط کا پہلا اور آخری سبب تھا۔

میں اباجی کے ساتھ والے کمرے میں کوئی پرانی سرنج تلاش کررہا تھا اور کسی کو علم نہ تھا کہ میں اس ساتھ والی کوٹھری میں ہوں کہ میری اماں کی پیشی ہوگئی۔ جو بیان حلفی انہوں نے اپنے خاوند کے روبرو دیا' میں اس کا سمعی شاہد ہوں۔

اباجی نے پوچھا'' کیا یہ بات سچ ہے سردار بیگم کہ تو نے بچوں سے یہ کہا کہ کیا پتہ پشاور رہ جائے اور روس نہ رہے؟''

اماں نے کہا'' جی ڈاکٹر صاحب' یہ سچ ہے۔ میں نے بالکل یہ کہا۔''

'' تم کو کیسے معلوم ہوا۔۔۔'' اباجی نے قدرِ تلخ آواز میں پوچھا'' کہ روس جیسا عظیم الشان' طاقت ور اور ترقی یافتہ ملک جاسکتا ہے اور پشاور جیسا کم زور' پس ماندہ اور رجعت پسند شہر رہ سکتا ہے؟''

'' میں نے یقین سے تو نہیں کہا ڈاکٹر صاحب!'' اماں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا'' لیکن اللہ کی نزدیک کیا مشکل ہے۔ وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔''

اباجی نے قدرے غصے میں آکر تھوڑی سی گرج دار آواز میں کہا'' اللہ ہمارے تمہارے جیسا بے اصولا نہیں۔ اس کے کچھ اصول ہیں' ضابطے ہیں' دستور ہیں اور وہ ان کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اس کا ایک سسٹم ہے اور وہ اپنے سسٹم سے باہر نہیں جاتا۔ وہ اپنے اصول پر اور اپنے سسٹم پر ہر گھڑی قائم رہتا ہے۔''

اماں کافی دیر تک خاموش بیٹھی رہیں' پھر جرات کرکے بولیں'' میں تو یہی سمجھتی ہوں ڈاکٹر صاحب کہ اللہ قادرِ مطلق ہے اور وہ جو چاہے کرسکتا ہے۔''

اباجی نے انہیں سمجھانے کے انداز میں قدرِ نرمی کے ساتھ کہا'' دیکھو سردار بیگم! جب تک اللہ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جائے گی' اس کے لئے تدبر اور تفکر نہیں کیا جائے گا' اس کے لئے فہم پیدا نہیں کی جائے گی اس وقت تک ایسی ہی فرسودہ اور روائتی سوچ چلتی رہے گی جیسی تمہاری ہے۔''

اماں نے کہا'' ڈاکٹر صاحب کا اگر اللہ کو سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے اور اسے صرف مانا جائے تو وہ جلدی میں آجاتا ہے بلکہ۔۔۔''

اماں کی یہ بات اباجی کو ناگوار گزری اور انہوں نے دوٹوک فیصلہ سناتے ہوئے کہا'' دیکھو سردار بیگم! اس گھر میں ایک ہی حکم چلے گا اور ایک ہی فیصلہ صادر ہوگا کہ آپ کو بچوں سے معافی مانگنی پڑے گی اور اپنے الفاظ واپس لینے پڑیں گے۔''

اماں نے ہنس کر کہا'' ڈاکٹر صاحب! میں تو انسانوں کی صف کا سب سے کمزور اور بودہ شخص ہوں اور مجھے اپنی بات منوانے کی کوئی ضد نہیں ہے۔ یہ بچے تو میرے اپنے ہیں' میں تو سارے جہاں کے بچوں سے معافی مانگنے کے لئے تیار ہوں لیکن مجھ سے اپنے الفاظ واپس

نہیں لئے جاسکیں گے۔‘‘

’’تو پھر اس گھر میں آپ کا رہنا مشکل ہوگا!‘‘ ابا جی نے سنجیدگی سے کہا اور اماں ان کی بات کا جواب دیئے بغیر باہر آ گئیں۔

اماں نے اپنے بچوں کی خاطر‘ اپنے گھر کی خوشیوں کے لئے اور اپنی اولاد کے کارن سب سے معافی مانگ لی۔ نہ صرف اپنے کہے ہوئے الفاظ واپس لئے بلکہ کبھی نہ کہے اور کبھی نہ سوچے ہوئے الفاظ بھی واپس لے لئے۔ ہم نے بھی ان کو معذور اور کم علم جان کر تہہ دل سے معاف کر دیا۔ اماں ذہین تو بہت تھیں لیکن ان میں تعلیم کی کمی تھی۔ انہوں نے پڑھائی شروع تو کی لیکن اسے پوری نہ کر سکیں۔ پھر اس زمانے میں عورتوں کی تعلیم کے باقاعدہ مدرسے بھی نہیں تھے اور لڑکیوں کو تعلیم دینا یوں بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اگر اماں ہماری طرح سے تعلیم یافتہ ہوتیں اور ان کی حالات حاضرہ پر باقاعدہ نظر ہوتی تو وہ ایسا فقرہ کبھی نہ کہتیں جو ان کے زوال کا باعث بنا اور جس نے ان کو ہماری زندگیوں سے بہت دور ہی کر دیا۔

اس واقعے کے دس بارہ سال بعد تک اماں زندہ رہیں‘ لیکن اپنے پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی آڑ میں۔ انہوں نے جیتے جی اپنے وجود سے اور اپنی ہویت سے پورے طور پر کنارہ کشی کر لی تھی۔ گھر میں ان کا ہونا اور نہ ہونا برابر سا تھا۔ کبھی کسی کو ان کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔ ہوتی بھی تو وہ ہونے نہیں دیتی تھیں۔ کسی پر اماں کا بدنی‘ روحی شخصی یا نفسی کسی بھی قسم کا بوجھ باقی نہیں رہا تھا۔ اور جس دن وہ گئی ہیں تو اس روز بھی کسی کو اطلاع دیئے بغیر رخصت ہو گئیں۔

ملازمہ نے صبح جا کر جب انہیں جگایا کہ آئیں آ کر چائے پی لیں تو وہ اس کے آنے سے پہلے ہی جا چکی تھیں۔

اماں کو سب بھائیوں نے اشکبار آنکھوں سے میانی صاحب کی اس سائیڈ پر دفن کیا جدھر آگے علم الدین شہید کا مزار ہے۔ ان کی قبر سے تھوڑی دور پرے بیری کا ایک پرانا درخت ہے۔ قریب ہی ایک طرف لوکوشیڈ کے مستری علی محمد کا مزار ہے اور اس کے ساتھ ہاجرہ بی بی کی قبر ہے جس کے لوح مزار پر اس کے تینوں بیٹوں نے اپنے نام بھی لکھوائے ہیں: والدہ شفیع‘ والدہ چراغ اور والدہ شمس۔ یہیں ہم نے اپنی پیاری اماں کو دفن کر کے ان پر پھولوں کی پانچ چادریں اوپر تلے چڑھائیں۔ شام کے وقت ہم خواتین خانہ کو ان کی قبر دکھانے لے گئے۔ میری دونوں آپائیں‘ دونوں خالائیں‘ باجی ضیا‘ باجی منیر اور میری اور سب سے چھوٹی بھابی منزہ کے قافلے میں اماں جنیو‘ ماسی پھجاں‘ جیونی بہن اور آنٹی صغریٰ بھی شامل تھیں سب نے وہاں جا کر فاتحہ پڑھی اور اپنے اپنے انداز میں اماں کو بہت یاد کیا۔ بڑی آپا کو ان کی آخری آرام گاہ بہت ہی پسند آئی۔ ملازم خواتین نے بیری کی قربت کو نہایت پاکیزہ خیال کیا اور چھوٹی آپا نے کہا چونکہ ہم شریعت کے مطابق اپنی ماں کی قبر کچی رکھیں گے اس لئے ساتھ کی قبروں کے کتبے ہمارے لئے پکی نشانیوں کا کام دیتے رہیں گے۔ میری چھوٹی خالہ رشیدہ اپنی بہن کو یاد کر کے بہت رو رہی تھیں۔ انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔

کوئی ایک سال بعد جب ہم شب برات پر پھول چڑھانے اور فاتحہ کہنے گئے تو پھولوں کی ٹوکری‘ گلاب کی بوتل اور اگربتیوں کے پیکٹ ہمارے ہاتھ میں ویسے کے ویسے رہ گئے۔ وہاں اماں کی قبر ہی موجود نہ تھی! ہم نے ادھر ادھر اسے لاکھ ڈھونڈا لیکن اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ بیری کے حوالے سے اور کتبوں والی قبروں کے فاصلے ناپ کر ہم نے اماں کی قبر کے آثار معلوم کرنے کی کوشش کی مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

پرانی قبروں کے بلاک جوں کا توں موجود تھا۔ جہاں نشیب تھا' وہاں نشیب تھا۔ نشیب کے اندر دو تین جھاڑیاں تھیں' وہ اپنی جگہ موجود تھیں۔ ایک پرانی قبر کا تعویذ بیٹھ گیا تھا' وہ اسی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے بیری اسی طرح جھکی ہوئی تھی اور اس کے دو ڈالے اور سوکھ گئے تھے۔ لیکن جہاں اماں کی قبر ہونی چاہئے تھی' مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔۔۔ بس خالی زمین تھی' اتنی زمین کہ اس میں آسانی سے ایک قبر کھودی جا سکے۔ لیکن وہ قبر جو ہم یہاں چھوڑ گئے تھے' وہ کہاں گئی!

فاروق نے کہا ''چچا جان یہ وہ جگہ ہی نہیں۔ دادی اماں کی قبر اس سے ذرا فاصلے پر تھی۔ رضا نے کہا ''میں نے خود اپنے ہاتھوں سے انہیں لحد میں اتارا تھا تو اپنا تولیہ اس بیری پر ٹانگ دیا تھا۔ ان کو یہاں ہونا چاہئے' عین اس جگہ۔ لیکن یہاں تو کچھ بھی نہیں۔''

منزہ ایک قبر کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہی تھی ''یہی تو ہے ان کی قبر۔ آپ کو یاد نہیں ہم نے شام کے وقت اس پر اگر بتیاں گاڑی تھیں تو ایک ایک بتی ان کی پڑوسی قبروں پر بھی گاڑ دی تھیں۔ یہ وہی قبریں ہیں صاف' ان کی پڑوسی قبریں اور یہ ہے ساتھ اماں جی کی قبر!''

اقبال بھائی نے کہا ''اماں جی کی قبر بیری کی سیدھ میں دائیں ہاتھ تھی اور یہ قبریں بائیں ہاتھ ہیں۔ ان کا تو جغرافیہ ہی دوسرا ہے۔''

کافی دیر تک ہم اماں کی قبر تلاش کرتے رہے اور افسوس کرتے رہے کہ اگر ہم نے ایک معمولی سا کتبہ لگایا ہوتا تو یہ الجھن نہ ہوتی۔ اگر بتیاں اور عرق گلاب اسی طرح واپس لے کر اور پھولوں کی پتیاں پانچ چھ دوسری قبروں پر ڈال کر ہم ناکام و نامراد واپس گھر آ گئے۔

اگلے دن ہم نے بھائی شفیع اور ان کی معرفت منگوائے ہوئے پرانے گورکنوں کو ساتھ لے کر ایک سروے ٹیم تیار کی اور اس میں وہ مولوی صاحب بھی شامل کئے جنہوں نے مٹی دینے کے بعد وہاں قرآن خوانی کی تھی۔ سب کو اماں کے دفنانے کا وقت یاد تھا۔۔۔ دن' مہینہ اور موسم یاد تھا۔۔۔ ان قبروں کا نقشہ یاد تھا جن کے ساتھ اماں کو دفنایا گیا تھا مگر اس وقت سارے کے سارے اماں کی قبر تلاش کرنے سے قاصر تھے۔ مولوی صاحب نے کہا ''میری عمر باسٹھ سال ہے اور میں سینکڑوں میتیں دفنا چکا ہوں لیکن ایسا واقعہ میری زندگی میں پہلے کبھی نہیں آیا۔ یہ تو حد ہی ہو گئی۔''

اماں کی قبر کے بارے میں سب کا اپنا اپنا خیال اور اپنا اپنا گمان ہے لیکن یقین سے کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے یا صحیح سوچ رہا ہے۔ لیکن میں جو کسی حد تک ان کے مزاج سے واقف اور ان کی نفسیات کا آشنا ہوں' مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی قبر اٹھا کر کہیں اور لے گئی ہیں۔ اصل میں میری ماں کے زمانے کی عورت محبت کے میدان میں سب سے آگے ہوتی تھی اور جب انعام تقسیم ہونے کا وقت آتا تھا تو غائب غلہ ہو جاتی تھی۔ وہ خودنمائی اور خودستائی کے فن سے ناآشنا تھی۔ اس کو مکٹ سجا کے' پہنچیاں پہن کے اور سرمہ کاجل لگا کے مہمان خصوصی بننے کا ڈھنگ نہیں تھا۔ تعریف و توصیف کے موقعوں پر وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی اور ایسے اوہلے میں چھپ جاتی تھی کہ مدتوں اس کے کوئی آثار نہیں ملتے تھے۔ وہ اپنی ہر کارکردگی کے پیچھے اپنی لاموجودگی کا امپریشن برقرار رکھتی تھی اور غائب سے غائب تر ہوتی رہتی تھی۔ تخلیق کے چوکھٹے کے اندر کسی کارنر میں اپنا نام اور تاریخ نہیں لکھتی تھی۔ بس اس کا روپ پری کا سا تھا۔ باغ لگا کر' پھول کھلا کر' تخت بچھا کر' راہ سجا کر خود غائب ہو جاتی تھی کہ کسی کو شکریہ ادا کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ کرنی پڑے۔ کسی کو تکلیف نہ ہو' الجھن نہ ہو' انتظار نہ کرنا

پڑے۔۔۔۔اماں کو معلوم تھا کہ دن تہوار پر عید شبرات پر بچے کسی نہ کسی مجبوری کے تحت میری قبر پر ضرور آئیں گے اور پورے اترنے کی کوشش کریں گے۔ وہ مصروف لوگ ہیں۔ ان کی کئی بکھیڑے اور بے شمار مشغولے ہیں۔ آئیں گے تو تکلیف ہوگی۔ زحمت کریں گے۔ وقت نکالیں گے۔ انتظار کھینچیں گے۔ مشکل ہوگی۔ کیوں نہ ان کو آزاد کر دیا جائے۔ چنانچہ اماں نے ہم کو پہلے کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آزاد کر دیا۔

دنیا کے عظیم مصنفوں نے اور میرے ہمعصر ساتھیوں نے اپنی ماؤں پر ایسے پر لطف' خیال انگیز اور گراں بہا مضمون لکھے ہیں کہ وہ کلاسیکی ادب کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔ میری بھی بڑی دیر کی خواہش تھی کہ میں اپنی اماں کی زندگی کے بارے میں کچھ کہوں' کچھ لکھوں' کچھ بتاؤں۔ مگر میری والدہ میں میرے حساب سے ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی جس کی بدولت ان پر کوئی مضمون لکھا جاسکے یا ان کے سوانح حیات کا زبانی ذکر کیا جاسکے۔ وہ ایک عام سی سیدھی سادھی' گھر چوکھٹ کی بی بی تھیں جو زندگی کی پگڈنڈی پر سیدھے سبھاؤ چلتی چلتی ادھر سے ادھر پہنچ گئیں اور چلتے چلتے ساتھ ساتھ اپنے نقوش پا بھی مٹاتی گئیں۔ ایسے شخص پر کوئی کیا لکھے جو اپنے جانے کی بعد ذرا سا خلا بھی نہ چھوڑ سکے!

خود بدولت

دونوں بہنیں اور دونوں بھائی چپ چاپ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے اور ایک دوسرے کو نہ دیکھتے ہوئے بھی دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا کہ دوسرا کیا سوچ رہا ہے اور دوسرا وہی کچھ سوچ رہا تھا جو باقی تینوں نے ابھی سوچ کے چھوڑا تھا۔ رشیدہ نے کہا "مجھے کل ہر صورت واپس جانا ہوگا کیونکہ کرنل صاحب کے موتیئے کا آپریشن ہے اور اگر میں ان کے پاس نہ ہوں تو وہ گھبرا جاتے ہیں اور جوش سے اور خوف سے کانپنے لگتے ہیں۔" دونوں بھائیوں نے یک زبان ہو کر کہا "ضرور آپا! ضرور۔۔۔۔ آپ کو ہر حال میں جانا چاہیے اور کرنل صاحب کی تسلی کرنی چاہیے۔"

محمود گدو بیراج سے آیا تھا اور ابھی اس کی ڈھیر ساری چھٹی باقی تھی' لیکن اس کی ڈھیر ساری چھٹی کا گھر والوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں تھا کہ محمود بہت ہی کم گو اور کم آمیز قسم کا انجینئر تھا۔ مسعود اسلامیہ کالج پشاور میں اکنامکس کا اسسٹنٹ پروفیسر تھا۔ اس کی چھٹی تو کم تھی لیکن وہ تار بھیج کر اور چھٹی بھی لے سکتا تھا اور فون کر کے اپنے بیوی بچوں کو بھی یہاں بلا سکتا تھا۔

میجر فرخندہ سی ایم ایچ میں گائنی کی ڈاکٹر تھیں۔ اپنے ابا جی کی عاشق' اپنے ابا جی کی برتری کا چلتا پھرتا اشتہار اور اپنے ابا جی کا قیمتی ووٹ! جب سے ابا جی کے ذہن اور بدن کا رشتہ کمزور ہوا تھا' وہ بھی چھٹی لے کر ابا جی بختیار خاں کے پاس آ کر ان کی تیمارداری میں مصروف ہو گئی تھیں۔ جب کبھی میجر فرخندہ پر طویل مایوسی کا دورہ پڑتا تو ابا جی بختیار خاں ہاتھ کے اشارے سے قریب بلا کر اس کی کمر پر تھپکی دے کر اونچی آواز میں کہتے "چن اپ میجر۔ چن اپ۔۔۔۔۔ ایسی صورت ہم کو پسند نہیں ہے۔" اور میجر غمناک ہو کر چن اپ کر لیتی۔

ابا جی بختیار خاں نے اپنی زندگی خود بنائی تھی اور بغیر نقشہ پاس کروائے بنائی تھی۔ اس میں کچھ تجاوزات بھی آ گئی تھیں جن میں کچھ تو سرکاری تھیں اور کچھ دوسرے لوگوں کی ملکیت گھیر گئی تھیں۔ خاں صاحب نے کسی کی پرواہ کئے بغیر اپنے زور عمل سے اپنی زندگی کو بنایا تھا اور خوب بنایا تھا۔ وہ ایک معمولی آدمی سے ری رولنگ مل کے مالک بن گئے تھے اور ان کے کارخانے میں چوبیس گھنٹے کی شفٹ میں باسٹھ آدمی کام کرتے تھے۔ ایک نائب تحصیل دار کا اتنے بڑے مرتبے پر پہنچنا ان کے ذہن اور بدن کی اعلیٰ درجہ کی سنکرونائزیشن سے عمل میں آیا تھا اور اس عمل میں بہت سے بے عمل لوگ ان کی پلاننگ کی بھٹی میں بھسم ہو گئے تھے۔ بختیار خاں پلاننگ کے بادشاہ تھے اور اگر وہ صنعت کاری کے میدان میں نہ اترے ہوتے تو واقعی کسی ملک کے بادشاہ ہوتے۔ اگر بادشاہ کا الفاظ ممنوع الاختیار ہوتا تو بختیار خاں حکمراں ضرور

ہوتے۔ان کی ایک حکومت ہوتی۔ایک محل ہوتا۔نورتن ہوتے۔سفارت خانوں کا ایک شہر ہوتا۔ذاتی ہوائی جہاز' ہیلی کوپٹر اور ذاتی ہیلی پیڈ ہوتے اور دوسری راجدھانیوں اور رراجواڑوں سے ان کے بہترین تعلقات ہوتے' یعنی وہ کچھ بھی کہلاتے' ان کی ایک رعایا ضرور ہوتی اور وہ اپنی رعایا کو کسی بھی نام سے پکارتے' رعایا ان کی حکمرانی کی تصدیق کرتی۔وہ ایک باعمل' باہمت اور باکردار آدمی تھے۔ان کی ساری زندگی محنت ومشقت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھی اور اس کے انگ پر بدمعاشی' جنسی بے راہروی یا بدمستی کا کوئی چھینٹا تک نہ تھا۔

بختیار خاں نے نیم وا آنکھوں سے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے بچوں کو دیکھا۔پھر پتلیاں گھما کر گلوکوز کی بوتل پر نظر ڈالی اور اندر ٹیوب میں گرتے ہوئے قطروں کا نظارہ کرنے کے بعد ذرا سا مسکرا کر کہا ''مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں۔میں اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ۔۔۔۔۔'' میجر فرخندہ نے سٹتھوسکوپ لگا کر ان کی ہارٹ بیٹ چیک کی اور پھر اپنی کرسی پر اسی طرح جا کر بیٹھ گئی۔

بختیار خاں نے کہا ''مولا صاحب تشریف نہیں لائے؟ مولانا ظفر علی خاں صاحب!''

مسعود نے کہا ''نہیں اباجی' آج تو تشریف نہیں لائے۔''

''کمال ہے!'' بختیار خاں نے آنکھیں بند کر کے کہا ''مجھ سے خود انہوں نے فون پر فرمایا تھا کہ تمہاری مزاج پرسی کو آؤں گا اور تمہارے ساتھ چائے پیوں گا۔تو اب چائے کا وقت تو ہو گیا ہے۔کیوں رشیدہ؟''

رشیدہ نے کہا ''جی اباجی! چائے کا وقت ہو گیا ہے۔''

''تو پھر!'' بختیار نے ذہن پر بوجھ دیتے ہوئے کہ ''یا انگریز نے انہیں پھر گرفتار کر لیا ہو گا یا ایک آدھ دن ریسٹ کرنے کی غرض سے کرم آباد تشریف لے گئے ہوں۔'' مسعود بولا۔

''لیکن آپ تھوڑی دیر آنکھیں بند کر کے خاموشی سے لیٹے رہیں اباجی۔'' ڈاکٹر فرخندہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ''آپ کو ریسٹ کرنا چاہیے۔''

''ریسٹ'' نے ہنس کر کہا ''ریسٹ! ناں مری سوہنی دھی۔ریسٹ تو میں نے ساری زندگی نہیں کیا۔ریسٹ کو تو میں انسان کا سب سے بڑا گناہ سمجھتا ہوں۔۔۔۔۔گناہ کبیرہ۔۔۔۔اور سارے گناہ معاف ہو سکتے ہیں لیکن بے عملی اور بے کاری اور بے کار کردگی کا گناہ کبھی معاف نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔جس نے سٹرگل' کوشش' جدوجہد' کشمکش کو چھوڑ دیا وہ انسان نہیں' پتھر ہے۔۔۔۔۔مٹی کا تودا نہیں' ریت کا ڈھیر ہے۔۔۔۔پرسوں میری مہاتما بدھ سے بڑی بحث ہوئی۔جین مندر کے سامنے پٹڑی پر جا رہے تھے۔میں نے موٹر روک کر پکڑ لیا اور ہاتھ تھام کر بڑے ادب سے کہا ''سر آپ نے بڑی زیادتی کی انسانیت کے ساتھ جو اس کو نرم دلی اور ترک خواہش کا درس دے دیا۔'' شرمندہ سے ہو کر اپنا ہاتھ چھڑانے لگے اور مسکرا کر بولے ''کیا کریں بختیار خاں' ہم کو اسی بات کا حکم تھا۔'' میں نے کہا ''سر آپ نے ایسا حکم کیوں مان لیا۔آپ کو بحث کرنی چاہیے تھی' آرگیومنٹ دینی چاہیے تھی کہ کوشش اور جدوجہد کے بغیر انسان کس طرح زندہ رہے گا' کس طرح آگے بڑھے گا' کس طرح نشوونما پائے گا۔'' کہنے لگے ''جس طرح دریا آگے بڑھتا ہے' پنچھی زندہ رہتا ہے' برگد نشوونما پاتا

ہے۔'' میں نے کہا ''سر ایک تو آپ کو اس برگد کو پیڑ نے تباہ کر دیا جس کے نیچے جا کر آپ بے یار و مددگار بیٹھ گئے تھے اور سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے۔ اگر آپ نے ہمت کی ہوتی اور کوشش کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا ہوتا تو کپل وستو جیسی آپ کی کئی راجدھانیاں ہوتیں اور اس وقت دنیا کی تاریخ میں آپ کا نام زندہ ہوتا' لیکن آپ نے رہبانیت کی تعلیم دے کر اور ترک خواہش کا سبق سکھا کر لوگوں کو بھی بے عمل کیا اور خود بھی تنہائی اور گمنامی کی زندگی بسر کر کے اس جہاں سے چلے گئے۔ کوئی آپ کو جانتا ہی نہیں۔''

ڈاکٹر فرخندہ نے کہا ''اباجی! آپ سونے کی کوشش کریں۔ میں کھڑکیوں کے پردے کھینچ دیتی ہوں۔''

''پرانی سی بات ہے بیٹا!'' بختیار خاں نے ہاتھ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''جو سوتے ہیں وہ کھوتے ہیں' جو جاگتے ہیں وہ پاتے ہیں۔ میں سونا نہیں چاہتا' جاگنا چاہتا ہوں۔ مجھے مرنے سے نفرت ہے اور مدہوشی سے بیر ہے۔ میں زندہ ہوں اور زندہ ہی رہوں گا انشاءاللہ۔۔۔۔۔ میں امر ہوں کیونکہ میں کوشش ہوں' محنت ہوں' جدوجہد ہوں۔'' پھر انہوں نے چونک کر پوچھا ''راجہ صاحب کا فون تو نہیں آیا تھا؟''

''کون سے راجہ صاحب اباجی؟'' پروفیسر مسعود نے پوچھا۔

''اپنے راجہ غضنفر علی خاں صاحب۔۔۔۔۔ مجھ سے والٹن ائیرپورٹ پر ملے تھے' لیکن وہ بھی جلدی میں تھے اور میں بھی تیزی میں تھا۔ ہاتھ ہلا کر فرمانے لگے۔۔۔۔۔۔ میں آپ کو فون کروں گا خاں صاحب۔۔۔۔۔ پتہ نہیں کیا وجہ ہے' انہوں نے فون نہیں کیا۔ ویسے تم لوگ بھی اپنی اپنی غرض کے بندے ہو۔ شاید تم نے فون ریسیو ہی نہ کیا ہو۔۔۔۔۔۔ ویسے میں نے مہاتما بدھ کو آج لاجواب کر دیا۔ شرمندہ سے اور کھسیانے سے کھڑے تھے اور ان سے کوئی جواب نہ بن پڑتا تھا۔ میں نے ان کا کندھا ہلا کر کہا سر! کوشش اور سعی مسلسل کے بغیر معاشرے میں زندگی کے آثار باقی نہیں رہتے۔ مقابلے کی فضا میں ہی قومیں آگے بڑھتی ہیں اور مقابلہ کر کے ہی انسانیت حیات ارضی میں آفتاب جہاں تاب بن کر دمکتا ہے۔ انہوں نے مسکرا کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑی ملائمت سے کہا۔۔۔۔۔ خاں صاحب! انسان مقابلے کی دنیا میں انسان کے خلاف ہی نبرد آزما ہوتا ہے۔ دیوار' پتھر' کھمبے' جنگلے اور درخت سے مقابلہ نہیں کرتا۔ تیس چالیس انسانوں کو جب ایک کامیاب انسان پسپا کر کے' پیچھے دھکیل کے اور زمین پر گرا کر آگے بڑھتا ہے تو پھر زمین پر گرے ہوئے ان تیس چالیس ذلتوں کے ماروں کا ہم کیا کریں۔ ان کا گھر کدھر سے بھریں۔ ان کی سہائتا کیسے کریں۔ ان کو زندہ کس طرح سے کریں۔ وہ بھی تو انسان ہیں' وہ بھی تو اس معاشرے کا حصہ ہیں' ان کو بھی تو زندہ رہنے کا حق ہے۔۔۔۔۔ میں نے کہا سر! میں تو آپ کو بڑا ودوان اور بدھی وان سمجھتا تھا لیکن آپ نے کیا کچی بات کر دی۔ آپ تو ہٹلر اور ہلاکو زیادہ صاحب عمل تھے۔ انہوں نے ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا اور آپ کی رہبانیت کے تصور کی جڑیں اکھاڑ کر رکھ دیں۔ ملکوں کی نئی سرحدیں قائم کیں اور شہروں کے اندر دیواریں کھنچوا دیں۔ آپ برگد کے درخت تلے آنکھیں بند کر کے بیٹھے رہے۔ کیا مل گیا اس سے دنیا کو اور آنے والی نسلوں کو۔ مہاتما بدھ میری باتیں سن کر چپ ہو گئے اور کندھا تھپتھپا کر بولے۔۔۔۔۔ آپ کے لئے آپ کا دھرم اور ہمارے لئے ہمارا' اس میں جھگڑے کی کیا بات ہے۔ اب مجھے اجازت دیجئے' پھر ملاقات ہو گی تو اور باتیں ہوں گی۔ اس وقت مجھے ایک مریض کو دیکھنے جانا ہے۔۔۔۔۔ ڈاکٹر ارشد نہیں آئے آج؟''

''آئے تھے ابا جی۔'' رشیدہ نے کہا ''صبح آپ کو ٹیکہ دے کر گئے تھے اور شام کو پھر آئیں گے شاید۔''

''مہاتما بدھ جاتے جاتے کہنے لگے۔۔۔۔۔۔خاں صاحب! مقابلہ بازی گھوڑوں پر تو سجتی ہے' انسانوں پر نہیں۔''

یہ کہہ کر بختیار خاں طنزیہ ہنسی ہنسے اور گلوکوز کی ڈرپ دیکھنے لگے۔

تھوڑی دیر تک کمرے میں خاموشی رہی۔ پھر بختیار خاں نے آنکھیں کھول کر سب کو باری باری دیکھا اور دھیمی آواز میں کہنے لگے ''پچھلے ہفتے وہ بڈھا فرانسیسی مجھے جی پی او کی سیڑھیوں پر مل گیا۔ اس کی چوخانہ گول ٹوپی نے اس کا بایاں کان بالکل چھپا رکھا تھا اور وہ اپنی پائپ میں پھونکیں مارتا ہوا سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ میں نے اس کا راستہ روک کر کہا' اوآندرے ژید یہ تم نے کیا بکواس کی کہ بڑے انسانوں کے عظیم کارناموں میں عقل کے مقابلے میں قسمت زیادہ کارفرما رہی ہے۔ اس نے اپنے کندھے سکوڑ کر کہا۔۔۔۔۔۔پاردوں موسیو مجھے اردو نہیں آتی۔ سوری۔۔۔۔اور کنی کاٹ کر تیزی سے دوسری طرف نکل گیا۔ اچھا آج صبح جے پرکاش نرائن تو نہیں آئے تھے؟''

''نہیں ابا جی۔'' میجر فرخندہ نے جواب دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

کم گو محمود نے بڑی آہستگی سے کہا ''میں بہت تھک گیا ہوں' ذرا کمر سیدھی کر کے واپس آتا ہوں۔''

'اوئے محمود!'' بختیار خاں نے ماتھے پر تیوری ڈال کر کہا ''تیرے جیسے لوگ جو ریشمی نائٹ سوٹ پہن کر سوتے ہیں' وہ صبح مشکل ہی سے اٹھ سکتے ہیں۔ اور جو صبح سویرے مشکل سے اٹھتے ہیں' وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ جا دفع ہو جا۔''

محمود جو اپنی کرسی دے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا' دوسرے کمرے میں دفع ہو گیا اور بختیار خاں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

رشیدہ نے میجر فرخندہ سے کہا ''مجھے اپنا سامان پیک کرنا ہے' اس لئے تھوڑی دیر کے لئے میں اجازت چاہوں گی۔''

بختیار خاں نے آنکھیں کھولے بغیر انگلی اٹھا کر کہا ''خبردار۔۔۔۔۔۔کوئی ضرورت نہیں سامان پیک کرنے کی۔ آرام سے بیٹھو۔''

رشیدہ جو اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی' چپ چاپ پھر بیٹھ گئی۔

مسعود نے کہا ''آپ جوس لیں گے ابا جی۔۔۔۔۔۔ایپل جوس؟''

''نو تھینک یو۔ مہربانی!'' بختیار خاں نے ہولے سے کہا ''میں کوئی بیمار ہوں جو ایپل جوس پیتا پھروں۔۔۔۔۔۔شکریہ!''

میجر فرخندہ اپنی جگہ سے اٹھی اور گربہ پائی کے ساتھ جا کر ڈرپ سٹینڈ کے پاس کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک تو اس نے گلوکوز کی الٹی لٹکی ہوئی بوتل کو دیکھا' پھر قطروں کی ٹپکاٹ کو ذرا سا اور تیز کر دیا۔ بختیار خاں نے ایک جھرجھری لے کر ریس کے گھوڑے کی طرح ناک کے نتھنے پھیلائے اور پھر کہنے لگے ''آج دوپہر میں نے ریڈیو سٹیشن فون کیا تھا لیکن مجھے وہ خبیث ملا نہیں۔ سٹیشن ڈائریکٹر کہنے لگا کہ وہ ہر روز یہاں نہیں آتے' ہفتے میں ایک بار آتے ہیں۔ میں نے جھڑک کر کہا اوئے تم سٹیشن ڈائریکٹر ہو کر اس کا پروگرام بند نہیں کر سکتے تو وہ گھگھیا کر کہنے لگا ہماری تو بہت کوشش ہے سر لیکن ہمارے Listeners اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ میں نے کہا لعنت ہو تم پر اور تمہارے لسنروں پر۔''

پھر تھوڑی دیر رک کر بختیار خاں بولے ''بڑا اندھیر ہے ڈاکٹر فرخندہ۔۔۔۔۔۔یہ بدبخت ہمارے نوجوانوں کو ترقی کرنے سے

روک رہا ہے' کمپی ٹیشن سے نکال رہا ہے' دولت کے حصول سے منع کر رہا ہے' نوجوان کا اخلاق تباہ کر رہا ہے اور ہر ہفتے ریڈیو سے بکواس کر کے چلا جاتا ہے۔ہم کہتے ہیں میرٹ پر آنے والوں کو زندہ رہنے کا حق دو۔انہوں نے محنت کی ہے' مشقت جھیلی ہے۔بے میرٹ لوگوں کو اس معاشرے سے نکال دو' اس ملک سے دفع کر دو۔وہ ہمارے ملک کا بوجھ اور ہمارے معاشرے کا ناسور ہیں۔کامیاب لوگ ہمارے وطن کی زینت اور معاشرے کا حسن ہیں۔کامیابی ایسا خمیرہ مروارید ہے پروفیسر مسعود جس سے معاشرے کے ڈوبتے ہوئے دل کو تقویت ملتی ہے۔"

"ابا جی! آپ سو جائیں۔"

"سو نہ سکیں تو تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو جائیں۔"

"چپ نہ رہ سکیں تو کوئی ذکر شروع کر دیں۔" نے اپنے بچوں کی باتیں سنی ان سنی کر کے کہا" پرسوں خانساماں کچن میں اس بدبخت کا پروگرام اونچی آواز میں لگا کر سن رہا تھا اور وہ اپنے مخصوص لہجے میں بکواس کر رہا تھا کہ کامیابی اور ناکامی دونوں کو ہی برداشت کرنا ایک مشکل کام ہے۔کامیابی کے ساتھ نشہ آتا ہے۔شراب' ڈرگ' نارکوٹکس' پھر طلاق آتی ہے۔اس کے بعد دوسری شادی بلکہ شادیاں۔۔۔۔۔۔بدمعاشیاں۔۔۔۔۔۔دادا گیریاں۔۔۔۔نوسر بازیاں۔۔۔۔لمبے لمبے سفر شروع ہو جاتے ہیں۔گھنٹے گھنٹے بعد دواؤں کا ورد ہونے لگتا ہے۔جسمانی' روحانی' نفسیاتی عارضے بڑھ جاتے ہیں۔مایوسی کے بادل چھانے لگتے ہیں۔۔۔۔۔۔اور آخر میں خودکشی آ جاتی ہے۔۔۔۔۔یہ ہیں کامیابی کی برکتیں!اور ناکامی میں صرف ناکامی ہی ہاتھ آتی ہے۔۔۔۔۔میں نے خانساماں سے چیخ کر کہا' بند کرو اس کتے کی بکواس کو جو لوگوں کو دنیا سے لگ رہبانیت کا اور گوشہ نشینی کا درس دے رہا ہے۔"

رشیدہ نے دبی زبان میں کہا" ابا جی! خانساماں آپ کے رویے کی شکایت کر رہا تھا۔"

"کرے شکایت' شوق سے کرے۔" ابا جی! نے نفرت سے ناک سکوڑ کر کہا" مجھے کیا پروہ ہے اس کی۔میں اس کا نوکر ہوں؟ غلام ہوں؟ ایمپلائی ہوں؟ کوئی دبتا ہوں اس سے؟ کرے شکایت کھل کرے۔اس کی شکایت سے ڈر کر میں حق اور سچ کا کہنا نہیں چھوڑوں گا۔ٹروتھ کے اعلان سے منہ نہیں موڑوں گ۔۔۔۔۔۔اب تم لوگ خود ہی فیصلہ کرو کہ جب میں کامیاب ہوا اس زندگی میں اور ایک نام پیدا کیا' شہرت حاصل کی' دولت کمائی' کا خانے لگائے تو کیا میں نے تمہاری ماں کو چھوڑ دیا؟ کوئی نئی شادی کی؟ بدمعاشی' کوئی گھمنڈ' کوئی طاقت کا ناجائز استعمال کیا؟ بتاؤ کیا؟۔۔۔۔۔حالانکہ میں سب کچھ کر سکتا تھا' سب کچھ کروا سکتا تھا۔اپنی ہر بات منوا سکتا تھا لیکن میں نے نہیں کیا کچھ' نہیں منوایا کچھ' نہیں تقاضا کیا کوئی۔۔۔۔میں کوئی لمبے سفروں پر نہیں گیا ماسوائے اپنے ماہانہ بزنس ٹورز پر۔میں نے کوئی گولیاں کھانا شروع نہیں کیں ماسوائے اپنی روزمرہ وٹامن کے' آئرن ڈوز کے' سودنگ پاؤڈر کے' نیند کی گولی کے اور اجابت صیحہ کے لئے منرل آئل کے چمچے کے۔" پھر انہوں نے سر تکئے سے ذرا اوپر اٹھا کر کہا" اوئے میں کبھی بیمار ہوا اپنی زندگی میں؟ آج تک' اس وقت تک' کوئی ذہنی' کوئی جسمانی عارضہ۔۔۔۔۔۔کوئی فزیکل ڈیلٹی۔۔۔۔۔کسی قسم کی۔۔۔۔۔بولتے کیوں نہیں' جواب کیوں نہیں دیتے؟ سانپ کیوں سونگھ گیا۔بکواس کیوں نہیں کرتے۔۔۔۔۔بولو۔۔۔۔بولو۔۔۔۔میری بات کا جواب دو۔۔۔۔۔بات کا جواب دو۔"

بختیار صاحب اس قدر اونچی آواز میں بولنے کے بعد بے ہوش ہو گئے اور ان کے سرہانے مونیٹر کی بیپ تیز ہوگئی۔ ڈاکٹر فرخندہ نے جلدی سے ایک ٹیکہ ڈرپ کی نالی کو دیا اور پھر سارے اٹھ کر ابا جی بختیار خاں کے کمرے سے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔

ڈرائنگ میں دو بہنیں اور مسعود بھائی ایک ہی صوفے پر بیٹھے تھے اور ایک دوسرے کو نہ دیکھتے ہوئے بھی دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں خانساماں یخنی کی پیالی اور تحریری استعفیٰ لے کر آ گیا۔ یخنی کی پیالی اس نے آپا رشیدہ کو دی اور استعفیٰ پروفیسر مسعود کے سامنے تپائی پر پھیلا دیا۔ میجر فرخندہ نے کاغذ پر نگاہیں ڈالے بغیر چن اپ کر کے سردار سے کہا ''دیکھو سردار تم ابا جی کی طبیعت کو تو شروع سے ہی جانتے ہو اور ہم سے بہتر جانتے ہو' پھر یہ تم عرضیاں لکھ لکھ کر کیوں لاتے ہو؟''

سردار نے تقریباً روتے ہوئے کہا ''اب میرا یہاں رہنا بہت مشکل ہو گیا ہے آپا جی! صاحب ہر وقت مجھے گالیاں دیتے رہتے ہیں اور میری ماں بہن پنتے رہتے ہیں میں بھی آخر عزت دار آدمی ہوں۔ بال بچوں والا ہوں۔ میں کب تک یہ سب کچھ برداشت کرتا رہوں۔ آپ مجھے آزاد کر دیں صاحب جی اور میری دعا لیں۔''

پروفیسر مسعود نے جھوٹ موٹ جھڑک کر کہا ''اوئے بکواس نہ کر احسان الٰہی! جب ہم سارے یہ سب برداشت کر رہے ہیں تو تو کیوں نہیں کر سکتا؟ آخر ہم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ پلے بڑھے ہیں' ایک دوسرے کے دکھ سکھ کو سمجھتے ہیں' ایک دوسرے کے بھیدی ہیں۔ پھر یہ استعفیٰ کس لئے؟''

مسعود نے اس کا استعفیٰ پھاڑ دیا اس کے پرزے اس خانساماں ہی کے ہاتھ میں دے دیئے۔

میجر فرخندہ نے کہا ''اس مہینے سے تم کو پچاس روپے ماہوار زیادہ ملا کریں گے کیونکہ تم ایک بیمار آدمی کی دیکھ بھال کر رہے ہو اور تمہاری زمہ داری بڑھ گئی ہے۔''

خانساماں خوشی سے پھولا نہیں سمایا اور مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

آپا رشیدہ واپس کراچی چلی گئی تھیں کیونکہ کرنل صاحب کے موتیئے کا آپریشن ضروری تھا۔ انجینئر محمود تھے تو سہی لیکن نہ ہونے کے برابر۔ ابا جی بختیار خاں کی تیمارداری کا سارا بوجھ میجر فرخندہ اور پروفیسر مسعود پر تھا۔ حاضری تینوں ہی دیتے تھے لیکن محمود صاحب کی نہ تو کوئی رائے تھی اور نہ ہی کوئی تجویز پیش کرتے تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ ابا جی کے بارے میں فکر مند نہیں تھے' وہ کافی پریشان تھے لیکن ان کے پاس اظہار کی کمی تھی۔

آج ابا جی جسمانی طور پر پہلے سے بہتر نظر آتے تھے لیکن ان کی سوچ اسی مقام پر اٹکی ہوئی تھی۔ آواز ذرا دھیمی ہوگئی تھی لیکن جوش خروش ویسا ہی تھا۔ انہوں نے تکئے سے اپنا سر اٹھانے کی کوشش کی اور ساتھ مسکرانے کو بھی زور لگایا مگر دونوں ہی کام نہ ہو سکے۔ اپنے بچوں کو سامنے بیٹھا دیکھ کر کہنے لگے ''مجھے افسوس ہے کہ کل شام میں تمہیں لی فنگ چو نہ لے جا سکا۔ دفتر سے میں نے تم کو بہتیرے فون کئے مگر تم میں سے کوئی بھی گھر پر موجود نہ تھا اس لئے میں اکیلا ہی چینی ریستوراں چلا گیا۔ یہ رشیدہ کدھر ہے؟''

"آپا کراچی چلی گئی ہیں ابا جی۔''میجر فرخندہ نے کہا''عادل بھائی کا آپریشن ہے۔''

''عادل کا آپریشن!''بختیار خاں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا''اس کو کس آپریشن کی ضرورت آپڑی؟''

''موتیئے کا آپریشن ہے ابا جی!''مسعود نے تسلی آمیز؛ لہجے میں کہا''اب وہ لیزر سے یہ آپریشن کرتے ہیں۔زیادہ دقت نہیں ہوتی۔''

''اچھا''بختیار خاں آنکھیں بند کر کے بولے''انسان اگر اصولوں پر کوئی سمجھوتہ نہ کرے تو اس کو کسی دقت نہیں ہوتی۔مجھے بھی چائنیز مینو دیکھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔میں مینو دیکھے بغیر نمبروں کے حساب سے آرڈر دیتا ہوں اور مجھے تقریباً سارے آئیٹم زبانی یاد ہیں لیکن کل رات میں نے بیرے کو بھی آڈر نہیں دیا تھا کہ مجھے کونے میں ایک ہیولا سا نظر آیا جو ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔میں نے دیکھا ضرور لیکن کچھ سمجھا نہیں۔تھوڑی دیر بعد بیرے نے آکر مجھے کہا' وہ صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔میں آہستگی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھا اور ان صاحب کی طرف چل دیا اور میری حیرانی کی کوئی انتہا نہیں رہی فرخندہ جب میں نے ایک مدت کے بعد سکندر کو دیکھا۔وہ ویسا ہی ہشاش بشاش اور نو برنو تھا۔اس کے ساتھ اس کے دو مہمان تھے جو مجھے دیکھ کر اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور دونوں نے اپنے ہاتھ میری طرف پھیلا دیئے۔۔۔۔۔تم تو سکندر کو اچھی طرح سے جانتے ہو مسعود؟''

''جی ابا جی' کیوں نہیں۔''مسعود نے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا''لیکن اس وقت میرے ذہن میں ان کی شکل کچھ ٹھک سے نہیں آرہی۔''

''حد ہوگئی مسعود۔۔۔۔۔''بختیار خاں نے چڑ کر کہا''بھئی سکندر اعظم! مقدونیہ کے شہنشاہ فلپس کا بیٹا' فاتح اعظم!''

فرخندہ نے کہا"ابا جی آپ باتیں نہ کریں' ڈاکٹر صاحب منع کر گئے ہیں۔''

ابا جی نے فرخندہ کی بات پر توجہ دیئے بغیر کہا''اس کے ساتھ چوڑے رخ کی ٹوپی لگائے نپولین بوناپارٹ تھا اور ساتھ ننگے سر ماؤزے تنگ تھا جس نے بند گلے کی موٹی بشرٹ اور اسی کپڑے کی پتلون پہن رکھی تھی۔میں نے ہاتھ اونچا کر کے کہا' عمل و حرکت اور فعل و اقدام کے پاسبانو میرا اسلام قبول کرو اور میرے مقدر کے ستارے پر نگاہ ڈالو کہ میں کرۂ ارض کے عظیم ترین رہنماؤں کی محفل میں ان کے ساتھ بیٹھا ہوں۔انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے میرا اسلام قبول کیا لیکن منہ سے کوئی جواب نہ دیا۔

''فرخندہ نے کہا''ابا جی! آپ نے اپنا گرین کیپ سول لے لیا؟''

ابا جی نے کہا''جب میرا مینو لے کر آیا تو میں نے کہا آج آپ تینوں میرے مہمان ہیں اور میں نہایت ادب کے ساتھ شرف میزبانی کے حصول کی درخواست کرتا ہوں۔سکندر نے اور ماؤ نے اثبات میں سر ہلایا لیکن بوناپارٹ کہنے لگا کہ معذرت چاہتا ہوں خان صاحب' آج میری طبیعت ذرا بوجھل ہے اس لئے میں نے کھانا نہیں کھاؤں گا البتہ آپ کے ساتھ بیٹھوں گا ضرور۔۔۔۔۔میں نے کہا' آپ صرلائٹ قسم کا سوپ لے لیجئے۔چکن بروتھ یا تھائی سوپ۔۔۔۔۔نپولین نے کہا یں محفلوں اور ضیافتوں میں کبھی بھی کھانا نہیں کھاتا کیونکہ میں اپنا دایاں ہاتھ ہمیشہ اپنی واسکٹ کے اندر رکھتا ہوں۔یہ دیکھئے' اس نے اپنا ہیٹ ہلا کر کہا' میں اپنی ہر واسکٹ کے درمیانی دو

بٹنوں کا فاصلہ زیادہ رکھواتا ہوں تا کہ میرا ہاتھ آسانی سے اندر داخل ہو سکے۔آپ کا بہت بہت شکریہ۔آپ کا ماحضر تناول کریں' میں آپ کو کمپنی دوں گا۔۔۔۔جب ماؤ بیرے کو آرڈر لکھوا چکے تو میں نے سکندر اعظم سے کہا' یہ علاقہ تو آپ کا دیکھا بھالا ہے اور آپ اسے فتح کر چکے ہیں اس لئے آپ کو تو کوئی دقت نہیں ہوگی۔۔۔۔۔اس نے مسکرا کر کہا' آپ کا یہ علاقہ تو میں نے فتح نہیں کیا تھا البتہ اس کے سارے بالائی حصے میرے زیر نگیں تھے۔میں نے سلیوکس کو ایک بلیو پرنٹ بنا کر دیا تھا کہ اگلی مرتبہ جب میں آؤں گا تو یہ سارا علاقہ فتح کر کے اپنی قلمرو میں داخل کروں گا لیکن واپسی پر ساہیوال کے کچھ جانگلیوں سے ہماری مڈ بھیڑ ہوگئی۔ان لوگوں کے پاس باقائدہ تو کوئی ہتھیار تھے نہیں' ڈانگوں کے ساتھ سن کی رسیوں سے چھریاں باندھ کر بلمیں سی بنا کر آ گئے تھے۔اس وقت گو میری سپاہ تھک چکی تھی' پھر بھی ہم ان جانگلیوں سے سینہ سپر ہو کر لڑے اور کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔۔۔۔۔میں نے کہا' سکندر صاحب اتنی چھوٹی سی عمر میں اتنی کم فوج کے ساتھ آدھی دنیا کو فتح کر لینا صرف آپ کے جوش عمل کی وجہ سے ہوا ورنہ یہاں تو کالے پہاڑ ایسے ہاتھیوں کی لاتعداد فوجیں تھیں۔۔۔۔سکندر نے کہا' بس جی کیا عرض کریں خاں صاحب' یہ سب مقدر کی باتیں ہیں۔ایک جانگلی کی برچھی میرے کندھے میں لگی اور تین انگل اندر اتر گئی۔میں نے گھوڑا چڑھا کر اس جانگلی کا تو خاتمہ کر دیا البتہ اس زنگ آلود برچھی سے مجھے سیپٹک ہو گیا تیز بخار نے میرا دماغ شل کر دیا۔پھر میں آپ کے علاقے پر دوسرا حملہ کرنے کی دل ہی میں لے گیا۔۔۔۔نپولین نے کہا' یہ سب قسمت کے کھیل ہیں اور جو کچھ ہونی کرتی ہے' وہ ہو کے رہتا ہے۔میں نے سارے یورپ کے چھکے چھڑا دیئے۔مصر کے ابوالہوال میرے دبدبے کے آگے اپنی ٹوٹی ناک رگڑنے لگے۔لیکن ہوا وہی' جو تقدیر میں لکھا تھا۔اپنی ساری تیاری' کوشش' ہمت اور پلاننگ کے باوصف میں روس میں پھنس کے رہ گیا۔وہاں سے واپسی بڑی ذلت کی واپسی تھی۔پھر واٹرلو کے مقام پر دو ٹکے کے نیلسن نے میری ہیرے جیسی فوج کی آن بان مٹی میں ملا دیا۔۔۔۔۔ماؤ نے کہا' کسی ملک پر فوج کشی کرنا اور قلعوں اور محلوں کے محاصرے کر کے جنگجو محافظوں سے ہتھیار ڈلوانا' اپنی دھرتی سے گ طیارے اڑا کر دشمن پر بمباری کرنا اور اپنے گھر کے صحن سے راکٹ لانچ کرنا بڑا ہی آسان کام ہے لیکن ذلتوں اور پستیوں میں ڈوبی ہوئی قوم میں انقلاب لانا مشکل ہی نہیں' ناممکن بات ہے۔میں نے گراں خواب چینیوں کو ان کی صدیوں کی نیند سے بیدار کر کے ایک زندہ قوم میں تبدیل کر دیا۔ان کو لانگ مارچ کی سوئی کے ناکے سے گزار کر ایک سپر پاور بنا دیا لیکن شاید اس کی ضرورت نہیں تھی۔۔۔یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کامریڈ۔میں نے چلا کر کہا اور کھانا کھاتے ہوئے لوگ مڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔۔۔۔میں ٹھیک کہہ رہا ہوں بختیار خاں۔ماؤ نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔لوگ انقلاب کا ذکر بڑے شوق سے کرتے ہیں لیکن جب وہ آ جائے تو اسے ناپسند کرتے۔۔۔۔۔سکندر اعظم نے ڈرم سٹک کی بوٹی منہ سے نکال کر کہا کہ کیسی باتیں کرتے ہو یار' تمہاری قوم تو تمہیں پوجتی ہے۔اگر وہ تمہیں ایک دیوتا نہیں سمجھتی تو ایک پیغمبر ضرور خیال کرتی ہے۔۔۔۔نپولین نے کہا' ہم بادشاہ لوگ اور فاتح لوگ تو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں لیکن انقلابی لیڈر تو لوگوں کے دلوں میں محبت اور مودت کے جھنڈے گاڑ دیتے ہیں۔وہ تو امر ہو جانے ہیں نپولین! ماؤزے تنگ صاحب کی تو چین میں پرستش ہوتی ہے۔لوگ ان کے جذبہ حب الوطنی اور خلوص و ایثار کو اب تک یاد کرتے ہیں اور جو جو قربانیاں انہوں نے چین کو آزاد کرانے میں دی ہیں اور جس ہمت اور جواں مردی کے ساتھ انہوں نے امریکہ کی مکروہ سیاست اور ثقافت کو اپنی سرزمین سے دور رکھا ہے' یہ انہی کا حصہ

ہے۔۔۔۔۔سکندر اعظم نے کانٹا روک کر پوچھا' کیا ٹرم چلائی تھی ماؤ تم نے امریکہ کے بارے میں؟۔۔۔۔۔میں انہیں پیپر ٹائیگر کہتا تھا' ماؤ نے کہا۔اور یہ اس وجہ سے کہتا تھا کہ میرے لوگوں کے دل سے امریکہ کی بڑائی' اس کی امارت اور اس کی جارحانہ صلاحیت کا خوف دور ہو جائے اور وہ کم از کم پوری ایک صدی تک امریکہ کو چین کی سرزمین سے دور رکھ کر اپنی مرضی کے مطابق ملک چلا سکیں۔۔۔۔۔اور اسی طرح سے ہو رہا ہے' میں نے کہا۔جب کوئی عمل نیک نیتی سے اور خلوص سے اور لگن سے کیا جاتا ہے تو اس کا یہی نتیجہ نکلتا ہے جو اس وقت چین میں روز روشن کی طرح نظر آ رہا ہے۔ہم پاکستانیوں کو تو چین کی دوستی اور چین کے عمل اور چین کی راست روی پر فخر ہے۔۔۔۔۔لیکن میرا تجربہ یہ کہتا ہے خاں صاحب' نپولین نے واسکٹ سے ہاتھ نکالے بغیر کہا' چین میں جو کچھ ماؤ نے کیا اور چین کو جس طرح ماؤ لے کر چلا اور چین جس انداز سے لال کتاب کی حدت میں تپ کر فولاد بنا' وہ اپنی اس منزل سے واپس بھی لوٹ سکتا ہے جس طرح روس سے میری مرجعت ہوئی تھی۔۔۔۔۔یہ تو خیر نہیں ہو سکتا' ماؤ نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بند کر کے جواب دیا۔یہ البتہ ہو سکتا ہے کہ ساٹھ ستر سال گزرنے کے بعد لوگ بور ہو کر اپنے عمل پر نظر ثانی شروع کر دیں اور میری تعلیمات میں بدعتیں تلاش کر کے الگ سے ایک ٹولہ بنا لیں' لیکن ابھی اس میں بہت دیر لگے گی۔۔۔۔آپ نے کام ہی ایسا پکا کیا ہے کہ اب اس کی چولیں کبھی بھی ڈھیلی نہ ہو سکیں گی۔میں نے انہیں یقین دلایا کہ اب ان کی تعلیمات کا اثر ایشیاء سے نکل کر دوسرے ملکوں میں پھیل رہا ہے۔کیوں ٹھیک کہا نہ میں نے؟''

''جی ابا جی!'' مسعود نے ہولے سے کہا اور اپنی گھڑی میں اگلی خوراک کا وقت دیکھنے لگا۔

ابا جی تھوڑی دیر تک آنکھیں بند کئے لیٹے رہے' اچانک ایک بار پھر ان کا نل کھل گیا۔کہنے لگے'' یہ بونا پارٹ بھی عجیب مسخرا آدمی ہے۔آدھ پون گھنٹہ ہماری باتیں سننے کے بعد بولا' بھائی صاحب میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انسان کے بنائے ہوئے اصول اور ضابطے' پلان اور منصوبے' فلسفے اور بندشیں انسان کے دکھوں کا علاج نہیں کر سکتے۔انسانوں کے لئے تو کچھ اوپر ہی سے بن کر آنا چاہیے۔کوئی زائچہ' کوئی صحیفہ' کوئی پلان! انسانی تجویزیں تو بڈھے بیل کی طرح ہی گوڈا ٹیک جاتی ہے۔۔۔۔مجھے نپولین کی یہ بات سن کر رونا آ گیا اور میرا دل درد کی شدت سے پھٹنے لگا۔میں نے چیخ کر کہا' فاتح پروشیا! یہ تم کیا رجعت پسندوں کی سی باتیں کرنے لگے ہو۔انسانوں کے مسائل انسان ہی حل کر سکتے ہیں اور انسانوں کے دکھ درد کا علاج انسان ہی کے ہاتھ میں ہے۔کوئی آسمانی قوت یا آفاقی طاقت زمین کے انسانوں کی مدد نہیں کر سکتی۔انسان صرف اپنی محنت سے' اپنے زور عمل سے' سرگرمی اور جانفشانی سے' مشقت اور دوڑ دھوپ سے اپنی راہوں پر چراغاں کر سکتا ہے اور اپنی زندگی میں آسانیاں پیدا کر سکتا ہے۔۔۔۔میری بھی یہی سوچ تھی' ماؤ نے کہا' لیکن اب مجھے انسانی کوشش اور انسانی تجویز بالکل بے معنی دکھائی دیتی ہے۔اپنی تجویز' کوشش' محنت اور جدوجہد کا نتیجہ اکثر کٹی کاٹ جاتے ہے اور مجھے اس فیکٹر کی تلاش ہے جو نتیجے کی کنی کٹوا دیتا ہے ______ میں نے ماؤ کا یہ فقرہ سن کر چھری کانٹا ہاتھ سے رکھ دیا اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔سکندر اعظم نے پریشان ہو کر پوچھا ______ کیا بات ہے بختیار خاں، تم رو کیوں رہے ہو؟ کیا کہا ان لوگوں نے تم سے؟ ______ میں نے سکندر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور بھوکے بھیڑیئے کی طرح ماؤ اور بونا پارٹ پر لپکا کہ کوشش، محنت، مشقت اور جدوجہد چھوڑ کر انسان ہاتھ پر کر لے، جامد ہو جائے، پتھر بن جائے اور ترقی نہ کرے، آگے نہ بڑھے، روشنی نہ پھیلائے۔بونا پارٹ نے کہا، جب میں

نے مصر فتح کیا تو مجھے وہاں کے لوگوں سے پتہ چلا کہ انسانوں کے لئے اوپر سے دو کام ہی تجویز ہوتے ہیں: امر کے مطابق کرتا جائے اور مناہی کو چھوڑتا جائے ـــــ اور ترقی نہ کرے، آگے نہ بڑھے، کوشش نہ کرے؟ ـــــ نپولین نے کہا، ترقی تو پیچھے سے خود بخود چلی آ رہی ہے اپنی عادت اور سنت کے مطابق، زوردار ہوا کی طرح۔ ہمیں تو صرف اوامر اور نواہی کی ڈور کو تھام کے رکھنے کا حکم ہے، پتنگ تو خود بخود اور چڑھتی جائے گی ہوا کے زور پر۔ ہم تینوں سے یہ غلطی ہوئی کہ ڈور کا تو کوئی دھیان نہیں کیا اور پتنگ کو اوپر اٹھانے اور پھدک پھدک کر اوپر چڑھانے کی کوشش کرتے رہے ـــــ سکندر اعظم نے کہا، یہ کیا چیز ہوتی ہے جس کا تم نے ابھی نام لیا اور جس کی ڈور تھام کر رکھنے کا حکم ہے؟ ـــــ بوناپارٹ نے کہا، یہ Dos & Don,ts کا ایک مینوئل ہے جو مصر والوں کے پاس تھا ـــــ پھر تم نے لیا کیوں نہ ان سے یہ مینوئل؟ سکندر نے پوچھا ـــــ وہ عجیب سے لوگ تھے، نپولیئن نے کہا اپنی ہی بدمستیوں اور خرمستیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کو پتہ نہ چلتا تھا کہ مینوئل کہاں ہے اور کس کے پاس ہے ـــــ ان کو ٹکٹکی پر کسنا تھا، ان کاغذی شیروں کو ماؤ نے غصے سے کہا ـــــ میں نے ان کو مشکیں باندھ کر کیمپ حاضر کر دیا تھا لیکن وہ سارے الول ٹل سے لوگ تھے۔ سارے سارا گروہ بھلکّڑ سے لوگوں پر مشتمل تھا۔ کوئی کہتا تھا میرے دادا کے پاس تھا یہ مینوئل۔ میں نے دیکھا ضرور ہے لیکن پھر پتہ نہیں کہاں گیا۔ ایک عورت کہتی تھی میری نانی کے سسرال والے اسے پڑھا کرتے تھے لیکن وہ سارے مرکھپ گئے۔ اب پتہ نہیں کس کے پاس ہوگا ـــــ اسے تلاش کرنا بوناپارٹ، اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو کبھی خالی ہوتھ واپس نہ آتا ـــــ یہ تمہارے زمانے کی چیز نہیں سکندر، تم سے بعد کی ہے۔ نپولیئن نے کہا، اس میں انسان کی زندگی کا مکمل زائچہ موجود ہے اور ترقی کے لئے اور آنے والے زمانوں کے لئے کھلا راستہ دے دیا گیا ہے ـــــ میں نے استاد زماں سے ایک ایسا ہی مینوئل بنانے کی درخواست کی تھی، سکندر نے کہا اور انہوں نے بنایا بھی! لیکن وہ چل نہیں سکا ـــــ یہ ارسطو کے بس کا روگ نہین تھا سکندر اور نہ ہی یہ کسی اور انسان کے بس کی بات ہے۔ اصل میں یہ ایک اور ہی چیز ہے ـــــ میں نے چیخ کر کہا تم مسلمان تو نہیں ہو گئے بوناپارٹ، ایک فنڈا اسپیشلسٹ قسم کے مسلمان؟ ـــــ نپولئن نے ہنس کر کہا، مجھے کیا ضرورت پڑی ہے مسلمان ہونے کی اور مجھے کیا خوشی مل سکتی ہے اس گروہ میں داخل ہونے سے! پہلے ہی اس دنیا مین کروڑوں مسلمان موجود ہیں، انہوں نے کیا کر لیا؟ ـــــ سکندر نے کہا، اگر یہ مینوئل میرے زمانے میں ہوتا اور مجھے مل جاتا تو میں ساری دنیا کو فتح کرنے کے بجائے سارے کرۂ ارض کو سوکھا کر دیا۔ پھر اس نے ذرا سا سوچ کر کہا، مجھے میرے حضرت دیوجانس کلبی نے ایک مرتبہ فرمایا بھی تھا ـــــ لیکن مین نے اسے مزید بات کرنے کا موقع نہیں دیا۔ غضب خدا کا! ایسے باہمت، باعمل اور نبرد پیکار کے سمبل، عمل و حرکت کے دیوانے، طرفداران عمل اور موضوع کیا چھیڑ کر بیٹھ گئے۔ وہ میرے مہمان تھے اور بہت ہی معزز مہمان تھے ڈاکٹر فرخندہ، لیکن پتہ نہیں ان کو ہو کیا گیا تھا۔ آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کو آ رہے تھے۔ ویسے ایسے ہو سکتا ہے پروفیسر؟"

"جی ضرور ہو سکتا ہے۔" پروفیسر مسعود نے کہا "ہو کیوں نہیں سکتا۔ زندگی میں سبھی کچھ ہو سکتا ہے۔"

"لعنت ایسی زندگی پر!" بختیار خان نے چڑ کر کہا "جو موج آگے بڑھنے کے لئے بنی ہے، وہ پیچھے کیسے جا سکتی ہے۔"

"اباجی!" پروفیسر مسعود نے ذرا تنگڑے ہو کر کہا "زندگی کوئی جامد چیز تھوڑی ہے کہ حکم کے تحت ایک ہی مقام پر پڑی رہے۔ یہ تو

ایک رواں دواں کائنات ہے۔ آگے بھی جاتی ہے، پیچھے بھی آتی ہے۔ دائیں بائیں، اوپر نیچے ہر طرف گھوم جاتی ہے۔ نہ آگے کوئی حد ہے نہ پیچھے، زندگی جو ہوئی ابا جی۔"

ابا جی بختیار خاں نے اپنے جاہل بیٹے کو جھڑکی دینے کے لئے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی مگر ان کے پپوٹے اٹھ نہ سکے۔ انہوں نے نفرت اور ناراضگی کی چند تیوریاں اپنے ماتھے پر ڈالیں اور چھوٹے بڑے سانس لینے لگے۔

خانساماں سوپ کی ٹونٹی دار پیالی لے کر اندر آیا تو میجر فرخندہ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے پیالی تپائی پر رکھنے کے لئے کہا۔ وہ الوؤں کی طرح دیدے گھما کر ادھر ادھر دیکھتا رہا اور احمق پنے سے اپنی باچھیں پھیلاتا اور سیکڑتا پیالی ہاتھ میں لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ مسعود نے سر کے اشارے سے فرخندہ کو سمجھایا کہ ٹھیک ہے، اسے جانے دو۔

رات تک تو ابا جی ٹھیک رہے اور اپنا جوس اور سوپ لے کر تھوڑی دیر کے لئے سو بھی گئے لیکن دوائیں لینے کے بعد ان کی بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔ میجر فرخندہ نے ان کو ڈرپ لگانے کی کوشش کی تو انہوں نے اشارے سے منع کر دیا۔ پھر جب وہ ان کا بی پی چیک کرنے لگی تو سر کے اشرے سے روک کر اپنے بستر سے اٹھا دیا۔ فرخندہ نے ان کا پپوٹا کھول کر آنکھ کا معائنہ کرنا چاہا تو انہوں نے کافی مضبوطی کے ساتھ اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ٹینڈنٹ نرس کہنے لگی "ڈاکٹر صاحب ابھی رہنے دیں، تھوڑی دی بعد آ کر چیک کر لیجئے گا۔"

بختیار خان نے بھرپور آواز میں پوچھا "اور کون ہے تمہارے ساتھ فرخندہ؟" تو نرس نے کہا "میں ہو سر، فرزانہ۔"

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے مربیانہ انداز میں پوچھا "اپنی ڈیوٹی پر آ گئی ہو؟"

"جی سر"

میجر فرخندہ نے فرزانہ کو دروازے کے پاس بلا کر کہا "دیکھو! میں اپنے کمرے میں ہوں۔ اگر ابا جی کو ذرا سی بھی بے چینی ہو تو مجھے فوراً اطلاع دینا۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب۔" فرزانہ نے مدھم آواز میں کہا "مجھے معلوم ہے۔"

میجر فرخندہ چلی گئی تو فرزانہ نے کرسی پر بیٹھ کر اپنے ناول سے خلال کی نشانی نکالی اور مریض پر ایک نظر ڈال کر پڑھنے لگی۔ اس وقت ناول میں بلی کتوں کی لڑائی ہو رہی تھی۔

صبح سویرے، فجر کے اذان کے ساتھ ابا جی بختیار خان کی حالت غیر ہو گئی اور ان کی سانس رک رک کر چلنے لگی۔ چند لمحے تو فرزانہ نے ان کی نبض دیکھ کر اور ان کا بی پی چیک کر کے گزار دیئے لیکن جب ان کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکلنے لگیں تو گھبرا کر ڈاکٹر فرخندہ کو جگانے چلی گئی۔ ڈاکٹر فرخندہ ہڑ بڑا کر اٹھی تو اس نے فرزانہ کی شکل دیکھ کر اسے محمود بھائی اور مسعود بھائی کو بھی اٹھانے کے لئے کہا۔ ابا جی کے کمرے میں پہنچ کر فرخندہ نے مریض کی حالت دیکھی تو لپک کر گیلری میں پڑے فون پر ڈاکٹر قدیر کو اطلاع دی۔ اور جب وہ فون کر کے واپس مریں کے کمرے میں گئی تو محمود بھائی اور مسعود بھائی دونوں ہی وہاں موجود تھے اور ابا جی کے بستر کے پاس کھڑے تھے۔ محمود نے ہاتھ کے اشارے سے فون کی بابت پوچھا تو فرخندہ نے سر ہلا کر کہا "کر دیا ہے اور ڈاکٹر صاحب پہنچ رہے ہیں۔"

تھوڑی دیر تک تینوں اسی طرح اپنے باپ کے گرد کھڑے رہے اور فرزانہ چارٹ میں کچھ بھرتی رہی۔ پھر اچانک مریض کا سانس نارمل ہو گیا اور اس نے اپنی آنکھیں نیم وا کر کے اور پتلیاں گھما کر تینوں کو باری سے دیکھا اور پھر آنکھیں بند کرتے ہوئے پوچھا" ڈاکٹر قدیر کو فون کیا؟"

" جی ابا جی" ڈاکٹر فرخندہ نے جواب دیا۔

" پہنچ رہا ہے؟"

" جی ابھی آ رہے ہیں۔"

" جاگا ہوا تھا؟"

" جی، نماز پڑھ کر سیر پر جانے والے تھے۔"

" اب تو سیدھا یہاں آئے گا ناں؟"

" جی اب تو سیدھے ہمارے طرف ہی آ رہے ہیں۔"

" اچھا یہ بتی بجھا دو اور کھڑکیوں سے پردے ہٹا دو۔ باہر سے بڑی اچھی روشنی آ رہی ہے۔"

" جی بہت اچھا۔"

میجر فرخندہ کھڑکیوں سے پردے ہٹانے لگی تو فرزانہ نے اپنی سیٹ سے اچھل کر فرخندہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔" ٹھریں ڈاکٹ صاحب یہ میں کر دیتی ہوں، آپ آرام سے بیٹھ جائیں۔" ڈاکٹر فرخندہ اپنے دونوں ہاتھوں میں سر تھا کر آرام سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد دروازے کی گھنٹی بجی اور نرس فرزانہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر قدیر تشریف لے آئے تھے اور فرزانہ ان کا بیگ اٹھا کر اندر داخل ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے آتے ہی سب سے پہلے مریض کا چارٹ دیکھا، پھر ڈاکٹر فرخندہ سے پوچھا" خان صاحب نے رات کیسے گزاری؟"

" بے چینی میں، بڑی بے چینی میں۔" بختیار خاں نے مجسم کراہ بن کر کہا" یہ رات بہت ہی لمبی ہو گئی تھی ڈاکٹر صاحب، بڑی مشکل سے صبح کی ہے۔"

" ویسے تو آپ ٹھیک ہیں؟" ڈاکٹر نے پوچھا

" ویسے ٹھیک ہوتا تو آپ کو کیوں فون کرواتا۔" بختیار خان نے جھڑک کر کہا" مجھے آپ کے درشنوں کا شوق نہیں ہے۔"

ڈاکٹر کی آمد کا سن کر مسعود اور محمود بھی اندر آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہروں پر کم خوابی کے اثرات نمایاں تھے اور وہ کچھ بے زار سے نظر آ رہے تھے۔ ڈاکٹر قدیر نے محمود کی طرف رخ کر کے کہا" انہیں ہسپتال شفٹ کرنا پڑے گا محمود صاحب اور نیورو فزیشن اور نیورو سرجن کو کنسلٹ کرنا ہو گا۔ میں انہیں فون کر دیتا ہوں۔" محمود نے اثبات میں سر ہلایا تو ابا جی بختیار خاں نے چڑ کر کہا" مجھے کوئی دماغی عارضہ نہیں ہے ڈاکٹر صاحب جو آپ مجھے نیورو فزیشن کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ ذرا سی ہارٹ کنڈیشن ہے جو بلڈ پریشر کی زیادتی سے پیدا

ہوگئی ہے۔میں گھر پر ہی ٹھیک ہوں۔آپ میری دوائیں تبدیل کر دیجئے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے خاں صاحب" ڈاکٹر قدیر نے تسلی آمیز لہجے میں کہا" میں دوائیں تبدیل کر دیتا ہوں لیکن ایک دوسری اوپینئن لینے میں کوئی حرج بھی نہیں۔"

بختیار خاں نے ڈاکٹر صاحب کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور آنکھیں بند کئے اسی طرح لیٹے رہے۔سب نے خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھا اور مزید خاموش ہوگئے۔ڈاکٹر صاحب ایک مرتبہ پھر الٹ پلٹ کے چارٹ دیکھنے میں مصروف ہوگئے اور فرزانہ جھک کر کمبل کے کنارے گدے تلے دبانے میں مصروف ہوگئی۔

ابا جی بختیار خاں نے آنکھیں کھولے بغیر آہستہ سے پوچھا" ڈاکٹر صاحب چلے گئے؟"

"جی نہیں۔" ڈاکٹر قدیر نے کہا" میں موجود ہوں۔"

" کل شام عصر اور مغرب کے درمیان ڈاکٹر صاحب" بختیار خاں نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا" برانڈرتھ روڈ پر قارون صاحب سے ملاقات ہوئی۔"

" قارون سے؟" ڈاکٹر قدیر نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ڈاکٹر صاحب،قارون سے ــــــ میں نے پہلے تو انہیں کبھی نہیں دیکھا لیکن کل اچانک ان کی زیارت ہوگئی۔وہ سرخ و سیاہ رنگ کی اوپن پجیروں میں زربفت کا قیمتی گاؤن پہنے کھڑے تھے اور سینکڑوں معززین علاقہ ان کی گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگ رہے تھے ۔یہ اوپن پجیروں کمپنی نے خاص طور پر ان کے لئے بنا کر بھیجی تھی اور اس کے دونوں طرف ریشم اور کمخواب کی جھولیں لٹک رہی تھیں۔لوگ اہلاً وسہلاً مرحبا کہتے ہوئے ان کی گاڑی کے ساتھ ہو نکتے جا رہے تھے اور گاڑی کے پیچھے تیس چالیس چاق وچوبند باوردی ملازموں کا ایک دستہ ان کی کنجیوں کی بھاری بھرکم چین اٹھائے چلا آ رہا تھے۔میں نے ہاتھ اٹھا کر ان کو سلام کیا لیکن انہوں نے میری طرف دیکھا نہیں۔معز زین کے گروہ جوان کی گاڑی کے ارد گرد تیز تیز چل رہے تھے،ایک دوسرے سے کہتے جا رہے تھے کہ کیا ہی خوب ہوتا اگر یہ دولت، یہ ساز و سامان، یہ کروفر، یہ مال و زر ہم کو بھی ملتا اور ہم بھی قارون کی طرح عیش کرتے ــــــ تیز رفتار گروہ میں سے ایک نے نعرہ لگایا" صاحب نصیب!" اور ہم سب نے مل کر جواب میں نعرہ لگایا" خوش نصیب، خوش نصیب"۔نوجوان نے نعرہ مارا" بھاگ بھرا اور طالع مند"۔ہم نے جواب میں نعرہ مارا" قسمت والا دولت مند"۔نوجوان نے کہا" ذی ثروت سردار ہے"۔ہم نے کہا" دھن والا زردار ہے، دھنی ہے ما یہ دار ہے"۔قارون ہاتھ ہلا ہلا کر اور مسکرا مسکرا کر ہمارے نعروں کا جواب دیتے جا رہے تھے اور ہمیں بے چین ہو کر ساتھ ساتھ بھاگنے سے روک رہے تھے کہ چلو ضرور مگر آہستہ چلو۔ہمارا یہ قافلہ برانڈرتھ روڈ سے شاہ عالمی کی طرف جا رہا تھا اور لوگ اپنا اپنا کام چھوڑ کر اس جلوس میں شریک ہو رہے تھے۔ہر شخص مسرور وشاداں تھا اور ہر چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔اتنے بڑے رتبے والے مال دار اور زردار امیر الامراء کے جلوس میں بھاگنا اتنی بڑی سعادت تھی جو صرف ان لوگوں کو نصیب ہوئی جنہوں نے آپ کی زیارت کی ــــــ آپ سن رہے ہیں ناں میری بات ڈاکٹر صاحب؟"

"جی جی سن رہا ہوں۔" ڈاکٹر قدیر نے کہا "بڑے غور سے سن رہا ہوں۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب کراؤن بس اڈے سے ذرا آگے بابا غلام محمد ٹنڈا الوہے کچرے کا ٹھید دھکیلتا ہوا چلا آ رہا تھا۔لوگوں نے لپک کراس کا ٹھیلہ ایک طرف کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بہت بھاری تھا اور آپ کی سواری قریب پہنچ گئی تھی۔بابے ٹنڈے نے روزمرہ کا معمول سمجھ کر اپنا ٹھیلہ ہجوم میں سے گزارنا چاہا تو آپ کی پجیروں اس کے آدھ ٹن وزنی ٹھیلے سے رک کر کھڑی ہو گئی۔جب بابے گاموں نے جھومتے ہوئے لوگوں کا گیت سنا: دھنی ہے مایہ دار ہے، سلام ہو سلام ہو، ہم پر بھی انعام ہو ______ تو بابے غلام محمد نے میلے سلوکے سے اپنا واحد باز و اوپر اٹھا کر اور ہاتھ کی اوٹ سے آنکھوں کی دھوپ روک کر اونچی آواز میں ہم سے کہا، اوے تمہارا ناس جائے! تم اس دولت پر کیا للچاتے ہو، اللہ تعالیٰ کے گھر کا ثواب اس دنیاوی کروفر سے ہزار درجہ بہتر ہے اور یہ نعمت ان لوگوں کو ملتی ہے جو دنیا کی حرص وطمع سے صبر کرتے ہیں۔قارون صاحب نے تو اس بات کا برا ماننا ہی تھا، ہم سب کو بھی اس احمق کی جسارت پر بڑا غصہ آیا۔سنہرے مستقبل کی طرف بڑھنے والے نوجوانوں نے تالیاں بجا بجا کر گانا شروع کر دیا:

فقرا ہے، نادار ہے

مورکھ اور نادان ہے

بابا گاموں ڈھانڈا ہے

عقل کے نام پہ آنڈا ہے

جب شور ذرا تھما اور قارون صاحب نے ڈرائیور کو گاڑی بڑھانے کا اشارہ کیا تو بابا گاموں مجسم تحیر ٹکر ٹکر قارون صاحب کو دیکھے جا رہا تھا اور اپنے ٹھیلے سمیت وہیں جما کھڑا تھا۔قارون صاحبؒ نے کڑک کر کہا ______ او مفلس، کنگلے، بھوکے، شودے، دہاڑی دار! تجھے پتہ نہیں میں کون ہوں؟ تو گاموں نے اپنا واحد باز و ہوا میں لہرا کر احمقوں کی طرح جواب دیا ______ مجھے اچھی طرح سے معلوم ہے قارون کو تو کون ہے، لیکن اپنے آپ اور اپنی ذات پر اتنا گھمنڈ نہ کر کیونکہ خدا گھمنڈ کرنے والے متکبر آدمیوں کو پسند نہیں کرتا۔اور اگر خدا نے اپنی مہربانی سے اور اپنے کرم سے تم کو اتنا دے رکھا ہے تو اس میں کچھ اپنی قوم کے لوگوں کو بھی دے اور اس دنیا میں آخرت کی جستجو بھی کر اور اس دنیا سے اپنا حصہ آخرت میں لے جانا نہ بھول۔پھر بابے گاموں نے اونچی آواز میں کہا، میری بات کان کھول کر سن لے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے، تو بھی بندوں کے ساتھ احسان کر اور اس دنیا میں اپنی دولت کے زور پر فساد نہ پھیلا۔میرا سوہنا اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ______ پھر ڈاکٹر صاحب، قارون صاحب نے پجیروں میں کھڑے کھڑے اپنے لاؤڈ سپیکر کا بٹن آن کیا اور مائیک پر فرمایا، اے لوگو! غور سے سن لو اور اچھی طرح سے جان لو کہ مجھ کو یہ سب کچھ میری ذاتی عقل اور ہنر مندی سے ملا ہے اور یہ سارا مال میں نے اپنی دانش کے زور پر جمع کیا ہے اور کوشش، جدوجہد، سعی مسلسل کا جو علم مجھے حاصل ہے اور جس کو بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ ساز گار کر کے میں اپنے آپ کو سنوارتا، اپنی ذات کو ابھارتا اور اپنے مال کا انبار تارہتا ہوں، یہ سب کچھ اس علم سے اور اس حکمت سے حاصل ہوا ہے۔میں اپنی محنت، کوشش، تگ ودو، تجویز اور تن دہی سے حاصل کیا ہوا مال کیوں کسی کو دوں اور اپنے علم، اپنی ہنر

مندی اور اپنی عقل پر کیوں نہ ناز کروں؟______ڈاکٹر صاحب میں تو حیران رہ گیا۔آپ سن رہے ہیں ناں؟"

"جی جی، میں سن رہا ہوں۔"

" آپ غور سے سن رہے ہیں ناں جوانہوں نے فرمایا؟"

"جی میں نے ایک ایک بات غور سے سنی ہے اور ہر ہر فقرے پر غور کیا ہے۔"

" کیا شان تھی ان کی ڈاکٹر صاحب!" اباجی بختیار خاں نے کہا" اور کیا رعب اور جلال تھا ان کے چہرے پر، اور کیا روشنی تھی ان کے ماتھے پر خودسازی اور خودمختیاری کی کہ میں تو ششدر رہ گیا۔ان کے انداز گفتار اور عظمت کردار نے مجھے ان کا گرویدہ کرلیا۔وہ انسان نہیں نظر آرہے تھے ڈاکٹر صاحب بلکہ عزم وہمت، خودشناسی، علم وحکمت اور فہم فہمید کے دیوتا نظر آتے تھے______میں اس عمر اور اس بیماری کے باوجود ان کی پجیروں کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہا۔نہ میری سانس پھولی نہ ہارٹ بیٹ میں اضافہ ہوا، نہ بلڈ پریشر بڑھا اور نہ ہی میں نے تھکاوٹ محسوس کی۔وہ ایک عجیب سماں تھا، عجیب منظر تھا اور عجیب وقت تھا ڈاکٹر صاحبؒ! دنیا کی ایک مقتدر، مقدس، محترم اور ذی عزت وعالی خیال ہستی مجھ سے چند گز کے فاصلے پر تھی اور میں ساون کی برکھا میں نہاتے بچے کی طرح شاداں وفرحاں ان کی گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا______پتہ نہیں اب ان کی زیارت نصیب ہوتی ہے یا نہیں۔پھر یہ موقع ہاتھ آتا ہے کہ نہیں اور پھر مرے بھاگ جاگتے ہین یا نہیں کیونکہ اب تو میں زندہ ہی اس پر ہوں کہ ایک مرتبہ پھر ان کی زیارت ہوجائے اور میں اور بھی قریب سے ان کو دیکھ لوں، ان سے مل لوں، ان سے بات کرلوں۔"

یہ کہہ کر اباجی بختیار خاں خاموش ہوگئے اور ان کے ہونٹوں پر پیڑی سی جم گئی۔ڈاکٹر قدیر نے گھڑی دیکھی اور اہل خانہ سے کچھ کہے بغیر مریض کے کمرے سے باہر نکل آئے۔

پورچ کی طرف چلتے ہوئے جب پروفیسر مسعود نے ڈاکٹر قدیر سے پوچھا کہ اباجی کو کس وقت ہسپتال شفٹ کیا جائے تو ڈاکٹر صاحب نے ان کا کندھا تھپتھپا کر کہا" میرا خیال ہے اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔کل تک انتظار کرکے پھر کوئی فیصلہ کریں گے۔"

آڑھت منڈی

شرفو کافی دیر سے کماد کے کھیت میں کھڑا تھا اور جب ربی گاؤں والوں کی نظر بچا کر اس کے پاس پہنچی تو اس نے آتے سار کہا" کہہ ' کیا کہنا چاہتا ہے؟" تو شرفو تھیلا آگے کر کے بولا" کہنا کو ہنا کیا ہے، ربیتے لئے یہ چند سوغاتیں کراچی سے لایا ہوں۔انہیں سنبھال لے۔"

ربی نے تھیلا کھول کر دیکھا۔اس میں کچھ ولایتی کلپ تھے، سر پر لگانے والا پلاسٹک کا ایک بینڈ تھا، دورولڈ گولڈ کے کنگن تھے، سیکو کی نمبروں والی چھوٹی سی ایک زنانہ گھڑی تھی اور ساتھ سلوفین کے چکنے کاغذ کا ایک پیکٹ تھا۔

"اس میں کیا ہے؟" ربی نے پیکٹ کو دونوں طرف سے دیکھ کر پوچھا۔

"اس مین پہننے کی ایک چیز ہے۔" شرفو مسکرا کر بولا" نیچے پہننے کی چیز، قمیض کے اندر۔"

"قمیض کے اندر؟" ربی نے نظریں اٹھا کر پوچھا۔

" کالے ریشم کی ہے۔" شرفو بولا" گوری بی بیاں پہنتی ہیں تو قمیض کے اندر بڑی دکھ مارتی ہے۔تو پہلے گی تو پہلے سے زیادہ جوان نظر آئے گی۔"

"اونہہ!" ربی نے بے پروائی سے کہا" یہ کون سی نئی شے ہے جو اتنی دور سے اٹھا لایا ہے۔یہ تو میں پہلے ہی پہنتی ہوں۔"

" بھلا دکھا تو۔" شرفو شرارت اور شرارت اس کے چہرے پر منجمد ہوگئی۔ربی کہنے لگی" دکھا تو دوں پر وہ کالے رنگ کی نہیں ہے۔ عام کپڑے کی ہے سادہ۔"

"تو پھر اسے اتار کے یہ پہن لے، میں باہر نگاہ رکھتا ہوں۔"

ربی ذرا سی سوچ کے بعد بولی" آج نہیں، کل پہنوں گی _____ نہا کے، گلابی سوٹ کے ساتھ۔"

پھر وہ دونوں بڑی دیر تک کماد کے کھیت میں کھڑے رہے اور جب یاسین چوکیدار کے کتے کی بھونک ادھر بڑھنے لگی تو وہ دبے پاؤں کھیت سے باہر نکل گئے۔ایک مشرق کی طرف اور دوسرا مغرب کی اور!

دوسال پہلے شرفو نوکری کی تلاش میں گاؤں سے نکل گیا تھا اور کسی کو خبر نہ تھی کہ وہ کہاں گیا ہے۔حضرت رکن عالم کے عرس پر ایک

بڈھے زائر نے جلیبیوں والے لڑکے کو بتایا تھا کہ تیری طرح کا ایک جوان مانو نواب شاہ میں نان بائی کا بھاڑ جھونکتا ہے اور وہ تمہارے ادھر ہی کا رہنے والا ہے۔ اس لڑکے نے خط بنواتے وقت کیکر والے نائی سے اس کا ذکر کیا لیکن اس نے کوئی توجہ نہ دی۔ پتوکی کا ایک ڈرائیور جب نائی سے شیو کروا رہا تھا تو نائی نے ڈرائیور کو بتایا کہ تمہارے ادھر کا کوئی لڑکا نواب شاہ میں تنور والے کا بھٹ جھونکتا ہے تو ڈرائیور نے کوئی توجہ نہ دی۔ ڈرائیور جب ٹرک لے کر پتوکی کے اڈے پر آیا تو اس نے منشی سے کہا کہ ہمارے ادھر کا کوئی نوجوان نواب شاہ میں ایندھن ڈھوتا ہے تو منشی نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔ موضع جھیاں کا نمبر دار جب لاہور کی بس پکڑنے اڈے پر آیا تو منشی نے کہا کہ "تمہارے گاؤں کا کوئی لڑکا نواب شاہ میں سنتے ہیں" تو نمبر دار نے کہا:

"ہمارے جھیاں کا تو بس ایک ہی منڈا ابن بتائے گیا ہے، پر وہ اتنی دور کدھر گیا ہوگا!"

شرفو چار مہینے تک تو نواب شاہ میں نان بائی کا بھاڑ جھونکتا رہا، پھر گرمی کی تاب نہ لا کر کراچی چلا گیا۔ کراچی میں پہلا دن اس نے سٹیشن پر گزارا، پھر کام کی تلاش میں ادھر ادھر گھومنے لگا۔ شام کو اس نے ڈرگ روڈ کے پاس ایک عمارت بنتے دیکھی تو اوپر چڑھتی ٹرالی کا نظارہ کرنے لگا جو سیمنٹ ریت کا ماوا لے کر دوسری منزل پر جاتی تھی اور خالی ہو کر واپس آ جاتی تھی۔ اس عمارت کا چھوٹا ٹھیکے دار ایک پنجابی تھا جس نے ایک چھوٹے سے انٹرویو کے بعد شرفو کا شناختی کارڈ دیکھ کر اس کو دہاڑ پر لگا لیا۔ شرفو کو کراچی کی بڑی بڑی اینٹیں، جسے بلاک کہتے تھے اور کراچی کی پیلی پیلی موٹی ریت دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اس کا سر فخر سے اونچا ہو گیا کہ وہ بڑی چیزوں والے بڑے شہر میں آ گیا ہے اور ان کی وجہ سے خود بھی بڑا ہو گیا ہے۔

پورے دو مہینے اس عمارت میں کام کرنے کے بعد شرفو ایک معمولی مزدور سے چھوٹا منشی بن گیا کہ اس نے مڈل پاس کرنے کے ساتھ ورنیکلر فائنل کا امتحان بھی دیا تھا اور وظیفہ حاصل کرنے میں صرف پچیس نمبروں کی کسر رہ گئی تھی۔ جو صاحب اس بلڈنگ کو دیکھنے کے لئے کبھی کبھی آتے تھے، ان کے ڈرائیور کے ساتھ شرفو کا گہرا یارانہ ہو گیا تھا کیونکہ وہ بھی پنجابی تھا اور پنجاب سے آنے والے غریب لوگوں کی مدد کا دم بھرتا تھا۔ سلطان سرگودھے کا رہنے والا تھا اور پچھلے پندرہ سال سے کراچی میں مقیم تھا۔ پہلے پہل اس نے سرگودھے کے اڈے پر پان سگریٹ کی دوکان کھولی لیکن ایک سال پریکٹس کے باوجود اس کو پان لگانا نہ آیا اور اس کی بکری گرنے لگی۔ پھر اس نے اسی کھوکھے پر سیخ کباب لگانے شروع کر دیئے لیکن مسالے پر پوری گرفت نہ ہونے کی وجہ سے وہ کبابوں کا سٹینڈرڈ برقرار نہ رکھ سکا اور اس نے یہ کام چھوڑ دیا۔ پھر اس نے چوٹی کے وکیل عبدالستار بیرسٹر کی چوانی اختیار کر لی جن کا دگھنٹیوں والا رئیس تانگہ شہر کی آبرو تھا۔ ایک روز جب منشی سے اس کی ہتھا پائی ہو گئی تو وکیل صاحب نے اس کو نوکری سے نکال دیا۔ اس عرصے میں سلطان نے تھوڑی بہت ڈرائیوری سیکھ لی تھی۔ وہ خوشاب وین کا کلینر بن گیا اور جس دن ڈرائیور چھٹی پر ہوتا، وہ ڈرائیور کی حیثیت سے ایک پھیرا خود لگا آتا۔ مالک نے اس کی کارکردگی سے خوش ہو کر اسے ایک الگ وین پر لگا دیا، لیکن اڈے میں ایک روز سب کے سامنے چھوٹے تھانے دار سے تھپڑ کھانے کے بعد وہ نوکری بھی چھوڑ دی اور وہ شہر بھی چھوڑ دیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک وہ کراچی ہی میں تھا اور پرائیویٹ ڈرائیور کے طور پر اسی خاندان کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔

ایک روز سلطان نے شرفو کو اپنی کار کے پاس بلا کر پوچھا کہ وہ پرائیویٹ نوکری کرنے پر رضا مند ہے تو شرفو نے آگا پیچھا سوچے بغیر ہامی بھر لی۔ اگلے دن وقت مقررہ پر سلطان اس کو ڈیفنس لے گیا اور صاحب کے سامنے پیش کر دیا۔

حامد علی صاحب نے اپنے کاغذات سے نگاہ اٹھائے بغیر شرفو سے پوچھا" پہلے بھی کہیں نوکری کی ہے؟" اس نے بڑے ادب سے سر جھکا کر کہا" پہلے کبھی کوئی چانس ہی نہیں ملا سر۔"

چانس کے لفظ پر حامد صاحب نے نظریں اٹھا کر شرفو کو غور سے دیکھا اور کہا" شناختی کارڈ ہے تمہارے پاس؟"

شرفو نے اپنا کارڈ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔

"یہ چھیاں کہا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"پتوکی کے پاس ہے جناب۔" اس نے اور مودب ہو کر کہا۔

"پتوکی کہاں ہے؟"

"لاہور اور اوکاڑے کے درمیان ہے سر، لاہور سے پچاس میل دور۔"

"تمہارے ماں باپ، بہن بھائی ہیں؟"

"صرف ایک بہن ہے سر، وہ شادی شدہ ہے اور ڈھولن وال میں رہتی ہے۔"

" کتنی مرتبہ چھٹی پر جایا کرو گے؟"

"میرا کوئی ہے ہی نہیں سر۔ میں نے چھٹی پر جا کر کیا کرنا ہے!"

" کتنے پیسے لو گے؟"

"جو آپ دے دیں گے۔"

"ڈاک کا کام کر لو گے؟"

"میں مڈل پاس ہوں سر، انگریزی پڑھ لیتا ہوں۔ ورنیکلر فائنل میں پچیس نمبروں سے میرا وظیفہ رہ گیا تھا۔"

"پندرہ سو روپے ماہوار ملیں گے اور گھر کی دیکھ بھال تمہارے ذمہ ہوگی۔"

"مجھے منظور ہے سر۔"

جب شرفو حامد صاحب کے بنگلے میں اپنا کوارٹر دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کوارٹر کے ساتھ ایک غسل خانہ بھی تھا جس میں لمبی زنجیری والا فلش بھی تھا اور نلکے کے اوپر چھوٹا سا آئینہ بھی تھا۔ اس نے آئینے میں غور سے اپنا چہرہ دیکھا۔ دو مرتبہ مسکرایا اور ایک مرتبہ مسکراتے ہوئے چہرے کو گھر کی دے کر ڈرا دیا۔ اب وہ خدا کے فضل سے اور سلچان کی مہربانی سے معزز لوگوں کی فہرست میں داخل ہو گیا تھا
۔

اس بنگلے میں کل تین افراد رہائش پذیر تھے۔ ایک حامد صاحب، ایک ان کا نوجوان بیٹا عمیر اور ایک عمیر سے بڑی بہت ہی خو

بصورت بیٹی آسیہ باجی۔ چند دنوں کے بعد شرفو کو معلوم ہوا کہ حامد صاحب کا ایک اور بیٹا بھی ہے جو سب سے بڑا ہے اور ان سے الگ کلفٹن میں رہتا ہے۔ بڑا بیٹا اسمبلی کا ممبر ہے اور اس کی تصویریں اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں۔ اس کو جب بھی فرصت ملتی ہے، اپنے ابا اور بہن بھائی سے ملنے ضرور آتا ہے اور بڑی بڑی لمبی خبریں دے کر جاتا ہے۔

کچھ روز تو شرفو اوپر کا کام کرتا رہا لیکن ایک روز جب اس نے اخباروں کی Cuttings اور حامد صاحب کی ڈاک متعلقہ فائلوں میں لگائی تو حامد صاحب نے اسے مکمل طور پر اپنے ساتھ نتھی کر لیا۔ حامد صاحب کا ایک سٹینو تھا ابرار، دیکھنے میں تو لڑکا آتا تھا لیکن اندر سے بالکل لڑکی تھا۔ اس کے ہاتھ، اس کی انگلیاں، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے اور باتیں کرنے کا انداز بالکل زنانہ تھا۔ پھر ایک مولوی صاحب تھے جو کتابت کا کام کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی سیاہ داڑھی، آنکھوں پر سنہری چشمہ، آنکھوں کے اندر سرمہ اردگرد شرارت، کھلے کھلے مضبوط نتھنے جو دو سانسوں میں ہی سارے کمرے کی ہوا اندر کھینچ لیتے تھے، کرخت ہاتھ، موٹی موٹی انگلیاں اور لکڑ ہارے کا سا ڈیل۔ ان کو ایسے ایسے لطیفے آتے تھے جن کو سن کر ابرار جھینپ جاتا تھا اور شرفو اپنے کوارٹر میں جا کر کاپی پر لکھ کر تکیے کے نیچے رکھ آتا تھا۔

حامد صاحب سارا دن لکھتے لکھاتے اور پڑھتے پڑھاتے رہتے۔ انگریزی کے مضمون وہ زبانی بول کر لکھاتے تھے۔ اور عربی اردو کے ہاتھ سے لکھ کر کتابت کے لئے دیتے تھے۔ ان کے سٹوڈیو میں ہر وقت ولایتی گانوں کی دھنیں بجتی رہتی تھیں۔ وہ ہمیشہ قالین پر اوندھی لیٹ کر انگریزی رسالوں کی تصویریں دیکھا کرتیں اور جب پینٹ کرتیں تو اپنے مستطیل سٹول پر ایک ٹانگ کی آلتی مار کر دوسری ٹانگ دور باہر کھینچ کے ایک رنگین پیڑھی پر رکھ کر اپنا پاؤں ہلاتی رہتیں۔ کبھی کبھی جب ان کا پاؤں سو جاتا تو وہ شرفو کو بلا کر کہتیں "دیکھنا یار یہ پیر پھر سو گیا ہے، اسے جگاؤ۔" شرفو پہلے تو اس کی ہلکی سی مالش کرتا، پھر زور کا ٹھولا مار کر کہتا "جاگا کہ نہیں جی؟" تو باجی پاؤں کے حساب سے نہیں، اپنی مرضی کے معاملے سے جواب دیتیں کہ "نہیں۔ تھوڑی سی مالش کرو، ابھی جاگ جائے گا۔" اس جاگنے اور جگانے کے وقفے میں ان کے درمیان کچھ محرمانہ قسم کی گفتگو بھی ہوتی جو زیادہ تر ربی کے گرد گھوما کرتی۔

آسیہ باجی کو ربی قسم کی عورتوں میں بڑی دلچسپی تھی۔ انہوں نے آزادی مستورات اور حقوق نسواں کی قسم کی ایک انجمن بھی بنا رکھی تھی جس کی چھوٹی میٹنگیں تو گھر پر ہوتیں لیکن بڑے سیمینار بڑے ہوٹلوں میں ہوتے۔ چھوٹی میٹنگوں میں زیادہ تر میمیں آتی تھیں اور ان کے پاس بڑے بڑے چارٹ ہوتے تھے۔ ان پر بھکارنوں کی، اینٹیں اٹھائے اوڈینوں کی اور گندی نالی کے پاس کپڑے دھوتی عورتوں کی تصویریں ہوا کرتیں۔ ایک تصویر میں ایک عورت پانی کے دو گھڑے اوپر نیچے رکھے ایک ٹیلے سے اتر رہی تھی۔ اس کے پاؤں ننگے تھے اور چہرہ سالو سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس تصویر کے نیچے انگریزی میں ایک موٹا سا فقرہ لکھا تھا جس کے آگے بڑا سا سوالیہ نشان تھا۔

یوں تو ساری میمیں ہی بڑے کھلے کھلے اور موکھے دار لباس پہنتی تھیں لیکن فردینا کراچی کی گرمی سے اتنی بے زار تھی کہ وہ نیکر، کھلے سینڈل اور پیازی چھلکے کے بلاؤز کے سوا اور کچھ بھی نہ پہن سکتی تھی۔ ایک روز جب وہ اپنی تین سالہ بچی کے ساتھ آسیہ باجی کے گھر آئی تو اس نے اٹھنی بھر گول بندیوں والا ایک کچھا اور اسی ڈیزائن کی ایک باڈی پہنی ہوئی تھی۔ وہ اپنی بچی کی انگلی پکڑے پھونکیں مارتی اور ہونکتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور اپنے بائیں ہاتھ سے چہرے کو ہوا کرتی ہوئی بولی "میں سوئمنگ پول جا رہی ہوں اور آٹھ میل لمبا چکر کاٹ

کر تیرے پاس اس لئے پہنچتی ہوں کہ تمہیں وہ تصویر دکھا سکوں جس کا میں نے فون پر ذکر کیا تھا۔" تصویر میں ایک پرانے بیل جیسا ہڈیوں مرد اپنی تغاری بیلچہ پاس رکھے زمین پر بیٹھا روٹی کھا رہا تھا اور اس کی بیوی سیمنٹ کے خالی تھیلے کو دوہرا، چوہرا، اٹھرا کر کے اسے پنکھا جھل رہی تھی۔

جب شرفو فردینا کے لئے کافی لے کر آیا تو فردینا سامنے تپائی پر دونوں ایڑیاں رکھے آرام کرسی میں لیٹی ہوئی تھی اور آسیہ باجی تصویر سامنے کھول کر اس پر کچی پنسل سے عنوانات لکھ رہی تھیں۔ شرفو نے دیکھا کہ فردینا کا پیٹ عبدو مراثی کے ڈھول کی طرح تنا ہوا تھا اور اس کی کمر اور پیٹ کے درمیان صرف کھڑے چپے کا فاصلہ تھا۔ اس کی ناف گیان دھیان میں ڈوبے ہوئے سادھو کی آنکھ کی طرح مست تھی جو بھگوان کے ساتھ شست لگا کر بیٹھا ہو۔ شرفو کا دل چاہا کہ ایک چمچی کافی اس میں ڈال کر دیکھے کہ پوری سماتی ہے یا باہر چو جاتی ہے لیکن اس کی بیٹی بار بار اس کا ہاتھ جھلا جھلا کر کہہ رہی تھی کہ اٹھو ممی، سوئمنگ پول چلو اور وہ بار بار جھٹک کر کہہ رہی تھی کہ ٹھرو مجھے کافی پینے دو۔ پھر فردینا نے انگریزی می ایک جملہ کہا جس کا تعلق للچائے ہوئے شرفو سے تھا۔ شرفو سمجھے بغیر جھینپ کر باہر نکل گیا۔

عمیر بھائی شاعر تھے اور انگریزی میں نظمیں لکھتے تھے۔ پہلے وہ اپنی نظم آسیہ باجی کو سنانے آتے اور اس پر دیر تک بحث ہوتی۔ پھر وہ حامد صاحب کے کمرے میں جا کر وہی نظم نساتے اور اس پر اور دیر تک بحث ہوتی۔ ابرار ان کی نظمیں ٹائپ کر کے ان کی فوٹو کا پیاں بناتا تھا۔ ایک نظم اپنی فائل میں رکھتا اور دوسری عمیر بھائی کو واپس کر دیتا۔ جب کبھی وہ عمیر صاحب کی نئی نظم کا ترجمہ شرفو کو اور کاتب کو سناتا تو اس کی نسوانی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگتے اور وہ رندھی ہوئی آواز میں کہتا" بڑی سچی اور حقیقی بات بیان کی ہے عمیر صاحب نے۔ ہماری غریبی کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ سن کر پتھروں کے دل بھی پانی ہو جائیں لیکن حکومت کو کوئی پرواہ نہیں، سب اپنے حلوے مانڈے میں مگن ہیں "۔

حامد صاحب کی بیشتر خط و کتابت یونیسکو کے ساتھ تھی اور ان کے بہت سارے فنڈز وہیں سے آتے تھے۔ ایک روز جب انہوں نے بھورے رنگ کی ایک فائل کے بارے میں سمجھاتے ہوئے شرفو سے کہا کہ داہنے ہاتھ کو الماری کے تیسرے خانے میں موٹی نیلی فائل کے ساتھ پلاسٹک کے زرد کارنر والی فائل اٹھا لاؤ تو شرفو نے پورے اعتماد کے ساتھ انگلی اٹھا کر کہا" حقوق انسانی والی والی فائل، بیسک ہیومن رائیٹس والی؟" تو حامد صاحب نے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر خوش ہو کر کہا" آج سے تمہاری تنخواہ میں پچاس روپے مہینہ اضافہ شاباش!" اور شرفو چھالنگیں مارتا لہریا گیت گا تا فائل لینے چلا گیا۔

حامد صاحب کے یہاں یوں تو اور لوگ بھی آتے تھے، لیکن ان میں زیادہ تعداد غیر ملکیوں کی تھی۔ اپنے لوگ بھی غریبوں کے مسائل کا ذکر کرتے تھے اور غیر ملکی بھی غریبوں ہی کے مسائل حل کرنے کی ترکیبیں بتاتے تھے۔ ان کے گھر پر مشاعروں کی محفلیں بھی جمتی تھیں اور پوئٹری ریڈنگ کے سمیلن بھی ہوتے تھے۔ ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو ایک ادبی مجلس کا اہتمام ہوتا جس میں دور دراز کے مرد اور عورتیں اکٹھے ہو کر اپنے ملک کے محکوم و مجبور اور خوار و پریشان طبقے کی آواز بن کر گونجتے اور دولت مندوں اور سرمایا داروں کے سوئے ہوئے ضمیر کو جھنجھوڑتے۔ ایک دبلے پتلے رومی ٹوپی والے بزرگ ملیر سے چل کر آتے تھے اور ان مجلسوں میں باقاعدگی سے حصہ لیتے تھے۔ یہ کسی طبقے پر

لعن طعن کرنے کے بجائے حکومت وقت کے خلاف نظمیں لکھ کرلاتے تھے اور اپنے دبلے وجود کے ساتھ بڑی گرج دار آواز میں للکارتے تھے۔مجلس کے کاتمے پر جب سب لوگ برف کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں چاندی کے چمٹوں میں پکڑ کر اپنے اپنے گلاسوں میں ڈالتے تو یہ رومی ٹو پی والے ساتھ کے کمرے میں شام کی نماز ادا کرنے چلے جاتے۔ بڑی دیر تک اونچی آواز میں منت ومناجات کرنے کے بعد واپس آتے تو ان کی خالی کرسی کے سامنے چوکور تپائی پر ایک بڑا گلاس لبالب بھرا رکھا ہوتا۔وہ ہمیشہ آواز دے کر کہتے "بہت زیادہ ڈال دی آپ نے حامد صاحب" اور حامد صاحب ہر مرتبہ دھیمی آواز میں ایک ہی جواب دیتے کہ "جھاگ ہی جھاگ ہے میر صاحب، ابھی بیٹھ جائے گی تو گلاس آدھے سے بھی کم رہ جائے گا۔"

شرفو برف کی ٹکڑیاں مشین سے نکال نکال کرلاتا تھا اور خالی بوتلیں واپس لے جا کر احتیاط سے بند کر دیتا تھا۔ایسے اچھے دن شرفو کی زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ایک طرح سے وہ حامد صاحب کا رازدار تھا اور ان کی ضرورت کی چیزیں وہی خرید کرلاتا تھا۔ ابرار اور خانساماں دونوں اس کے خلاف ہو گئے تھے،لیکن کھل کر اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔کاتب صاحب باتوں باتوں میں حامد صاحب کی ٹوہ لیا کرتے تھے لیکن شرفو پڑھا لکھا نوجوان تھا اس لیے ان کی تہہ دار باتیں خوب سمجھتا اور ہر بار خالی دے جاتا تھا۔آسیہ باجی کی سیفٹی کے خصوصی بلیڈ بھی وہی انٹر کان کی سپیشل شاپ سے لے کر آتا اور عمیر صاحب بھی اس کو چٹ لکھ کر دیتے تو چھوٹی لفافی کے تین پیکٹ ایک ساتھ لانا اسی کا کام تھا۔گو عمیر صاحب ہر مرتبہ نئی قسم کا نام لکھ کر دیتے تھے لیکن اس کو سب سے زیادہ وہ لفافی اچھی لگتی تھی جس پر ہونولولو کی ہلا ہلا ڈانسر کی تصویر ہوتی۔

ایک روز جب فوٹو گرافر اپنے کیمرے اور لائیٹس سوزوکی وین میں رکھ کر آ گیا تو بارش شروع ہو گئی اور باہر جانے کا شیڈول تلپٹ ہو گیا۔حامد صاحب کا Despath تیار تھا اور اسے ہر حال میں صبح کی پوسٹ سے نکل جانا تھا،لیکن تصویریں تیار نہ تھیں۔حامد صاحب کی بے قراری غصے میں تبدیل ہو گئی اور انہوں نے اونچے اونچے بولنا شروع کر دیا تو آسیہ باجی اپنے سٹوڈیو سے نکل کر بولیں "اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے ڈیڈی، آپ باہر کا کام گھر پر بھی تو کر سکتے ہیں۔ ہمارا شرفو جو موجود ہے۔"

"شرفو! " حامد نے حیرانی سے پوچھا "وہ کیا کر سکتا ہے؟"

"وہ سبھی کچھ کر سکتا ہے۔" آسیہ نے اعتماد سے کہا اور شرفو کو اس کے کوارٹر سے بلا لائی۔

شرفو کی پرانی قمیض پھاڑ کی اس کے گلے میں لٹکا دی گئی۔سر کے بال اوپر اٹھا کر پھوئی پھوئی کر کے ان پر ہیر سپرے مارا گیا۔ چہرے پر بوٹ پالش کے نشان ڈالے گئے۔ایک ہاتھ پر پٹی اور ماتھے پر بوٹ کا تسمیہ باندھا گیا۔پھر چن چن کر گھر کے سات پھٹے پرانے بوٹ اور جوتے اس کے آگے ڈالے گئے۔وہ برستی بارش میں ٹوٹی ہوئی باڑ کے پاس بیٹھ کر بوٹ پالش کرنے لگا اور فوٹو گرافر نے تین اینگلو سے اس کی تصویریں بنائیں۔جب آسیہ نے فتح مندانہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنے باپ کی طرف دیکھا تو ان کو بدستور ناخوش پایا۔انہوں نے اپنے مضمون میں چوری چھپے ہیروئن فروخت کرنے والوں کا بھی ذکر کیا تھا اور ایسے خفیہ فروش کی تصویر کے بغیر ان کا مضمون نامکمل تھا۔فوٹو گرافر نے آسیہ باجی کو مخاطب کر کے کہا "میری سوزوکی میں میک اپ کٹ ہے۔آپ ذرا ٹھہریں، میں لے کر آتا ہوں۔"

فوٹوگرافر کی میک اپ کٹ میں تین قسم کی داڑھیاں تھیں: بڑی، چھدری اور نان پروفیشنل۔ حامد صاحب نے چڑ کر کہا "یہ تو بچوں کے لگانے والی ہیں جو بانسریاں بیچنے والا لاٹھی پر باندھ کر لفنسٹن سٹریٹ میں بیچا کرتا تھا۔ ان سے کام نہیں چلے گا۔"

فوٹوگرافر نے کہا "میں اس اینگل سے تصویر بناؤں گا حامد صاحب کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ اصلی ہے یا نقلی؟"

آسیہ باجی نے تینوں داڑھیوں کو غور سے دیکھا اور ان میں سے ایک کو پسند کیا۔ فوٹوگرافر نے کہا "یہ ٹھیک نہیں باجی، یہ تو مولویوں کی داڑھی ہے۔ اس کے بجائے یہ لگائیں، ڈاکو داڑھی۔"

لیکن آسیہ نے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا "یہی لگائیں، یہی مناسب ہے۔ ہمیں ان کے خلاف بھی تو یدھ کرنا ہے۔" اپنی بیٹی کی اس بات پر حامد صاحب خوش ہو کر بولے "بالکل ٹھیک ہے، یہ لمبی داڑھی ہی چلے گی۔"

جب شرفو کو داڑھی لگا کر اور چہرے پر پیلا پینٹ چڑھا کر اسے کوارٹر کی پلستر اتری دیوار کے کونے پر کھڑا کیا گیا تو وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ حامد صاحب نے کہا "میاں اشرف الدین تم کو چوری چھپے منشیات فروخت کرنے والے کا پارٹ ادا کرنا ہے اور اپنے چہرے کو ایسے چوکنا رکھنا ہے جیسے چھاپہ مار پارٹی کی آہٹ پر مجرم ہوتے ہیں۔" تو شرفو کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلا کر فوٹوگرافر کی طرف دیکھا اور کہا "اتاریں فوٹو۔"

فوٹوگرافر نے کیمرہ فوکس کیا تو شرفو نے دونوں آنکھوں میں ایسا بھینگ ڈالا اور اپنی ناک کا بانسہ ایسے مروڑ کہ اس کی شکل دیکھتے دیکھتے ڈاکٹر جیکل سے مسٹر ہائیڈ میں تبدیل ہوگئی۔ داڑھی میں پانی کے قطروں نے گھونسلا بنا کر اسے چھدرا ہونے سے بچا لیا اور شرفو کی مڑی ہوئی گردن نے اسے نان پروفیشنل سے پروفیشنل داڑھی بنا دیا۔ ایک، دو، تین فلیش چلے اور حامد صاحب نے آگے بڑھ کر شرفو کو اپنی باہوں میں لے لیا۔

آسیہ نے اپنی جینز سے چمٹے بارش کے قطروں کو جھاڑ کر کہا "آپ ایسے ہی نہ پریشان ہو جایا کریں ڈیڈی۔ جب ہم ہیں تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔" پھر وہ اندر چلی گئی اور فوٹوگرافر جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹنے لگا۔

پورے دو سال اور تین مہینے بعد جب گمشدہ شرفو واپس جھیاں آیا تو گاؤں میں جشن کا سماں ہوگیا۔ بوڑھے، مرد، عورتیں، جواں سال ساتھی اور چھوٹے بچوں نے اس سے لگ کر آنے والی ہواؤں سے بھی بھی باتیں شروع کر دیں۔ وہ ایک بڑے سے تھیلے میں روپے روپے، ڈیڑھ ڈیڑھ روپے اور کچھ دو دو روپے والے کوئی سوسوا سو تحفے لے کر آیا تھا۔ جس گھر میں بھی سلام کرنے جاتا، ایک تحفہ نکال کر دے دیتا اور اگلے گھر خبر پہنچ جاتی کہ شرفو ادھر بھی آنے والا ہی ہے۔ منتظر گھر کا سارا کام چھوڑ کر چپ چاپ، دم سادھے اس کے انتظار میں دروازے کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتے اور وہ سعودی عرب کے بادشاہ کی طرح تمغے تقسیم کرتا گھر گھر گھومتا جاتا۔ سارے گاؤں والے شرفو سے بس دو ہی سوال کرتے تھے کہ کس کام پر لگے ہو اور کتنی چھٹی آئے ہو؟ چھٹی کے بارے میں تو وہ بتا دیتا کہ صرف پندرہ دن کی چھٹی ملی ہے، لیکن کم کی بابت خاموش رہتا۔

کماد کے کھیت میں کھڑے کھڑے ربی نے کوئی سو مرتبہ اس سے پوچھا کہ اس کو کہاں نوکری ملی ہے اور وہ کیا کام کرتا ہے تو شرفو ہر

مرتبہ کبھی ہنس کر، کبھی مسکرا کر اور کبھی چونڈی کاٹ کر اس کی بات ٹال دیتا۔ تھوڑی دیر بعد ربی کو پھر دیا د آتا تو وہ دھمکا مار کر پوچھتی "مرجا نیاں! بتا تو سہی تیری نوکری کس کام کی ہے؟" تو شرفو ہنس کر جواب دیتا "اوئے بتایا تو ہے کہ کاروبار کی نوکری ہے، سرکاری نہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" ربی کہتی "سرکار تو کراچی میں ہے ہی نہیں، سارا کاروبار ای کاروبار ہے۔ پر تیرا کاروبار کس قسم کا ہے؟" اس پر یاسین چوکیدار کا کتا بھونکنے لگتا اور اس کی آواز قریب آنے لگتی۔ جب اس کی آواز اور یاسین چوکیدار کا کتا بھونکنے لگتا اور اس کی آواز قریب آنے لگتی۔ جب اس کی آواز اور یاسین کی للکار بہت ہی قریب آ گئی تو دونوں کماد کے کھیت سے نکل گئے۔ ایک مشرق کی طرف اور دوسرا مغرب کی اور!

رات کو جب سارے لوگ نمبردار کے کوٹھے میں جمع ہوئے تو انہوں نے شرفو اور نمبردار کو تو چارپائی پر بٹھالیا اور باقی سب ان کے اردگرد زمین پر بیٹھ گئے۔ نمبردار نے کہا "شرف دین یہ تو پرہ چل گیا ہے کہ تو پندرہ دن کی چھٹی پر آیا ہے اور ہمارے حساب سے یہ بہت تھوڑی ہے۔ پر تو نے یہ نہیں بتایا کہ تو کام کیا کرتا ہے؟"

"کراچی میں کرتا ہوں چاچا!" شرفو نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

"او بھائی کراچی میں تو کرتا ہے اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہمارے گاؤں کا پہلا آدمی کراچی تک پہنچ گیا پر سوہنیا پترا تو نے یہ نہیں بتایا کہ وہاں کیا کام کرتا ہے۔"

"بس یہی چاچا! کاروبار، تجارت۔" شرفو نے منہ لپا کر کے جواب دیا۔

"کاروبار کی بھی تو ہزار قسمیں ہیں شرفو!" حسنے تیلی نے کہا "تو کون سا کام کرتا ہے؟"

"میں تو کوئی کام نہیں کرتا، میرا صاحب کرتا ہے اور میں اسی کا ملازم ہوں۔"

"وہ تو ہمیں تیرے ٹھاٹ باٹ سے ہی پتہ چل گیا ہے بھائی کہ کوئی اچھی نوکری مل گئی ہے، پر یہ نوکری ہے کس شے کی؟"

"میرے صاحب کا بڑا لمبا کاروبار ہے۔ اپنے ملک میں بھی چلتا ہے اور باہر ولایت میں بھی۔" شرفو نے فخر سے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے کاکا۔" نمبردار نے کہا "بڑا کاروبار ساری دنیا میں ہی چلتا ہے اور اسی وجہ سے بڑا ہوتا ہے کہ پوری دنیا میں چلتا ہے لیکن وہ کاروبار ہے کیا؟"

ذرا سا توقف دے کر شرفو نے کہا "ہم غریبی بیچتے ہیں۔"

"غریبی!" سب نے یک زبان ہو کر کہا اور ہر شخص الرٹ ہو کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک کوٹھے میں خاموشی چھائی رہی اور کسی کو سوال کرنے کی جرات نہ ہوئی۔

اپنے مال پسو جیسے لوگوں کو اس طرح بھونچکے بیٹھے دیکھ کر شرفو نے کہا "اس وقت یہ دنیا کا سب سے بڑا کاروبار ہے چاچا اور اس کے زور پر بڑی بڑی بادشاہیاں چل رہی ہیں۔"

"بادشاہیاں! غریبی کے زور پر چل رہی ہیں؟" نمبردار نے حیران ہو کر پوچھا تو حسنے تیلی نے کھلے ہاتھ کی ڈگڈگی کے انداز میں ہلا

کر کہا" بڑے شہر جا کر پیچ ڈھیلا کروالیا ہے میرے یار نے۔اوئے کبھی بادشاہی غریبی کے سہارے بھی چلی ہے اس دنیا میں۔"

شرفو نے کہا"اب چل رہی ہے اور آئندہ بھی کئی سو سال تک اسی کے سہارے چلتی رہے گی۔"

حسنا تیلی کوئی بات کئے بغیر محفل سے اٹھ کر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد نمبر دار نے پھر کہا"اوئے کوئی عقل کی بات کر یار۔کبھی موم بتی ہوا کے زور پر چلی ہے،لہو تلوار کی کاٹ سے رکا ہے، میمنا بگھیاڑ کی پالنا سے پلا ہے۔"

"بڑے شہر کے بڑے لوگوں میں بڑی عقل ہے چاچا۔وہ تو مٹی کو سونا کہہ کر بیچ لیتے ہیں،غریبی تو پھر بڑی قیمتی چیز ہے۔"

"غریبی قیمتی چیز ہے!" تین چار آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔

"میرا صاحب غریبی بیچتا ہے اور بہت مہنگے بھاؤ بیچتا ہے۔یہاں بھی بکتی ہے اور ولایت میں بھی۔ادھر بھی اس کے آرڈر بک ہو تے ہیں اور دساور بھی یہ مال جاتا ہے۔"

نمبر دار حسنے تیلی کی طرح اٹھ کر گیا نہیں پر خاموش ہو گیا۔

شرفو نے کہا" چاچا لاری کس کے زور پر چلتی ہے؟"

"پٹرول کے زور پر۔" یاسین چوکیدار بولا۔

"اسی طرح حکومت غریبی کے پٹرول سے چلتی ہے۔" شرفو نے کہا" اور موگھا کس کے زور پر چلتا ہے؟

"پانی کے زور پر۔" نورا کھنکار کر بولا۔

"اسی طرح بادشاہی غریبی کے بیان کی شہ چلتی ہے۔غریبی کو پھوک نہ بھرو تو حکمرانی کا پہیہ ٹائٹ ہی نہیں ہوتا۔"

"اوئے تو ہوش میں تو ہے کاکا۔" نمبر دار نے فکر مند ہو کر کہا" غریبی بک سکتی تو ہم سے زیادہ مال دار اور کون ہو گا اس دنیا میں۔"

"اپنے گاؤں سے تو چاہے ٹرالیاں بھر بھر کر لے جاؤ غریبی دن رات، یہ جنس ختم ہی نہیں ہو سکتی۔" نورے نے کہا۔

"ہم سے کرواسودا گر یبی کا۔" نمبر دار نے کہا" ہم ساری عمر کی سپلائی دے سکتے ہیں، بے حساب۔"

شرفو نے ہنس کر کہا" چاچا جس طرح تم اپنی جنس ڈائرکٹ منڈی میں نہیں بیچ سکتے اسی طرح تم اپنی غریبی بھی دنیا کی مارکیٹ میں نہیں بیچ سکتے۔اس کے لئے آڑھتی کی ضرورت ہے۔"

"ٹھیک ہے،ہم آڑھت دینے کے لئے تیار ہیں۔" نمبر دار نے کہا۔

"لیکن اس جنس کا آڑھتیا مال لے کر تم کو کچھ نہیں دے گا۔ساری آمدن آڑھت میں ہی کاٹ لے گا۔" شرفو نے کہا" منظور ہے یہ سودا؟"

"تو پھر ہمیں کیا فائدہ ہوا؟ نمبر دار نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس کاروبار میں تو پھر اسی طرح سے ہوتا ہے چاچا!"

چاچے نے آڑھتے کو ایک گندی گالی دی اور اس کا بڈھا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ پھر اس نے آنکھیں میچ کر پوچھا " کتنا کو منافع ہو جاتا ہے اس کاروبار میں؟"

"منافع!" شرفو نے ہنس کر کہا" منافع چاچا! اس کاروبار میں!! اس میں منافع بھی ہوتا ہے اور ساتھ تخت اور تاج بھی ملتا ہے۔ بگل ،نقارہ، سجدہ سلامی بھی ملتی ہے اور پوجا پاٹ بھی ہوتی ہے۔"

"پوجا پاٹ کس کی؟" نمبر دار نے غصے سے پوچھا۔

" آڑھتے کی چاچا، اور کس کی!"

"تو تیرے صاحب کو بھی ملی کوئی گدی کہ خالی منافع ہی کما رہا ہے؟" دولو کمہار پہلی مرتبہ بولا۔

"اس کے بڑے بیٹے کو گدی ملی ہے اور میرا صاحب اور اس کے دو بچے منافع کما رہے ہیں۔"

"اور یہ سب غریبی بیچ بیچ کر ہوا ہے؟" نمبر دار غصے سے غرایا۔

شرفو ہنسنے لگا اور اس نے چاچا نمبر دار کے اس مکرر سوال کو قابل اعتنا نہ سمجھ کر ہنستے ہوئے منہ کے آگے ہاتھ رکھ لیا۔

نمبر دار غصے میں تلملایا، گالیاں بکتا اپنے ہی کوٹھے سے نکل کر باہر چلا گیا اور باقی سارے لوگ سی طرح بیٹھے رہ گئے۔

یہ بات سارے گاؤں میں آگ کی طرح پھیل گئی کہ شرفو جس کارخانے میں کام کرتا ہے' وہاں غریبی کا کاروبار ہوتا ہے اور غریبی بیچ بیچ کر شرفو کے مالک نے کراچی شہر کے اندر' سمندر کے کنارے کوئی ڈیڑھ مربع زمین خرید لی ہے۔ اس زمین پر بلڈنگیں بنا کر وہ امیر لوگوں کو بیچتے ہیں اور نفع کماتے ہیں۔ اس کا بڑا بیٹا غریبی کے ذکر اذکار سے ہی اسمبلی کا ممبر بن گیا ہے اور اس نے کلفٹن پر ہرے پتھر کا بہت خوبصورت بنگلہ بنایا ہے جس میں انیس نوکر ہر قسم کی خدمت پر ہر وقت موجود رہتے ہیں۔

دوپہر کے وقت جب یہ خبر ربی کو پہنچی تو اسے یقین ہو گیا کہ گاؤں والوں نے شرفو کو بدنام کرنے کے لئے یہ خبر اڑائی ہے اور اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ شرفو جو گاؤں کے بچے بچے کے لئے تحفے لے کر آیا تھا جس نے گھر گھر جا کر سب کو سلام کیا چھوٹوں کو گود میں اٹھا کر پیار کیا' بڑوں کے سامنے ہاتھ باندھ کر اور سر جھکا کر ان سے دعائیں لیں وہی شرفو اب سب کی نگاہوں کا کھٹکتا خار بن گیا ہے اور لوگوں نے اس کے بارے میں گند پھیلانا شروع کر دیا ہے۔ ربی اپنے گھر سے نکلی۔ دوپٹہ کس کر سر اور چہرے کے گرد لپیٹا اور شرفو کی تلاش میں گاؤں کی گلیوں میں گھومنے لگی۔ شرفو دینے سبزی فروش کے چونترے پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا اور دینے کو رنگ دار تصویریں دکھا رہا تھا جس میں کہیں کہیں وہ بھی نظر آتا تھا۔ ربی نے قریب آ کر دینے سے کہا ''کل والا ایک کھیرا بالکل کڑوا زہر تھا' میں اس کے بدلے میں دوسرا لینے آئی ہوں۔''

ربی نے کھیرا لیا' انگلیوں کے پٹاخے نکال کر شرفو کو سگنل دیا اور چپ چاپ وہاں سے چل دی۔

جب وہ ایک دوسرے سے الگ مڑھیوں کے پاس پہنچے' جہاں حلال خوروں کا ہڈیاں صاف کرنے کا مردار خانہ کارخانہ تھا تو ربی چری کے کھیت میں داخل ہو کر پہلے تو بیٹھی اور پھر بیٹھی بیٹھی چل کر اس کھولے میں پہنچ گئی جس میں چمگادڑیں رہتی تھیں۔ شرفو نے گندی زمین

پر چوکڑی مار کر ربی کو اپنی جھولی میں بٹھا لیا اور اس کے چہرے سے دوپٹہ ڈھیلا کر کے بولا ''کیا بات ہے؟ تو بہت گھبرائی سی ہے۔"

ربی نے درد بھرے لہجے میں کہا" گاؤں والوں نے تیرے برخلاف باتیں کرنی شروع کر دی ہیں کہ تو جس کا خانے میں کام کرتا ہے وہاں غریبی بیچتے ہیں اور غریبی کا کاروبار کرتے ہیں۔"

"پھر؟" شرفو نے مسکرا کر کہا۔

"پھر کیا؟" ربی نے پہلو بدل کر کہا" یہ کوئی عقل کی بات ہے۔ بھلا کوئی غریبی بھی بیچ سکتا ہے اور کوئی مورکھ ایسا بھی ہو سکتا ہے جو غریبی خرید کر گھر لے جائے۔"

شرفو نے ہنس کر کہا "یہ بات نہ رہتے گاؤں والے سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی تیرے بھیجے میں آسکتی ہے لیکن غریبی سچ مچ بکتی ہے اور بڑے مہنگے بھاؤ بکتی ہے۔ میرے صاحب کا یہی کاروبار ہے۔"

ربی تڑپ کر شرفو سے الگ ہو گئی اور اس کے سامنے ہو کر بیٹھ گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ گاؤں والے ٹھیک کہتے ہیں۔ شرفو کا دماغ چل گیا ہے۔

تھوڑی دیر تک دونوں ایک دوسرے کے سامنے خاموش بیٹھے رہے۔ پھر شرفو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا" دیکھ ربی! ایک تو وہ سوداگر ہیں جو منڈی میں کھیت کھلیان کی جنس بیچ کر روپیہ کماتے ہیں اور دھن دولت جوڑ کر رکھتے ہیں۔ اس کو تو تم جانتی ہو۔ یہ سیٹھ مشہور نہیں ہوتے اور اپنی اپنی منڈی تک ان کا نام ہوتا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ کچھ سیٹھ ایسے بھی ہیں جو سارے ملک میں مشہور ہیں بلکہ ملک سے باہر بھی مشہو رہیں۔ ان کے نام ہر روز اخباروں میں چھپتے ہیں اور ع ولایت کے ریڈیو بولے جاتے ہیں۔ یہ چھوٹے سیٹھوں کی طرح گندم، مکئی، باجرے، کپاس کا کاروبار نہیں کرتے بلکہ یہ صرف غریبی کا کاروبار کرتے ہیں اور لوگوں کے دکھ فروخت کرتے ہیں۔"

"لوگوں کے دکھ فروخت کرتے ہیں؟" ربی نے دکھ پر زور دے کر کہا۔

شرفو نے کہا" جب تک یہ لوگوں کے دکھ اور لوگوں کی غریبی نہ بیچیں، ان کا کاروبار آگے نہیں بڑھتا اور ان کی نیک نامی میں اضافہ نہیں ہوتا۔ جیسے جیسے ان کی نیک نامی بڑھتی ہے، ویسے ویسے ان کے کاروبار میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ بڑی زبردست تجارت ہے اور ساری دنیا میں اس کا مانگ ہے۔"

"ساری دنیا میں:؟" ربی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہندوستان تو اس سے اربوں روپے زرمبادلہ کے طور پر کماتا ہے۔ وہاں ایسی ایسی فلمیں بنتی ہیں جن میں لوگوں کے رنگارنگ دکھوں کی اور ان کی غریبی کی شدھ کہانیاں ہوتی ہیں۔ ولایت کے سوداگران فلموں کو بڑے مہنگے بھاؤ خریدتے ہیں اور پھر آگے اس سے بھی مہنگے بھاؤ پر فروخت کرتے ہیں۔ لیکن یہ باتیں تیرے سمجھ میں نہیں آئیں گی۔"

"تو تیرا صاحب بھی یہی کام کرتا ہے! " ربی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں۔" شرفو نے سنجیدگی سے کہا" کرتا تو ہے پر اس کا کاروبار اتنا بڑا نہیں ہے۔ بیچتے ہم بھی غریبی ہی ہین، لیکن لاکھ سوا لاکھ

روپے مہینہ سے زیادہ نہیں کماتے۔"

"لاکھ سوا لاکھ!" ربی نے یہ ہندسہ سنا تو تھا لیکن اس کے صحیح پھیلاؤ سے ناواقف تھی۔ کچھ دیر وہ ٹکٹکی باندھے شرفو کے چہرے کو دیکھتی رہی پھر اسے یقین ہونے لگا کہ شرفو کا دماغ ہلا نہیں ہے، اپنی جگہ پر قائم ہے لیکن وہ بدل گیا ہے ____ اندر سے بھی اور باہر سے بھی۔ برا اب بھی نہیں ہے لیکن بدل گیا ہے۔ پھر اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا "اشرف! تمہاری منڈی میں لوگ اپنی اپنی غریبی خود بیچنے آتے ہیں یا آڑھے کے کماتے گاؤں گاؤں جا کر جنس خرید کے لاتے ہیں۔"

شرفو نے ہنس کر کہا "یہ بات بڑی باریک ہے ربی اور تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اس کو دفع ہی کر۔"

"دفع کیسے کر دوں۔" ربی تنک کر بولی "میری ماسی کریمو کی غریبی کی تو اگر آدھی بوری بھی بک جائے تو سارے گاؤں کو بھاگ لگ جائیں ____ ہینڈ پمپ لگ جائے، مسجد پکی ہو جائے، ان کے کوٹھے کی چھت پڑ جائے۔"

"او میرے سوہنے کڑیے!" شرفو نے ایک تعلیم یافتہ نوجوان کی طرح لہک کر کہا "ہم یہ جنس بوریوں میں بھر کر نہیں بیچتے نہ ہی ان جنس کے مالک اسے منڈی میں فروخت کرنے کے لئے لاتے ہیں۔ یہ سارا کاروبار سٹے کا ہے۔ اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ سٹہ کیا ہوتا ہے اور اس میں لینا دینا کس حساب سے چلتا ہے۔ بس تم اتنا جان لو کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، وہ ٹھیک ہے اور میں تم سے جھوٹ نہیں بولتا۔"

ربی نے چڑ کر کہا "مجھے سو بار سمجھ نہ آئے، ہزار بار نہ آئے پر تو مجھے بتا کے جا۔ نہیں تو میں شور مچا دوں گی۔"

شرفو نے ہنس کر کہا "سٹے کے کاروبار میں جنس نہیں بکتی، جنس کا نام بکتا ہے ____ کپاس نہیں ہوتی، کپاس کا نام بکتا ہے کہ اس بھاؤ پر اتنی گانٹھیں لیتے ہو؟ لیتا ہوں۔ کل کی تیس ہزار گانٹھیں اسی بھاؤ پر بیچتے ہو؟ نہیں بیچتا۔ برسوں جو بھاؤ کھلے گا، اس پر لاکھ گانٹھ لو گے؟ دو لاکھ گانٹھ کا سودا کرو، لے لوں گا۔ تو میری پیاری ربی اسی طرح غریبی بھی سٹے کا کاروبار ہے۔ اس میں جنس تو ہوتی ہے، لیکن کوئی اٹھاتا نہیں۔ سیٹھ صرف اس کا نام اٹھاتا ہے اور صرف نام کا کاروبار کرتا ہے۔ سٹے کا کاروبار فون پر ہوتا ہے۔ غریبی کا کاروبار ریڈیو مائیکروفون، ٹی وی کیمرے اور اونچی سٹیج پر ہوتا ہے۔ یہ جنس صرف ذکر اذکار اور بول بچن کے زور پر فروخت ہوئی ہے۔ جس کا ذکر اذکار خوبصورت اور بول بچن سوہنا ہو گا، وہی زیادہ قیمت پائے گا۔ غریبی بیچے گا اور بادشاہ بن جائے گا۔"

ربی کا سارا دماغ چھاؤں ماؤں ہو گیا اور اس کے اندر جنس جوانی کی ساری حدت ٹھنڈی پڑ گئی۔ وہ شیشم کے سوکھے ہوئے ٹھنٹھ کی طرح شرفو کے سامنے بیٹھی تھی اور اس کا سارا رس سوکھ چکا تھا۔ وہ جو ابھی اس نے شور مچانے کی دھمکی دی تھی تو وہ بھی سہم کر اس کی کوکھ سے چمٹ گئی تھی۔ اب اس کے پاس کہنے، سننے اور بولنے کی کوئی بات نہ رہی تھی۔ شرفو بھی ٹھیک کہتا تھا اور گاؤں والے بھی سچے تھے اور دونوں سچوں کے درمیان ٹکراؤ کا اندیشہ بڑھ رہا تھا۔ ربی کے چھوتے سے سر میں بے وقوفی کے گھونسلے سے ایک احمق خیال نے سر نکالا کہ جھوٹ اور سچ کا تو کوئی جھگڑا ہی نہیں ہوتا لیکن جب دو سچ آپس میں ٹکراتے ہیں تو بڑا ایدھ ہوتا ہے اور بڑا جانی نقصان ہو جاتا ہے۔ اس نے بے چارگی سے شرفو کی طرف دیکھا اور ہوا کے جھونکے کی طرح باہر نکل گئی۔

اگلے دن کوئی دس سوا دس بجے شرفو سو کر اٹھا۔ جلدی سے اپنے گھڑی دیکھی۔ چھلانگ مار کر بستر سے ابھرا اور جلدی جلدی پمپ

پہن کر کماد کے کھیت کی طرف بھاگا جہاں ربی نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن جس وقت وہ وہاں پہنچا، اس وقت وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ دو شہری نوجوان بیٹل ڈریس قسم کا لباس پہنے شکار کی تلاش میں وہاں گھوم رہے تھے۔ شرفو نے کماد کے اندر، اردگرد، آس پاس سب جگہ نظر دوڑائی لیکن اسے ربی کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اسے یقین تھا کہ ربی آ کر اور لمبا انتظار کر کے واپس چلی گئی ہے اور اب اس کے دوبارہ آنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ اس نے گاؤں واپس جانے کا ارادہ باندھا تو دور نیائیوں میں اسے گاؤں کے لوگوں کا ایک غول نظر آیا جس کی قیادت چاچا نمبر دار کر رہا تھا۔ شرفو کو نیائیوں سے اوپر کنارے پر کھڑا دیکھ کر ان کے قدم تیز ہو گئے اور وہ جلدی جلدی اس کی طرف بڑھنے لگے۔ شرفو نے ہوا میں بازو لہرا کر ان کا سواگت کیا تو حسنے تیلی نے للکار کر کہا "اب اگر اپنی ماں کا دودھ پیا ہے تو اسی جگہ کھڑے رہنا۔" شرفو کا لہراتا ہوا ہاتھ نیچے گر گیا تو غول میں سے آواز آئی "اوئے ہماری غریبی کی جنس بیچنے والے کتے، اپنا بچاؤ کر سکتا ہے تو کر لے۔ اپنی سنبھال کر سکتا ہے تو کر لے۔ آخری موقع ہے، پھر تیری لوتھ ہی تیرے صاحب کے پاس کراچی جائے گی۔"

اب شرفو کو کچھ سمجھ آئی کہ ان للکاروں جیکاروں کا مخاطب وہی ہے۔ وہ اونچی آواز میں گلا پھاڑ کر پکارا "چاچا چاچا!" اور چاچے نے اتنی ہی اونچی آواز میں اسی طرح پکار کر کہا "بہن کے یارا، اپنی ماں کے دلالا! ابھی پتہ لگ جاتا ہے چاچا تیرے ساتھ کیا کرتا ہے۔"

پھر بلمیں، ٹکولے، تلواریں اور برچھیاں ہوا میں بلند ہوئی اور غول تیزی سے اس کی طرف بھاگا۔ وہ عجیب عجیب طرح کے نعرے مار رہے تھے اور بھاگتے ہوئے گھوڑوں کی طرح دھول اڑا رہے تھے۔ شرفو خوف زدہ ہرنی کی طرح ان کے نرغے کے آگے بھاگنے لگا اور زور زور سے "بچاؤ بچاؤ" کے نعرے مارنے لگا۔ اس کی بلبلاہٹ سے بھرے کرب ناک نعرے سن کر دونوں شکاری مڑے اور انہوں نے بلوائیوں کو نیائیوں سے اوپر چڑھتے دیکھا۔ اس خوف ناک چارج کو دیکھ کر ایک شکاری نے ہوا میں فائر کیا تو کچھ نیزے ہوا میں لہراتے ہوئے ان کے قریب آ کر گرے۔ دونوں شکاری اپنی جیپ کی طرف بھاگے۔ جیب کے اندر شرفو گھس آیا تھا اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔ دونوں شکاری چھلانگیں مار کر اپنی اپنی سیٹوں پر جا بیٹھے۔ جیپ سٹارٹ کی اور ہوا میں فائر کرتے ہوئے ہل چلے کھیت میں جیپ دوڑانے لگے۔ بلوائی اپنی چادریں اور تہمد کھول کر ان کی طرف بھاگے، لیکن ان کے اور جیپ کے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا اور بہت پیچھے رہ گئے۔

بے چارا شرفو پندرہ دن کی چھٹی پر آیا تھا، لیکن دو ہی دن اپنے گاؤں میں گزار کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے واپس کراچی چلا گیا۔

بٹیر باز

بابو لطیف جس روز نوکری سے رہا ہو کر اپنے گھر آیا تو اس نے شام کی ہانڈی خود پکائی اور گرم مسالے میں کچھ مسالے ایسے بھی ڈالے جو صرف عطار کی دوکان سے حاصل کئے جا سکتے تھے۔ آپا شیداں نے جب اپنے شوہر کے ساتھ مل کر اس کا بنایا ہوا جفر تناول فرمایا تو اس کو وہ شام یاد آ گئی جب وہ کوٹھے پر کھڑی اپنے دونوں ہاتھوں سے بالوں کا جوڑا کھول رہی تھی۔ کسی ٹوٹ مرنے نیچے سے اتنے زور کا روڑا پھینکا کہ اس کے منہ میں پکڑی ہوئی ساری پنیں پروانوں کی طرح اڑ گئیں اور اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ آج بابو لطیف کی ہانڈی کھا کر بھی اس کے دونوں ہونٹ سوج گئے تھے اور ران میں چلوں چلوں ہونے لگی تھی۔

بابو لطیف نے کہا " منجی کسنے کا فن اللہ بخشے میرے نانا جی نے سکھایا تھا۔ ایسی کمال کی منجی کستے تھے کہ درمیان میں بان کی ایک موٹی سی لہرا ابھر آتی تھی۔ ہم دسویں جماعت میں اس لہر پر اپنی ران چڑھا کر سوتے تھے۔ بہت ہی اچھی نیند آتی تھی۔"

ریٹائر ہو چکنے کے فوراً بعد، ساری رات گزار کے، بابو لطیف نے اپنے کوارٹر کے لان میں تین ڈنڈ نکالے اور چوتھے پر گوڈا ٹیک گیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو اس کی بیوی باورچی خانے کے دروازے میں کھڑی تھی اور سونے کی چوڑیاں ہٹا کر اپنی بانہہ کھجا رہی تھی۔ بابو لطیف نے لان سے پکار کر کہا " یہ انگریزی کے ڈنڈ نکالنے کا طریقہ ہے۔ تین مرتبہ وہ سیدھے ڈنڈ نکالتے ہیں اور چوتھے میں گوڈا لگا کر اٹھتے ہیں، ہمارے قصبے کے پادری صاحب اسی طرح ورزش کیا کرتے تھے۔ یہ جسم سڈول رکھنے کا سب سے اعلیٰ طریقہ ہے۔" جتنی دیر میں آپا رشیدان نے اپنی دونوں باہیں کھجا کر لال سرخ کر لیں، اتنی دیر میں بابو لطیف اپنی ورزش ختم کر کے آ گئے۔

اپنی ریٹائرمنٹ کے ایک ہفتہ بعد بابو لطیف نے مسجد میں جا کر نماز پڑھنی شروع کر دی اور پرانے نمازیوں کو یہ سمجھانے لگا کہ نماز دراصل ایک ڈسپلن ہے اور ڈسپلن سے ہی سارا کاروبار چلتا ہے۔ جس دفتر میں ڈسپلن نہ ہو، اس میں رشوت اور سفارش عام ہو جاتی ہے اور لوگوں کے کام بند ہو جاتے ہیں۔ نوکری کے زمانے میں آدمی باقاعدگی سے نماز تو نہیں پڑھ سکتا البتہ اگر وہ ڈسپلن پر قائم رہے تو ایک طرح سے اس کی نماز ادا ہوتی رہتی ہے۔

جب بابو لطیف کی ریٹائرمنٹ کو پورا ایک مہینہ گزر گیا اور پہلی کو اسے تنخواہ نہ ملی تو وہ گھبرا کر اپنے گھر کے کمروں میں گھومنے لگا۔ پہلے اس نے کلاک اتار کر اس کو اچھی طرح سے صاف کیا، پھر ہلتی ہوئی میز کے پائے تلے باہر سے لا کر ایک ٹھیکرے رکھی، شیشے کے سارے

گلاس دھو کر انہیں سفید تولئے سے خشک کیا، ایک اگربتی سلگا کر بڑے کمرے میں رکھی اور باہر سے اپنی نیم پلیٹ اتار کر اندر لے آئے۔ قیمہ پیسنے کی مشین کئی سال سے جم کر یک جان ہوگئی تھی، بابولطیف نے اس کے بڑے سوراخ میں سرسوں کا تیل ڈال کر اسے رواں کرنے کی کوشش کی تو اس کے دونوں گھٹنے چھل گئے۔ مشین ایک طرف رکھ کر اس نے دونوں گھٹنوں پر برنول لگایا اور پنکھا تیز کر کے اپنی دھوتی میں ہوا بھرنے لگا۔

دوسرے مہینے کی پہلی تاریخ کو اس نے بنک جا کر پوچھا تو ابھی اس کی پنشن کی رقم کھاتے میں جمع نہیں ہوئی تھی۔ بابولطیف نے ایک گالی بنک کو، دو اے جی آفس کو اور تین گالیاں بابو خیر دین کو دیں۔ پھر اس نے اپنے حساب سے پانچ سو کی رقم نکلوائی اور سیدھا یوٹیلٹی سٹور چلا گیا۔

شام کو اخبار پڑھتے ہوئے اس نے رشیداں سے کہا کہ اگر ہمارے بھی بچے ہوتے تو اس وقت جوان ہو چکے ہوتے۔ ایک آدھ کی شادی ہو چکی ہوتی، دو تین ابھی کالج میں پڑھ رہے ہوتے، کسی کو نوکری بھی مل گئی ہوتی۔ رشیداں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور پیڑھی پر بیٹھ کر اپنے ناخن کاٹتی اور ان پر ریتی مارتی رہی، پھر اس نے نیل پالش کی شیشی کھولی اور اپنے ناخن رنگنے لگی۔ رشیداں، بابولطیف سے کوئی پندرہ سال چھوٹی تھی اور بچہ نہ ہونے کی وجہ سے ابھی تک پوری جوان تھی۔ اس کے بال لمبے اور قد ذرا سا چھوٹا تھا لیکن میلا دکی محفلوں میں جب وہ کھڑی ہو کر سلام پڑھتی تو دراز قد بیگمات اس سے چھوٹی نظر آنے لگتیں۔ اس کی آواز کھلی اور دہانہ تنگ، کندھے بھرے بھرے اور جسم کی خوشبو خوشگوار تھی۔ اس نے نیل پالش کا برش روک کر بڑی دیر کے بعد پوچھا "ابھی تم کیا کہہ رہے تھے لطیف؟"

" کچھ نہیں" لطیف نے اخبار ایک طرف کر کے اس کی طرف دیکھا

"ابھی تم ہمارے بچوں کی بابت کچھ کہہ رہے تھے؟"

"اچھا وہ! وہ تو ایسے ہی میرا خیال تھا۔"

"ایسے خیال دل میں نہ لایا کرو، یہ اللہ کی حکمت ہے۔"

"اللہ کی حکمت تو ہے لیکن ایسے خیال خود بخود دماغ میں آجاتے ہیں۔"

" کوئی بات نہیں ______ اولاد ہوتی تو شاید ہمیں پریشان کرتی، دکھ دیتی، بدنام کرتی۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے، لیکن اولاد کا ایک سہارا بھی ہوتا ہے۔"

"سہارا بھی ہوتا ہے اور دل بھارا بھی ہوتا ہے۔ ہم ایسے ہی ٹھیک ہیں، اللہ نے ہمیں اور سب کچھ جو دے رکھا ہے۔"

تھوڑی دیر بابولطیف خموش رہا، پھر کہنے لگا:

"دراصل میرے مادے میں جرثومے نہیں ہیں۔"

"یہ تو تم پہلے بھی کئی مرتبہ بتا چکے ہو۔"

"میں نے پچھلے سال پھر ٹسٹ کروایا تھا تو ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ویسے تو تمہاری صحت بالکل ٹھیک ہے لیکن تمہارے مادے میں جر

ثومے نہیں ہیں، اس لئے تمہارے ہاں اولاد نہیں ہو سکتی۔"

"ٹھنڈی بھی تو لگ جاتی ہے۔" رشیداں نے سیانوں کی طرح جواب دیا۔

"ٹھنڈک لگ جاتی ہے!"

"جرثومے بالکل ننگے ہوں تو ان کو؛ لٹھنڈی بھی تو لگ سکتی ہے اور ٹھنڈ سے فٹ نمونیہ ہو جاتا ہے۔" رشیداں کا خیال تھا کہ جرثومہ اس جراثیم کو کہتے ہیں جس نے جرسی پہنی ہوئی ہو اور جس کے کالر ہر وقت اوپر کو اٹھے رہتے ہوں۔" گرمیوں میں تو خیر ٹھیک ہے لیکن سردیوں میں ہو کس طرح سے زندہ رہ سکتے ہیں۔"

لطیف نے کہا" یہ بات نہیں رشیداں، دراصل مجھے نویں جماعت میں دھانس پڑنے لگی تھی، اس سے سارے جرثومے مر گئے۔ اور پھر کلاس میں ہی نہیں تھا کہ نیل سنگھ کو بھی دھانس پڑنے لگی تھی اور وہ بھی کمزور ہو گیا تھا۔"

"لیکن تم تو خدا کے فضل سے بالکل ٹھیک ٹھاک ہو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، صحت تو اچھی ہے خدا کے فضل سے لیکن اندر ٹھیک نہیں۔"

"یہ ساری باتیں حکیموں ڈاکٹروں کی بنائی ہوتی ہیں لطیف، حق صداقت صرف اللہ کو معلوم ہے۔"

لطیف پھر اخبار پڑھنے لگا اور اخبار پڑھتے پڑھتے اس نے سوچا کہ ریٹائر ہونے کے بعد بڑے لوگ باغبانی کا شغل اختیار کیا کرتے ہیں، کیوں نہ میں بھی اپنے کوارٹر کے گراسی پلاٹ میں کھیتی باڑی شروع کر دوں اور سبزیاں اگانے لگوں۔

اس نے اپنی یہ تجویز رشیداں کے سامنے پیش کی تو اس نے مسکرا کر کہا" دفعہ کریں۔ آٹھ آنے کی سبزی سے تو ہم دونوں کے دونوں وقت نکل جاتے ہیں، ہم نے کیا کرنی ہے کھیتی باڑی۔"

لطیف نے کہا" مجھ سے یہ اخبار پڑھا نہیں جاتا، بہت ہی مشکل کام ہے۔"

"تو نہ پڑھا کریں۔"

"لیکن ریٹائر ہونے کے بعد اخبار پڑھنا بہت ہی ضروری ہے۔ سارے شرفا اسی طرح کرتے ہیں۔"

"تو ہم نے کسی کی ریس کرنی ہے بھلا۔"

"دراصل مجھے اخبار پڑھنے کا محاورہ نہیں رشیداں، خبر گم ہو جاتی ہے۔ آخری صفحے پر تو پھر بھی بقیہ مل جاتا ہے لیکن پانچویں اور ساتویں صفحے پر کچھ نہیں ملتا۔ پھر میری عینک کا نمبر بھی تبدیل ہو گیا ہے، ساری سطریں ایک دوسری پر چڑھ جاتی ہیں۔"

"میں تو کہتی ہوں اب آپ عینک لگایا ہی نہ کریں۔ دور کی نظر تو مجھ سے بھی اچھی ہے ماشاءاللہ، کیا ضرورت ہے عینک کی۔"

ریٹائرمنٹ کے پورے پانچ مہینے گزرنے کے بعد بابو لطیف پر یہ عقدہ کھلا کہ اس نے اپنی ساری زندگی نوکری میں برباد کر دی اور سوائے فائیلوں پر غور کرنے اور ان پر اعلیٰ درجے کی ڈرافٹنگ کرنے کے اور کوئی کام ہی نہیں سیکھا جو اس کو بعد میں کام آ سکتا اور اس کی زندگی آسان بنا سکتا۔ سیاست سے اس کو دلچسپی نہیں تھی، مسائل کے بارے میں اس کا علم بہت ہی محدود تھا، افسروں پر نکتہ چینی کرنے کے لئے

اس کے پاس کوئی مواد نہ تھا اور رشتہ داروں سے جھگڑنے کے لئے اس کی کوئی جائیداد نہ تھی۔ دوستوں یاروں سے ملنے کا البتہ وہ بہت شوقین تھا لیکن ان کی محفلوں میں وہ صرف یاروں کی باتیں سنتا تھا اور ملنے کا البتہ وہ بہت شوقین تھا لیکن ان کی محفلوں میں وہ صرف یاروں کی باتیں سنتا تھا اور خوش ہوتا تھا، اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا تھا۔ اصل میں بابولطیف ابتدائی زمانے کا انسان تھا جس کا تعلق صرف زندگی سے بندھا تھا۔ زندگی جس طرح سے ہاتھ تھام کر اس کو وقت کے دشت وصحرا میں گزار رہی تھی، وہ مزے سے گزرتا جاتا تھا۔ اس کی اپنی کوئی تجویز نہیں تھی، اپنا کوئی زائچہ نہیں تھا، کوئی رائے یا کوئی نظریہ نہیں تھا۔ جس طرح بابا آدم کی چوتھی پیڑھی کے لوگ زن دگی بسر کرتے تھے، ایسا ہی انداز بابولطیف کا تھا۔ اس کی عقل اور اس کا علم صرف فائل لنک محدود تھا۔ فائل سے نظریں اٹھانے کے بعد وہ کائنات کے حوالے ہوجاتا اور جس طرح سورج، چاند، ستارے عقل کے بغیر زندگی گزار رہے تھے اور کافی لمبی عمریں پار رہے تھے اسی طرح وہ بھی عمر کی طے شدہ طوالت کی طرف بڑھ رہا تھا۔

رشیداں کے ساتھ بابولطیف کا ساتھ بڑا پکا تھا۔ اصولی طور پر تو آپا رشیداں کو ایک بےزار، مضمحل اور فرسٹریٹڈ ہونا عورت چاہیے تھا لیکن وہ ایک ایسی محبت کرنی والی بیوی تھی جس میں ماتا کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ وہ بابولطیف کے چہرے پر ذرا کی بے اطمینانی دیکھ کر سخت بے چین ہوجاتی تھی اور اس کے اردگرد ایک نرس کی طرح گھومنے لگتی۔ بابولطیف کبھی سال میں ایک دومرتبہ بےلطف ہوتا تھا، جب باس کو اس کی ڈرافٹنگ پسند نہ آتی یا صاحب زبانی فیصلہ دینے کے بعد صاف مکر جاتا کہ جو کچھ تم نے لکھا ہے یہ تو میں نے کبھی کہا ہی نہیں تھا۔ لیکن بےلطفی کی یہ کیفیت زیادہ دیر تک نہ رہتی۔ رشیداں کی مادرانہ شفقت اسے اپنے آغوش میں لے کر اوپر اللہ لوری کی چادر ڈال دیتی۔ بابولطیف اتنے سال رشیداں کی چادر اور چادر اور چادیواری میں پلا تھا اور اب ریٹائر ہوکر گھر آگیا تھا جہاں روٹی ہانڈی کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں ہوتا تھا۔

ایک شام مغرب کے بعد جب چند نمازیوں نے سیاست پر اور ملکی اور غیر ملکی حالات پر شدت سے بحث کی تو بابولطیف کو احساس ہوا کہ وہ وقت کے دھارے میں بہت پیچھے رہ گیا ہے اور اب اس کے پاس سوائے لوگوں کے منہ دیکھنے کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ ندامت کے اس احساس کے ساتھ اس کے اندر کا شخص چادر اور چاردیواری کی حدیں توڑ کر باہر نکلا اور بابولطیف اپنے تشخص کی تلاش میں سیدھا مارکیٹ پہنچ گیا۔

یوٹیلیٹی سٹور کا کاؤنٹر کلرک اپنی مشین پر جھکا چاقو کی نوک سے ایک چھوٹا سا پیچ کس رہا تھا۔ لطیف نے دونوں ہاتھ کاؤنٹر پر رکھ کر پوچھا "آپ کے پاس کچھ اچھے اچھے نظریات ہوں گے؟"

کلرک نے سر اٹھائے بغیر کہا "ہمارے پاس صرف سرکاری نظریات ہیں اور کافی اچھی حالت میں ہیں۔ اگر آپ وہ لینا چاہیں تو کٹ پرائس پر سے سکتے ہیں۔"

لطیف نے قیمت پوچھی تو ذرا گھبرا سا گیا۔ ہکلا کر بولا "مجھے تو فی الحال تین چار چاہیئں۔ ضرورت پڑی تو پھر لے لوں گا۔" کاؤنٹر کلرک نے کہا "ہمارے پاس صرف کٹنگ سائز پیکنگ میں دستیاب ہیں۔ حکم ہو تو نکال لاؤں، پچھلے گودام سے نکالنے پڑیں گے۔"

لطیف نے ڈرتے ڈرتے پوچھا" سمال سائز پیکنگ میں نہیں مل سکتے ؟"

کلرک نے مسکرا کر کہا" سرکاری نظریات ہمیشہ کنگ سائز پیکنگ میں ہی ہوتے ہیں۔ بادشاہی پیکنگ میں ہی آئیں گے ناں۔"

لطیف بھی اس کے ساتھ مل کر مسکرایا، لیکن اسے سمجھ نہ آسکی کہ کلرک مسکرا کیوں رہا تھا۔ چلنے لگا تو کلرک نے ازارہ کہا:

" اگر آپ کو مضبوط، پائیدار اور ہنڈن سار نظریات کی ضرورت ہو تو انہیں جنک شاپ پر تلاش کریں۔" پھر اس نے لطیف کے سپاٹ پر تلاش کریں۔" پھر اس نے لطیف کے سپاٹ چہرے کو غور سے دیکھ کر کہا" ایسی دکانوں پر تلاش کریں جو ولائیتیوں کے گھروں کا اور سفارت خانوں کی نیلامیوں کا سامان فروخت کرتی ہیں۔"

" لیکن وہاں تو سیکنڈ ہینڈ مال ہوگا۔" لطیف نے فکرمندی سے کہا۔

" کوئی ضروری نہیں کہ سیکنڈ مال ہی ہو۔" کلرک ناک کھجلا کر بولا" بڑی بڑی اعلیٰ درجے کی نئی نکور اور اوریجنل پیکنگ کی چیزیں بھی مل جاتی ہیں۔"

لطیف شکریہ ادا کر کے چلنے لگا تو کلرک نے پھر کہا" زیادہ قیمت نہ دیجئے گا، یہ بڑے سستے سودے ہیں۔ اچھے سے اچھے نظریات کی جوڑی سوسوا سو میں مل جائے گی۔"

" جوڑی!" لطیف نے حیرانی سے پوچھا تو کلرک نے کہا" ہم دوکاندار لوگ اسے جوڑی ہی کہتے ہیں گو یہ جوڑی ہوتی نہیں۔ جس طرح تالے کے ساتھ چابی، بوٹ کے ساتھ تسمے اور پین کے ساتھ اس کی ٹوپی ہوتی ہے اسی طرح نظریات ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک واپسی کی سلپ جیسی بھی ہوتی ہے، جیسے ہوائی جہاز میں ہنگامی حالات کے لئے ایک پھسلنے والی گیس موجود ہوتی ہے۔"

لطیف پھر باہر نکلنے لگا تو کلرک نے ہمدردی سے پوچھا" آپ نے پہلے کبھی نہیں لئے نظریات؟"

لطیف نے نفی میں سر ہلایا تو کلرک کو یقین نہ آیا۔ اس نے معذرت بھرے لہجے میں کہا

" آپ کی عمر تو کافی ہوگی ماشاءاللہ، اب تک آپ نے کوئی اعتقاد ہی نہیں اپنایا؟"

" کیوں نہیں۔" لطیف نے زور دے کر کہا" اعتقاد تو میرا اپنے مذہب پر پکا ہے لیکن میں نے کبھی کوئی نظریہ استعمال نہیں کیا۔"

تو پھر آپ ایسے کریں کہ ابتدا میں ان پر کوئی رقم خرچ نہ کریں، کسی سفارت خانے سے مفت لے لیں۔"

" مفت!" لطیف کی باچھیں کھل گئیں۔

کلرک نے کہا" ابتدائی پریکٹس کے لئے مفتاً مفت کام چلانا زیادہ مفید ہوتا ہے۔ میں تو اب تک گھر بھر کے لئے وہیں سے نظریات لے آتا ہوں۔ میری بیٹی ایم بی بی ایس کے تیسرے سال میں ہے، وہ انہیں بڑی ترتیب سے اور بڑے سلیقے سے سنبھال کر رکھتی ہے۔"

لطیف نے کلرک کی بات سن تو لی لیکن اس پر عمل نہیں کیا۔ سیدھا ان دکانوں پر پہنچ گیا جہاں نیا اور پرانا غیر ملکی سامان ملتا تھا۔ پرانا مال باہر برآمدے میں رکھا تھا اور نیا مال اندر شیشے کی الماریوں میں سجا ہوا تھا۔ سارا مال نیلامی کا نہیں تھا، اس میں سے کافی چیزیں کو مسری سے چرائی ہوئی بھی تھیں۔ جس دوکان کے باہر پرانے فریج، کپڑے دھونے کی مشین، ساحل کی کرسیاں، بچوں کے چاپر اور قالینوں کے بو

سیدہ رول رکھے تھے اس کے اندر ایک خوبصورت سی عورت اور ایک جوان سالڑکا تھا۔ایک گاہک کپڑے استری کرنے کا فولڈنگ سٹینڈ بغل میں دبا کر باہر نکل رہا تھا اور اس کی بیوی کار کے اندر بیٹھی چاٹ کھا رہی تھی۔

لطیف نے اندر جا کر لڑکے سے پوچھا" آپ کے پاس کچھ نظریات ہوں گے؟"

" کیوں نہیں، کیوں نہیں۔" عورت نے اپنا بازو لہرا کر کہا"ان دونوں الماریوں میں نظریات ہی نظریات ہیں لیکن آپ کو اصل میں کس چیز کی ضرورت ہے؟"لطیف سوچ میں پڑ گیا تو اس عورت نے منجھے ہوئے سیلز مین کی طرح کہا:

" آپ کو افکار چاہیئں،خیال چاہئیں یا صرف نظریات کی ضرورت ہے؟"

لطیف نے کہا" سچی بات یہ ہے میڈم کہ میں اس معاملے میں بالکل اناڑی ہوں اور اس فیلڈ میں میرا کوئی تجربہ نہیں ہے۔آپ جس طرح سے مجھے گائیڈ کریں گی، میں قبول کرلوں گا۔"

عورت نے اسی طرح سے بازو لہرا کر کہا" ڈارلنگ افکار کی وہ گولڈن جوڑی نکالنا۔"

وہ لڑکا جو پہلے اس کا بیٹا نظر آتا تھا، اپنی ڈارلنگ کا حکم سن کر سٹول پر چڑھا اور شیشے کی الماری سے افکار کی ایک جوڑ نکال کر فرش پر کو ش گیا۔عورت نے افکار کی جوڑی ریشمی رومال سے صاف کی اور لطیف کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے بولی" مشکل سے ایک مہینہ بھی استعمال نہیں ہوئی۔وارنٹی سلپ ساتھ لگی ہے اور پرائس ٹیگ بھی نہیں اترا۔ایک ڈاکٹر صاحب نے اپنے بیٹے کے لئے منگوائی تھی لیکن وہ ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔کیسے مرا تھا ڈارلنگ؟"

" موٹر سائیکل کے حادثے میں۔" ڈارلنگ نے جواب دیا۔

" ڈاکٹر صاحب دل برداشتہ ہو کر اس کا سارا سامان فروخت کر گئے۔بڑا ہونہار نوجوان تھا۔"

" اور اس کی قیمت؟" لطیف نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

" ایک سو روپے۔" عورت نے مسکرا کر کہا اور ڈارلنگ سے پوچھنے لگی" اس کا ڈبہ ہے ناں جانی؟"

" بالکل ہے۔" جانی نے کہا" یہ خریں لیں گے تو ڈبہ بھی نکال دوں گا۔"

" ایک سو روپے کچھ زیادہ ہیں میرے حساب سے۔" لطیف نے رک رک کر کہا۔

" زیادہ!" عورت زور سے ہنسی، پھر اس نے جھک کر تالی بجائی، ایک چھوٹا سا مجرا کی اور لپک کر بولی" بظاہر تو زیادہ ہی نظر آتے ہیں لیکن اصل میں بہت کم ہیں۔آپ ان کی آب و تاب دیکھیں، بڑی سیکس اپیل ہے ان میں۔"

سیکس اپیل کا لفظ سن کر لطیف کو فوراً اپنے جوتوے یاد آ گئے اور اس نے جھٹ سے سو روپے کا نوٹ نکال کر عورت کے بڑھے ہو ئے ہاتھ پر رکھ دیا۔

جب وہ چلنے لگا تو ڈارلنگ نے کہا" ہمارے پاس کچھ نظریات بھی آنے والے ہیں۔ان کی بولی بدھ کے روز اٹھارہ تاریخ کو ہو گی ۔ہمارا آدمی گیا ہوا ہے، اگر سودا طے پا گیا تو بائی ائیر واپس آئے گا۔"

"سودا کیوں نہیں طے پائے گا۔" عورت نے سنجیدگی سے کہا" میں نے مسٹر مورس کو فون کر کے کہہ دیا تھا کہ یہ مال ہمارا ہے، اور کوئی نہ لے جانے پائے۔"

"ان کی قیمت کی ہوگی؟" لطیف نے پوچھا تو ڈارلنگ نے کہا" اب یہ تو مال آ جانے پر منحصر ہے۔ دیکھیں کیا قیمت لگی ہے، لیکن کچھ زیادہ نہیں ہوگی_____بس یہی_____کوئی_____ستر_____ای_____روپے کا ایک نظریہ ہوگا۔"

"اور وہ سارے سیکنڈ ہینڈ ہوں گے؟" لطیف نے پوچھا۔

"ہوں گے تو سیکنڈ ہینڈ ہی" نوجوان نے جواب دیا" لیکن زیادہ استعمال شدہ نہیں ہوں گے۔ اصل میں نظریات ہمارے ہاں میو فیکچر نہیں ہوتے، سارے باہر ہی سے امپورٹ ہوتے ہیں۔ نے تو ہم خرید ہی نہیں سکتے اس لئے استعمال شدہ سے ہی کام چلانا پڑتا ہے۔"

لطیف کو اس نوجوان کی یہ بات کافی بری لگی۔ اس نے حوصلہ کر کے کہ " کیوں، ہمارے اپنے نظریات یہاں مینوفیکچر نہیں ہوتے؟ ہمارے اپنے لوگ انہیں کاسٹ نہیں کرتے، اپنے لوگ استعمال نہیں کرتے؟"

" کرتے ہوں گے " عورت نے بے پروائی سے کہا" لیکن مارکیٹ میں ان کی کوئی مانگ نہیں ہے۔ ہمارے اپنے نظریات تو ہاتھ مشینوں کی سویوں جیسے یا الٹی چار پائی پر سکھائی ہوئی بڑیوں جیسے ہوتے ہین۔ ان کا استعمال تو اب اندرون شہر میں نہیں رہا، گاؤں میں کوئی استعمال کرتا ہو تو معلوم نہیں۔"

نوجوان نے کہا" سر یہ ترقی کا اور ٹیکنالوجی کا دور ہے، اس میں دیسی نظریات نہیں چلتے، کچھ لوگوں نے سیالکوٹ، ڈسکے اور گوجرانوالے کے استعمال کئے تھے لیکن ان کی موٹریں ہی بیٹھ گئیں۔ بڑا نقصان ہوا ان کا۔ کچھ تو سنبھل گئے لیکن باقی سارے دیوالی ہو گئے۔"

"لیکن اعتقاد تو دیسی ہی استعمال ہوتے ہیں۔" لطیف نے حوصلہ کر کے کہا۔

نوجوان نے کہا" ہمارے پاس کچھ دیسی اعتقاد پڑے ہیں۔ آپ چاہیں تو انہیں مفت لے جائیں، لیکن یہ آپ کے کام نہیں آئیں گے۔"

"وہ کیوں؟" لطیف نے پوچھا تو عورت نے کہا" گورنمنٹ ان کے استعمال سے منع کرتی ہے۔"

"منع تو خیر نہیں کری" نوجوان جلدی سے بولا" البتہ گورنمنٹ ان کے استعمال کی حمایت نہیں کرتی، ڈس کریج کرتی ہے۔"

لطیف تھوڑی دیر تک کچھ شرمندہ شرمندہ سا وہاں ایسے کھڑا رہا جیسے قصائی کی دکان پر پاؤ بھر گوشت لینے والا چور سا بنا کھڑا ہوتا ہے۔ پھر اس نے پرانے ریڈیو سیٹو، ٹوٹی دوربینوں، جلے ہوئے ٹوسٹروں اور ڈاکٹری کے استعمال شدہ اوزاروں میں سے پیتل کا ایک پلٹو سا اٹھا کر پوچھا "یہ کیا ہے؟"

"یہ ان بھو ہے۔ ایک صاحب انڈیا سے لائے تھے لین اس کے کنڈے ٹوٹ گئے، کنڈے ہم نے اس کے اندر رکھے ہیں۔ قلعی کا ٹنکا لگنے سے پکے مضبوط ہو جائیں گے۔ اگر آپ لینا چاہیں تو بارہ روپے دے دیں۔"

لطیف نے پیتل کا ان بھو ہلایا تو اس کے اندر کنڈے کھڑ کنے لگے۔ اس نے دس روپے کا نوٹ نکلا کر کہا" میں اس سے زیادہ نہیں

دوں گا۔"

عورت نے دس روپے اس کے ہاتھ سے لے کر کہا"اب جوان بھوانڈیا سے آرہے ہیں، وہ اس سے ہلکے ہیں۔ان کی قیمت بھی زیادہ ہے اور دیر تک چلتے بھی نہیں لیکن ہمارے لوگ انہیں شوق سے استعمال کرتے ہیں۔"

لطیف جب دکان سے باہر نکلا تو اس کے ساتھ وہ نوجوان بھی باہر آ گیا۔اس نے لکڑی کی ایک پیٹی کی طرف اشارہ کر کے کہا"اس میں کچھ خیال، کچھ تصور، کچھ اصول اور کافی ساری اضافتیں، سلسلے اور حوالے پڑے ہیں۔آپ چاہیں تو ان میں سے اپنی مرضی کے اچھے چھانٹ سکتے ہیں۔قیمت بھی نہ ہونے کے برابر ہے، چھ روپے کے بارہ! "لطیف اس پیٹی پر جھک کر سامان پھرولنے لگا تو نوجوان نے کہا"ان کی ساخت پر نہ جائیں، اپنی اپنی جگہ پر سارے ہی مفید ہیں اور ہر جگہ فٹ ہو سکتے ہیں۔"

"لیکن کافی پرانے ہیں۔"لطیف نے جھکے جھکے کہا۔

"ناں جی ناں۔"نوجوان نے سر ہلا کر کہا"یہ تو برسات کی وجہ سے زنگیا گئے ہیں۔آپ ذرا سا براسو ڈال کر رگڑیں گے تو گولڈن کلر کے ہو جائیں گے۔ان کا میٹل بڑا زوردار ہے۔"

لطیف نے ڈیڑھ درجن چھوٹے بڑے، نوکدار، کھگریلے اور تیز دھار اضافے اور حوالے خرید لئے اور انہیں ایک بڑے شاپر میں ڈال کر دکان کے برآمدے سے باہر نکل گیا۔رات کے آٹھ بج رہے تھے اور لوڈ شیڈنگ کا زمانہ تھا۔لطیف کے تھیلے میں قیمتی سامان بھرا ہوا تھا اس لیے اس نے بس سے جانے کے بجائے ایک رکشا لیا اور گھر کی طرف چل دیا۔

ٹھیک تین دن بعد عصر کی نماز سے پہلے بابو لطیف نے اپنا دھاری دار سوتی تھیلا کھولا اور اندر سے نقطہ نظر کی بیٹر نکال کر صف پر چھوڑ دی۔اس وقت کل پانچ نمازی مسجد میں جمع تھے اور اذان میں تھوڑی دیر باقی تھی۔مستقیم صاحب نے بٹیر کو ایک نظر دیکھا اور چپ ہو گئے۔ ان کے حساب سے یہ کوئی خاص بٹیر نہ تھی جس پر وہ توجہ دیتے۔حاجی رمضان علی اور ڈاکٹر ارشد صاحب نے اس بٹیر کی بہت تعریف کی اور صف پر انگلی بجا بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔دراز گیسو فقیر منش طالب علم نے وفورِ شوق سے بٹیر اٹھا کر باری باری اپنی دونوں آنکھوں سے لگائی اور پھر اس کی چونچ ہولے سے اپنے ہونٹوں میں دبائی۔بولا"میں کل ایک دن کے لئے انجینئرنگ یونیورسٹی لے جاؤں گا، ہمارے یہاں انتخاب ہو رہے ہیں۔"مستقیم صاحب نے تسبیح پر اپنی انگلیاں روک کر کہا"

بھائی صاحب یہ بٹیر لنگڑی نہیں، ایک طرف سے جھولا مار رہی ہے۔"

بابو لطیف نے بٹیر اٹھا کر واپس تھیلے میں ڈال لی اور اپنی گھڑی دیکھنے لگا۔

رات کے کوئی ساڑھے گیارہ بجے رشیداں نے گہری نیند سے بیدار ہو کر دیکھا کہ لطیف اپنے بستر پر سیدھا بیٹھا ہے اور اس نے دونوں پاؤں نیچے لٹکا رکھے ہیں۔رشیداں کا کلیجہ دھک سے رہ گیا کہ اس نے سن رکھا تھا ریٹائرمنٹ کے بعد اکثر لوگ فوت ہونے سے پہلے اسی طرح چارپائی سے پاؤں لٹکا کر بیٹھتے ہیں اور پھر ان کا ہرٹ فیل ہو جاتا ہے۔اس نے ہولے سے آواز دے کر پوچھا" کیا بات ہے لطیف؟"تو لطیف نے کوئی جواب نہ دیا۔وہ بجلی کی طرح اپنی چارپائی سے اٹھی اور لطیف کے قدموں میں بیٹھ کر منہ اوپر کر کے اس کی طرف

دیکھنے لگی لطیف کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مستقیم صاحب نے اس کی بٹیر کو سب کے سامنے لنگڑی کہہ کر اس کا دل توڑ دیا۔ وہ بھیں بھیں رو نے لگا رشیداں اس کے ساتھ چمٹ گئی۔

پھر اس نے مسجد جانا چھوڑ دیا اور شام کے وقت اپنے نئے اور پرانے دوستوں کی دیام شالا میں جانا شروع کر دیا۔ یہاں شہر کے دوسرے لوگ بھی آتے تھے اور اپنی اپنی نسبتوں اور اضافتوں کے بٹیر لاتے تھے۔ دیر تک پالی جمتی اور نقطہ نظر کے صف شکن بٹیر چونچیں لڑاتے لہولہان ہو کر بے ہوش ہو جاتے۔ بٹیر باز ہلدی چونا، ہرنی جاوتری کے مصالحے چڑھا کر انہیں پھر سے زندہ کرتے اور اگلے دن کا وقت مقرر کر کے اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔ بابو لطیف کے تھیلے میں بھی بہت کچھ ہوتا لیکن وہ اسے باہر نکالتے ہوئے ڈرتا تھا۔ ایک عجیب طرح کا خوف اسے چاروں طرف سے گھیرے رکھتا کیونکہ یہاں کے لوگ بڑے ظالم اور جابر تھے۔ ان کی آنکھیں بڑی بڑی، ہونٹ موٹے موٹے اور منہ بدبودار تھے۔ بدنوں سے ہیک آتی تھی اور ہر وقت اپنے ایک خاص حصہ جسم کو کھجایا کرتے تھے۔

وہ خوبصورت، گیسو دراز اور نمازی لڑکا جو بابو لطیف سے ایک دن کے لئے اس کا سو روپے والا نظریہ لے کر اپنی یونیورسٹی چلا گیا تھا، بڑے ہسپتال کے سپیشل کیئر وارڈ میں پڑا تھا اور اس کے جسم پر گولیوں کے پانچ نشان تھے۔ اس کے گھر پر ہر وقت آیت کریمہ کا ورد ہوتا رہتا تھا اور اس کے والد ٹیلکس پر بیٹھے ولایت کے ڈاکٹروں سے مشورے طلب کیا کرتے تھے ______ پتہ نہیں جلدی میں اس لڑکے نے بابو لطیف کا خوبصورت نظریہ کہاں پھینک دیا تھا اور اب وہ کن لوگ لوگوں کی تحویل میں تھا لیکن وہ تھا اپنی اصیل حالت میں۔ اس پر نہ تو گولیوں کے کوئی نشان تھے اور نہ ہی ہاتھا پائی میں اس کی ہیئت تبدیل ہوئی تھی۔ اس وقت بابو لطیف کو اس نظریے کو اپنے سینے سے لگا رکھا تھا اور کئی گز تک گھسٹنے کے باوجود اس پر خراش تک نہیں آنے دی تھی۔

جس شام بابو لطیف پہلی مرتبہ حلقے کی میٹنگ میں گیا تو اپنے ساتھ چھ روپے درجن والی ساری اضافتیں، نسبتیں اور افکار خاکی کاغذ کے ایک دبیز تھیلے میں ڈال کر لے گیا۔ مقالے کے خاتمے پر بڑی عمر کے ایک دبلے پتلے شخص نے جیب سے پلاسٹک کا یک خیال نکال کر سامنے میز پر رکھ دیا اور سگریٹ کے کش لگانے لگا۔ حاضرین نے اس گیجٹ کو غور سے دیکھا تو سامنے بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے اپنی چر لبی تھیلے سے ٹین کا ایک کرنگو نکالا اور اس میں چابی بھر کر میز پر چھوڑ دیا۔ کرنگو تیزی سے پلاسٹک کے گیجٹ پر جھپٹا اور اس میں چابی بھر کر میز پر چھوڑ دیا۔ کرنگو تیزی سے پلاسٹک کے گیجٹ پر جھپٹا اور اس سے گتھم گتھا ہو گیا۔ ایک لڑکی نے پرس سے اپنی لپ سٹک نکال کر ہلکے ہلکے ہونٹوں سے چھوائی اور پھر اسے بند کئے بغیر ہتھیلی پر رکھ کر زور سے پھونک ماری۔ لپ سٹک نے راکٹ کی طرح میز کے اوپر کوپ لیا اور ژوں ژوں کر کے چکر کاٹنے لگی۔ جب اس کی تیزی نے اسے حاضرین کی نظروں سے اوجھل کر دیا تو اس نے ڈائیو مار کر گتھم گتھا جوڑے پر پیٹریاٹ میزائل جیسا ایک زوردار حملہ کیا۔ جھک سے ایک شعلہ اٹھا اور آن واحد میں میز پر چٹکی بھر خاکستر باقی رہ گئی۔ حاضرین نے تالیاں بجا کر اس حملے کا سواگت کیا لیکن کچھ لوگوں نے تالیاں نہیں بھی بجائیں بلکہ وہ جگ میں کب کا پڑا ہوا پانی جواب بالکل گرم ہو گیا تھا، گلاسوں میں ڈال کر پینے لگے اور لڑکی کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ اس دبلے پتلے بڑی عمر کے آدمی نے اپنی جیب سے پلاسٹک کی ایک اور آرگیومنٹ نکالی اور اسے خاکستر پر رکھ کر سگریٹ پینے لگا۔ یہ آرگیومنٹ کافی پرانی تھی اور جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ اسے ایرل ڈائٹ لگا کر بڑی

محنت سے جوڑا گیا تھا اور اس کے اردگرد سکاچ ٹیپ کی پٹی چپکی ہوئی تھی۔ بابو لطیف نے حوصلہ کر کے اپنے تھیلے سے پیتل کا "ان بھو" نکالا او عرا سے میز کے کنارے پر رکھ دی۔ عینک والے ایک صاحب نے سٹین لیس سٹیل کا ایک کند استرا جس کا دستہ بانس کی کھپچی سے بنا تھا، آگے کھسکا دیا۔ سانولے رنگ اور تیکھے نقوش والی لڑکی نے اپنی چادر سے صندل کی لکڑی کا ایک برہنہ سپاہی نکال کر میدان مین کھڑا کر دیا۔ اس سپاہی کے سر پر لوہے کا ایک خود تھا اور چہرے پر کھلی ہوئی مسکراہٹ تھی۔ لپ سٹک والی لڑکی نے ایک مرتبہ پھر لپ سٹک نکالی اور اپنے ہونٹو ں سے چھوا کر بند کر کے واپس تھیلے میں رکھ لی۔ بڑی دیر تک سارے اپنے اپنے سانس کے خانوں میں چالیں چلتے رہے اور قدم قدم آگے بڑھتے رہے لیکن شہ کوئی بھی نہ دے سکا۔ صاحب صدر نے سیٹی بجا کر کھیل ختم کرنے کا اعلان کیا اور کھلاڑیوں نے اپنے اپنے صیغے اٹھا کر حفاظت سے سنبھال لئے۔

اس روز جب بابو لطیف چھوٹی پیلی ٹیکسی لے کر گھر پہنچا تو خوشی اس کا پاؤں زمین پر نہ پڑتا تھا۔ اس نے رشیداں کو دونوں کندھون سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور ناچتے ہوئے بتایا کہ اس کے پیتل کے ان بھو نے میدان میں اترتے ہی سارے افکار کی طبعیت صاف کر کے رکھ دی اور کوئی اس کے آگے بول نہیں سکا۔ "وزنی چیز پھر وزنی ہوتی ہے۔" لطیف نے لہرا کر کہا اور رشیداں کو چھی ڈال کر کھڑا ہو گا۔ رشیداں نے کہا" کوٹ ٹائی تو اتار دیجئے پہلے ہی بہت گرمی ہے۔ میں آپ کے لئے کھانا لگاتی ہوں۔"

" ضرور ضرور۔" لطیف نے کوٹ اتارتے ہوئے کہا" جب کسی کا نظریہ قبولیت کے دارئے میں آ جاتا ہے تو وہ بہت بھوکا ہو جاتا ہے۔ مجھے بھی اس وقت اتنی بھوک لگی ہے کہ میں کھڑے کھڑے تم کو کھا سکتا ہوں۔ جلدی کر و اور کھانا لگاؤ۔ میرے ٹائی اتارتے تک کھانا لگ جانا چاہیے۔

رشیداں اپنے ریٹائرڈ خاوند کی یہ بات سن کر مسکراتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔

زندگی کے اتنے سال جو بابو لطیف نے بڑی شرافت اور عاجزی کے ساتھ لطف میں گزارے تھے، اب وہ اس کے سینے کا بوس بن کر ہر وقت اسے شرمندہ کرتے رہتے تھے۔ اپنی زندگی کے ان مدقوق اور پژمردہ سالوں کی مکافات وہ اس طرح سے کر سکتا تھا کہ موچی دروازے میں ایک جلسہ کرے۔ سو فٹ لمبی، چالیس فٹ چوڑی اور دس فٹ اونچی سٹیج بنائے اور وہاں سے مجمع کو خطاب کرے۔ اپنے سارے نظریات، اعتقادات اور افکار کی نمائش کرے اور اپنے خیالات پر فلڈ لائٹس ڈال کر چکا چوند کر دے۔ لوگ ترنگ میں آ کر بھنگڑا ڈالنا شروع کر دیں، اس پر سلوگن لہرائیں اور اس کی مہما گائیں۔ اس مختصر سی دنیا میں صرف بابو لطیف ہو اور اس کے نظریات ہوں، اس کے اصول ہوں اور اس کا نصب العین ہو۔ رات کے وقت بی بی سی اس پر تبصرہ کرے اور اپنے نامہ نگار کے حوالے سے مجمع کی تعداد بتائے۔

دن کے وقت وہ اپنے نظریات، خیالات، افکار اور حوالے پٹرول سے اور براسو سے چمکاتا رہتا اور جن کو پچھلے روز مٹی کے تیل مین ڈبویا تھا، ان پر ڈبل زیرو کا ریگ مال مار کر زنگ چھڑاتا رہتا۔ جن نظریوں کے کنڈے ٹوٹ گئے تھے، انہیں ویلڈ کرانے لے جاتا اور جن اضافتوں کی پٹیاں کثرت استعمال سے پھٹ گئی تھیں، ان پر رشیداں سے پکے دھاگے کے ساتھ رفو کرایا کرتا۔ پرانی ہکوں کی جگہ نئی ہکیں لگانے کے لئے اس نے ایک موچی سے ٹھیکہ کر رکھا تھا جو ایک روپے میں دو ہکیں لگا کر ان پر برش بھی مار دیتا تھا۔ شام کے وقت وہ مارکیٹ کا

پھیرا لگا تا اور کباڑیوں سے تصور، مزید نسبتیں اور فہمیدیں خرید لاتا۔ اب اس کے دل میں ایک ہی حسرت باقی رہ گئی تھی کہ کاش اس نے پانچ سال پہلے ریٹائرمنٹ لے لی ہوتی۔

شام کو جب پالی جمتی اور نظریات آپس میں گتھم گتھا ہوتے تو ان کے مالک پنجوں کے بل ہو کر انہیں للکارنے اور شِشکارنے لگتے۔ اس ہما ہمی اور بدابدی میں ایک دوسرے کو دھکیلنا پیلنا بھی پڑتا، کچھ رکاوٹیں بھی پیدا کی جاتیں، کچھ دھکے بھی پڑ جاتے، آپس میں بول بلارا بھی ہو جاتا لیکن لطیف صاحب ان چیزوں کے عادی ہو چکے تھے بلکہ ان کو اس کا چسکا لگ گیا تھا۔ اب کپڑے پھڑوا لینا اور گھڑی کا کلائی سے کھل کر زمین پر جا گرنا، دیوار سے ٹکرا جانا یا دھکا کھا کر فرشپر گر جانا ایک عام سی بات تھی۔ سارے کھیلوں مین اسی طرح سے ہوتا ہے۔ تیز گیند کا کیچ لیتے ہوئے کھلاڑی زمین پر کئی لڑھکنیاں کھا جاتا ہے۔ خراشیں آ جاتی ہیں۔ کپڑے پھٹ جاتے ہیں، خون نکل آتا ہے۔ ایسا تو کھیل مین ہوتا ہی ہے۔ جس روز بابو لطیف پٹ پٹا کر، کپڑے پھڑوا کر، خون تھوکتا گھر واپس آیا تو رشیداں رونے لگی۔ بابو لطیف نے ہنس کر کہا "بھئیا یسا تو کھیل مین ہو ہی جاتا ہے، یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں البتہ اپنے مہرے کو اپنی نظروں کے سامنے پٹوا دینا اور شکست کھا جانا اور دوسرے کی بات مان جانا موت کا مقام ہے۔"

موت کا لفظ سن کر رشیداں نے اپنے ریٹائرڈ خاوند کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

یہ سردیوں کی ایک طویل اور تاریک رات کا ذکر ہے جب رشیداں کو یوں لگا جیسے کوئی پانی میں ڈوب رہا ہے اور بلبلوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ لطیف کو آواز دی لیکن کوئی جواب نہ پا کر اپنی چارپائی سے کود کر بتی جلا دی۔ لطیف اپنے پلنگ پر ٹنگیں لٹکائے بیٹھا تھا اور بچوں کی طرح سسکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ رشیداں نے اسے اپنے ساتھ چمٹا کر اس کا ماتھا چھوا تو وہ بالکل ٹھنڈا تھا۔ نبض چل رہی تھی لیکن ہر چار دھڑکنوں کے بعد ایک دھڑکن چھوڑ جاتی تھی۔ دل کی رفتار کافی تیز تھی لیکن سسکیوں کی رفتار اس سے بھی تیز تھی۔

" کیا ہوا، کیا ہوا لطیف؟" اس نے لطیف کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے پوچھا تو وہ اور زور سے رونے لگا۔

بڑی دیر تک رشیداں اسے ساتھ لگائے تھپکتی رہی اور اسے بہاتی رہی لیکن جتنا وہ اسے تھپکتی، اسی قدر شدت سے وہ کانپنے اور لرزنے لگتا۔ پھر وہ بالکل ساکت ہو گئی اور اس نے لطیف سے اپنی ساری توجہ ہٹا لی۔ کوئی بیس پچیس منٹ تک کمرے میں خاموشی کا عالم رہا۔ پھر لطیف نے اس کی طرف منہ پھیر کر کہا " آج بھری محفل میں میری بڑی بے عزتی ہوئی۔" رشیداں نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اسی طرح بیٹھی رہی۔

لطیف کہنے لگا" آج جب میں نے کلاسیکل نظریہ نکال کر محفل کے سامنے پیش کیا تو حاضرین مجلس بغلیں جھانکنے لگے اور سب کو سانپ سونگھ گیا۔ قادر میر کے ساتھ ایک گٹھوں سالڑکا آیا تھا۔ گندی شکل، گندے دانت، آنکھوں پر ٹوٹی ہوئی عینک، ہاتھ میں کڑا۔ میرا ے نظریے کو دیکھ کر کہنے لگا، یہ آپ نے کہاں سے لیا تھا صاحب؟ سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے کہا، تم کو اس سے کیا۔ ہمت ہے تو اس کا مقابلہ کر کے دکھاؤ۔ وہ ہنسنے لگا اور بڑی دیر تک ہنستا رہا۔ کچھ لوگ اس کی بدتمیزی پر دل تنگ بھی ہوئے لیکن بہت سارے اس کی ہنسی میں شریک بھی ہو گئے، حالانکہ کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کیوں ہنس رہا ہے۔ میں نے قہر آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرانے

لگا ـــــ یہ آپ نے رکنے کباڑیئے سے لیا ہوگا، رکن الدین اولڈ شاپ سے ـــــ سب مڑ کر میری طرف دیکھنے لگے۔ پھر اس نے اپنا کڑا اوپر اٹھاتے ہوئے کہا، یہ میرا نقطہ نظر تھا اور میں نے ہی اسے پانچ روپے کے عوض رکنے کباڑیئے کے پاس گروی رکھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں اسے چھڑا لوں گا لیکن میں نے نہیں چھڑایا۔ اس میں اب کوئی جان باقی نہیں رہی تھی، نہ ہی یہ آگے چلنے کے قابل تھا۔ آپ نے کتنے میں خریدا؟"

لطیف کی آنکھوں پھر آنسو تیرنے لگے اور اس نے بھ مار کر کہا" وہ ٹھیک کہتا تھا۔ میں نے اسے رکنے کباڑیئے کی دکان ہی سے اسی روپے میں خریدا تھا اور اس کو سب کی نظروں سے چھپا کر عینک کے ایک خالی کیس میں محفوظ کیا ہوا تھا۔ جب لوگ مسکرانے لگے تو اس نے اونچی آواز میں کہا، اس کے ساتھ اعداد و شمار کی تین جھالریں بھی تھیں وہ کیا ہوئیں ـــــ وہ ٹھیک کہتا تھا، اس کے ساتھ اعداد و شمار کی تین جھالریں بھی تھیں اور انفرمیشن کے ساتھ چھلے بھی تھے۔ میں نے ان جھالروں کو الگ الگ کر کے مختلف اصولوں اور نصب العینوں کے ساتھ ٹانک لیا تھا۔ پھر اس بد بخت نے قادر میر کے کان میں کہنا اس کا محض ایک بہانہ تھا۔ اس کی آواز اتنی اونچی تھی کہ ساری محفل نے سنی اور سبھی مسکرانے لگے" ـــــ لطیف نے ذرا رک کر کہا" میری بڑ بے عزتی ہوئی ہے اور میں اب زندہ رہنا نہیں چاہتا۔"

"حد کرتے ہو۔" رشیداں نے دوپٹے سے اس کا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا" یہ بھی کوئی مرنے کی بات ہے۔"

"اس سے بھی زیادہ رشیداں۔ اب اس زندگی میں اور کچھ رہ ہی نہیں گیا۔ لیکن تم فکر نہ کرنا، نئے رولز کے مطابق تم کو پوری پنشن ملتی رہے گی۔"

رشیداں نے اس کے پہلو میں ہلکی سی ایک گدگدی کی اور اسے پلنگ پر چت لٹا کر اس کے ساتھ لیٹ گئی۔

جس شام بابو لطیف کے قل تھے، اس روز صبح سویرے رشیداں لطیف کے سارے نظریے، اصول، افکار اور سلسلے حوالے ایک تھیلے میں ڈال کر مارکیٹ لے گئی۔ اس نے دوکاندار سے کہا" میرے پاس کچھ قیمتی نوادرات ہیں اور میں مجبوری کی حالت میں انہیں بیچنا چاہتی ہوں۔" ڈارلنگ ذرا باہر آنا۔ ہمارا سودا ایک بار پھر واپس آ گیا ہے کمبخت۔" پھر اس نے چہرا اوپر اٹھا کر کہا" آپ جی! اس سارے مال کے ہم آپ کو چھ روپے دے سکتے ہیں، وہ بھی آپ کی خاطر!"

ماسٹر روشی

یہ کہانی ملک کے اس مایہ ناز آرٹسٹ کی زندگی سے تعلق رکھتی ہے جس نے اپنے فن کو اپنے ہم وطنوں کے قدوم میمنت لزوم پر نچھاور کر دیا اور خود الٹے پیروں چلتا ہوا ان کی محفل سے نکل گمنامی کی وادی میں غائب ہو گیا۔ لاکھوں کے لاڈلے ماسٹر روشی کو اس وقت یا تو اس کے چند قریبی دوست جانتے ہیں یا اس علاقے کا ہرکارہ جو ہر سال جون کی آخری تاریخوں میں اس کے نام وزارت تعلیمات کا تار لایا کرتا ہے کہ:

REFERNCE OUR LETTER NO. D.903/EXP-JR (ED) 59 STOP GRANT FOR THE DESTITURE ARTISTS / DEPENDENTS OF THE DECEASED ARTISTS OFR THE YEAR 1970-71 STOP. YOUR GRANT RELEASE AUTHORITY OF RS 4800/= DWSPATCHED TO AGPR JAUHARABAD.

EDUCATION

اس تار کو حفاظت کیساتھ جیب میں ڈال کر جب وہ اپنی بڑی لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ٹیکسی میں سوار ہوتا ہے تو سمن آباد سے لے کر اے جی کے آفس تک کوئی نہیں پہچانتا کہ اس گاڑی میں اپنے وقت کا وہ ہیرو جا رہا ہے جس نے لاکھوں دلوں کو مٹھی میں لے رکھا تھا اور جس پر سینکڑوں عورتوں نے اپنی زندگیاں گھول گھمائی تھیں۔ اے زمانے تو بڑا ہرجائی ہے، تو کسی کا ساتھ نہیں دیتا اور کسی کی پروا نہیں کرتا۔ اے جی آفس کے سامنے جوگی بین کا لہرا بجا کر سانپ کی بند پٹاری کو انگلی سے ٹھکورتا ہے اور کہتا ہے:

بچہ جمورا!

واہ وا

سپ نوں چھڈاں؟

چھڈ!

اوئے وڈھ کھائے گا

نئیں وڈھ دا

اچھا بئی جوگی تے بین وجا کے سپ نوں مست کرلیندا اے،توں کنویں کریں گا؟

نچ کے!

لوؤ جی کہندا اے نچ کے،واہ وا کنویں پھیر

جمورا چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے چٹکیاں بجاتے ہوئے کوڈا کوڈا ہو کے ناچنے لگتا ہے: کا ہنوں روک رئیاں پہرے دارا، روضے دی جالی چم لین دے۔

ماسٹر روشی اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سے ایک چونی جیب سے نکال کر جمورے کے پاؤں میں پھینکتا ہے اور سر اونچا کر کے اے.جی آفس کی اونچی بلڈنگ کو دیکھتا ہے۔عمرانہ اس کی
آستین پکڑ کر کھینچتی ہے اور وہ آنکھوں میں آنسو لئے پھاٹک کے اندر داخل ہوتا ہے۔

ایک وہ زمانہ تھا جب عورتیں اپنے کانوں کے بالے، ہاتھوں کی پہنچیاں، جوڑے کے ہار اور لٹوں کے لچھے سٹیج پر اس کے قدموں میں پھینک دیتی تھیں اور وہ کمال بے نیازی کے ساتھ دونوں ہاتھ پھیلا کر، سر جھکاتا، بدن نچاتا سٹیج پر سے غائب ہوجاتا تھا اور دیر تک تالیاں بجتی رہتی تھیں پیٹی ماسٹر اپنی جگہ سے اٹھ کر سٹیج پر سے بکھری ہوئی چیزیں سمیٹتا تھا اور ونگ میں تحلیل ہوجاتا تھا۔ماسٹر روشی نے چیزوں میں سے کسی ایک کو بھی کبھی ہاتھ نہ لگایا تھا۔یہ تمام کی تمام تھیٹر کے کارندوں میں تقسیم ہوجاتیں اور ان کی وجہ سے بہت سے غریب آرٹسٹوں کے گھروں میں چولہے روشن رہتے۔آج وہی ماسٹر روشی اپنی جوان بیٹی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک ایک کر کے تیسری منزل کے زینے طے کرتا ہے اور اس کا سارا بدن ٹھنڈے پسینے سے بھیگ جاتا ہے۔اس ملک میں ادیب، آرٹسٹ، فن کار کی کوئی قدر نہیں۔جب اس کی شہرت کا سورج زوال پذیر ہوجاتا ہے تو وہ رات کے اندھیرے میں بھی باہر نکلنے سے گھبراتا ہے کہ کہیں وقت کے چمگادڑ اس کے بدن سے چمٹ کر خون کے آخری قطرے بھی نہ چوس لیں۔جوں جوں وقت قریب آتا ہے، آرٹسٹ مرنے سے اور خوف زدہ ہوجاتا ہے۔وہ زندگی کے صحن میں مردہ دھڑ کتے کی طرح لیٹا ہوا اپنے کانوں کی ڈگڈگی بجا کر مکھیاں اڑاتا رہتا ہے اور زندگی پیپل کے چمک دار اور نروئے پتوں میں سے اس پر بیٹیں کرتی رہتی ہے

اگر میں خود آرٹسٹ نہ ہوتا اور مجھے اپنے انجام اور ماسٹر روشی کی موجودہ حالت کے درمیان کاربن پیپر کی موجودگی کا احساس نہ ہوتا تو میں کبھی اس کے گھر نہ جاتا، کبھی اس کی دراز قد سانولی لڑکی کے ہاتھوں سے چائے نہ پیتا اور کبھی اس پر ایسا مضمون نہ لکھتا جس کی تیسری اور آخری قسط چھپ چکنے کے بعد بھی قارئین کی زوردار فرمائش رہتی کہ یہ سلسلہ رہنا چاہیے۔

ماسٹر روشی ایک لانی منجی پر لیٹا ہوا تھا اور اس کے سر کے نیچے سنبل کا ایک مردار سا تکیہ تھا۔اس نے لیٹے لیٹے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور کہا" ریڈیو پر اکثر آپ کی آواز سنائی دیتی رہتی ہے لیکن یہ بات میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ آپ سے ملاقات کا شرف بھی حاصل

ہوگا۔ میرے نصیب اور اس جھونپڑی کے بھاگ کہ چیونٹی کے گھر بھگوان آگئے ____ "میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور میں ان کی اس بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ عمرانہ نے کہا" ڈیڈی سارا دن اسی طرح لیٹے اپنے ماضی کو یاد کیا کرتے ہیں۔ خود بھی روتے ہیں۔ اوروں کو بھی رلاتے ہین۔ اب تقدیر کے آگے تو کسی کا بھی بس نہیں چلتا ناں جی۔"

میں نے کہا" ہاں جی، تقدیر کے آگے تو آدمی بالکل مجبور ہوتا ہے۔"

ماسٹر روشی ہماری یہ بات سن کر کہنی کے بل اٹھے اور کہنے لگے "بیٹی ذرا اندر سے پٹی لانا۔ کچھ یہ آئے ہیں، کچھ دل اندر سے پھٹا جا رہا ہے۔ اس وقت دونوں اندھیرے ملتے ہیں۔ میں رفتہ کو آواز دے کر اس کی گونج سننا چاہتا ہوں۔" پھر مجھ سے فرمانے لگے "جب شام کا اندھیرا اور دل کا اندھیرا دونوں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو بہاگ کی کوک فریاد پیدا ہوئی ہے اور پتھروں کے دل چھوٹ جاتے ہیں۔"

م؛یں نے کہا" ہاں جی پتھروں کے قلعے ٹوٹ جاتے ہیں، کچے منڈپ نہیں ڈھتے۔ کچے بڑے سنگ دل ہوتے ہیں۔"

کہنے لگے "واہ میاں وا، کیا بات کہی ہے تم نے۔ ساری عمر کچے لوگوں سے یاری کی لیکن کوئی بھی دل ہمارے لئے مہینوال کے بھانڈے کی طرح نہ ٹھنک سکا۔ "

میں نے کہا" ماسٹر صاحب! انجیل میں لکھا ہے کہ اگر میں سارے جہان کی بولیاں بولوں اور تمام دنیا کے علم حاصل کر لوں لیکن محبت نہ کروں تو میں ٹھنٹھنا تا ہوا پیتل اور جھنجھناتی ہوئی جانجھ ہوں۔" انہوں نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور سنبل کے تکیے پر ہاتھ پھیرنے لگے۔" عمرانہ پٹی لے کر آگئی اور ڈیڈی کے سامنے پائنتی پر بیٹھ گئی۔ ماسٹر روشی نے کہا:

"یہ غزل سر بندر نے بھی گائی تھی اور اپنے کلہاڑا سے گلے کے ساتھ اس کے خوب چھوڑے اتارے تھے اسی زمانے میں، میں بھی سٹیج پر یہ گاتا تھا۔ ہاں بیٹی۔"

عمرانہ نے ہارمونیم بجانا شروع کیا:

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا نہ شاخ گل تھی، نہ بلبل نہ آشیانہ تھا

لیکن ماسٹر روشنی کی آواز میں اب کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔ ایک آرٹسٹ کی انا تھی، جو وو کل کورڈز کے بجائے بول رہی تھی۔ عمرانہ بڑے سر میں باجہ بجا رہی تھی اور اس کی انگلیاں پردوں کو چھوٹے چھوٹے بوسے دے رہی تھیں۔ میرا دل بھی ہر پردے کی دبک کے ساتھ تھوڑا تھوا نیچے کو ڈول جاتا تھا۔

غزل ختم ہوئی تو میں نے ماسٹر صاحب کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنی آنکھوں کے ساتھ لگا لیا۔ عمرانہ پیٹی کے لے کر اندر چلی گئی تو ماسٹر روشی نے بڑی آہستگی سے کہا____ مہاراج بڑوودہ کی تین بھانجیاں تھیں، تینوں چودھویں کا چاند لیکن درمیانی کے حسن کی تاب برداشت نہیں ہوتی تھی۔ میں ایک مہینہ ریاست میں رہا اور ہر شام اسے کمل تال کے کنارے یہ غزل سنا تا رہا لیکن اس کی طبعیت سیر نہ ہوئی۔ آخر ایک دن کہتنے لگی، راج پاٹ محل و محلے، ماں ماما سب جائیں بھاڑ میں۔ میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں جہاں لے جاؤ گے، داسی بن کر رہوں گی۔ بڑودہ کا نام تک نہ لوں گی۔" میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ جس کا ماما مہاراج ہو، اس کی بھانجی راج کماری ہی ہو

گی۔اس کی بات سن کر دل تو خوش ہوا پر اندر سے روح کانپنے لگی۔میں نے کہا "ریاست سے نکل کر انگریزی علاقے میں جا لینے دے، پھر تمہیں بلالوں گا۔" چندراوتی نے میری بات مان لی۔تین لاکھ کے ہیرے اور سونے کی بارہ اینٹیں مجھے چوری سے دیں اور گلے میں ہاتھ ڈال کر بولی "انگریزی کے علاقے میں جا کر بھول نہ جانا۔انگریز چاتر اور بے دھرم ہوتا ہے۔" میں نے کہا "تو چندرا ہے تو میں روشنی ہوں ۔روشنی چاند کو کس طرح چھوڑ سکتی ہے۔" لو جی پھر میں جالندھر آ گیا۔عالی کے پر رشیدہ ڈومنی کی تین منزلہ عمارت تھی۔تین لاکھ کے ہیرے بک بکا کر ان تینوں منزلوں میں کہیں گم ہو گئے۔لیکن ٹائم بہت اچھا پاس ہوا۔ہمارے پاس اس وقت پانچ فورڈ کیا گاڑیاں تھیں۔ایک میری اور رشیدہ کی،ایک اس کے لڑکے رفیق کی اور تین اس کی لڑکیوں کی۔سب کی الگ الگ ____ ماسٹر روشی نے کہا کہ اس ڈیڑھ پونے دو سال کی مدت میں ہندوستان، نیپال، سکم اور لنکا کے بڑے بڑے گویے ہمارے گھر آ کر چوکی بھرتے رہتے اور منہ مانگے انعام پاتے رہے ۔تین لاکھ روپیہ اس زمانے میں تین کروڑ روپے سے کم نہیں تھا۔

"اور چندراوتی؟" میں نے پوچھا "اس سے آپ کی ملاقات نہ ہوئی؟"

کہنے لگے "اس عرصے میں نے کسی سے بھی ملاقات نہ کی۔مایا پارسی تھیٹر نے کراچی میں بڑا بزنس کیا۔خود سیٹھ نسروان مجھے لینے آیا لیکن رشیدہ نے مجھے جانے نہیں دیا۔محبتوں کے پارٹ کے لئے مجھے ایک ہزار روپے روز پر بک کرتا تھا لیکن میں نہیں مانتا۔دراصل اس زمانے میں کراچی اتنا بڑا شہر نہیں تھا۔پھر عالی کے عمے سے میری زندگی بندھی تھی، میں کس طرح سیٹھ کے ساتھ چلا جاتا۔"

"او چندراوتی" میں نے پھر پوچھا "وہ آپ کو بھی کبھی نظر آئی؟"

"آئی ____ آئی کیوں نہیں۔" ماسٹر روشی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا" کولوٹولہ سٹریٹ کلکتہ میں ہامون بھائی ناتھن جی کے تھیٹر میں نے فرہاد کا پارٹ کیا۔اگلے صوفے پر چندراوتی اور اس کا خاوند بیٹھے تھے۔کسی چھوٹی سی ریاست کا رجواڑہ تھا۔کیسری رنگ کی پگڑ، کانوں میں نیلم کے بندے، گورا رنگ، موٹی ناک، آنکھوں سے ٹیر مارتا تھا۔میں نے بھی شیریں کے دکھ کے سارے ڈائیلاگ چندراوتی کی طرف منہ کر کے ادا کئے اور جب میں نے تیشہ اپنے سر پر مارا تو مرنے سے پہلے مجھے چندراوتی کی چیخ سنائی دی۔کوئی دس منٹ تک ہال میں تالیاں بجتی رہیں۔پھر پردہ اٹھا، ساری کاسٹ آڈیئنس کے سامنے آئی تو نعروں اور جے جے کاروں کا طوفان امڈ آیا۔میں اسی طرح ہاتھ باندھے سٹیج سے اترا اور مہارانی چندراوتی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔اس نے سر پر جمے ہوئے سفید ساڑھی کے پلو سے ہیرے کا کلپ اتارا، پلو پیچھے پھینکا اور گلے سے موتیوں کی مالا پکڑی تو دل پر ایک گھونسہ سا لگا۔مہارانی نے پلو سر پر رکھا اور کلپ لگا لیا۔رجواڑے نے رانی کی طرف حیرت سے دیکھا اور پھر میری طرف منہ کر کے بولا "شاباد ماشٹر، سہاونا کام دکھایا تے نے۔"

میں نے کہا" حضور ہم تو رانی جی کے آور میں پہلے بھی گاتے رہے ہیں، جب یہ راج کماری تھیں۔"

رانی نے دماغ پر زور دے کر کہا" مانو یاد تو پڑتا ہے پر یاد نہیں آتا۔" اور پھر وہ ہال سے باہر نکل گئیں۔

میں نے کہا" ماسٹر جی، وہ موتیوں کا ہار؟"

ماسٹر روشی نے کہا" ایسے کئی ہار آئے اور چلے گئے۔میسرز اینڈ رسن جی بروتھ سکاچ وہسکی کے امپورٹڈ تھے۔مین ان کی دوکان سے

مال نہیں لیتا تھا، ان کی معرفت اپنی شپ منٹ الگ منگواتا تھا۔ ہر بوتل پر سنہرے رنگ کا ایک سنہرا لیبل ہوتا تھا جس پر لوہے کے چھاپے میں "ماسٹر روشن، تھیٹر ہیرو کے لئے" اردو میں چھپا ہوتا تھا۔ یہ لیبل ولایت ہی میں چھپتا تھا اور وہیں سے بوتلوں پر لگ کر آتا تھا۔ بڑا یادگار ٹائم پاس کیا ہے اس گنہگار نے اور بڑے بڑے زمانے دیکھے ہیں۔ اب دیکھ لو، اس کھنڈر میں پڑے ہیں این ٹائپ کوارٹر میں۔ کل چار سو روپے ماہانہ سرکار سے مدد ملتی ہے۔ اس میں سے ایک سو تیس کرائے کے چلے جاتے ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ سوا تین سو روپے اپنے خانسامے کو ماہوار دیتا تھا اور انعام اکرام جو اس کے مقدر کا بن جاتا تھا، وہ الگ،" ماسٹر روشی نے کہا "انسان حقیت سے آنکھیں بند کر سکتا ہے لیکن پرانی یادوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ پرانی یادیں زنگ آلود پیچوں کی طرح ہوتی ہیں، کوشش کا پیچ کس ٹوٹ جاتا ہے لیکن پیچ نہیں کھلتا۔"

میں نے کہا "سر، پھر آپ جمعرات شام کے ساتھ ساڑھے سات بجے ٹیلی ویژن سٹیشن پہنچ جایئے اور عمرانہ کو بھی ساتھ لیتے آیئے۔ ماسٹر روشن نے دکھی ہو کر کہا "یہ تو ضرور آئے گی۔ اس کو تو آنا ہی پڑے گا۔ یہی تو میرا رستے کی لاٹھی ہے۔ انہی راستوں میں تو اس غریب کی جوانی برباد ہوئی۔ واہ عمرانہ واہ ____ کیا دیا باپ نے تم کو ____ کیا ملا تم کو اس گھر سے ____ ہائے ہائے ہائے۔"

السلام علیکم خواتین حضرات! ٹی وی پروگرام "یاران کہن" کا میزبان آپ سے مکاطب ہے اور آپ کی کدمت میں سلام پیش کرتا ہے۔ ہمارے آج کے اس پروگرام میں برصغیر کے نامور فن کار، اداکار، شاعر اور موسیقار جناب روشن علی ساغر المعروف ماسٹر روشی آپ سے ملاقات کی غرض سے تشریف لائے ہیں۔ (ماسٹر روشی کا کلوز اپ، وہ ہاتھ اٹھا کر ناظرین کو سلام کرتا ہے) ناظرین کرام! وہ لوگ جنہوں نے ماسٹر صاحب کو اپنے فن کے عروج پر دیکھا ہے، میرے ساتھ اتفاق فرمائیں گے کہ گزشتہ ربع صدی میں دنیا کے چار پانچ باکمال فن کاروں کی فہرست میں ماسٹر صاحب موصوف کا نام بھی شامل تھا اور یورپ کے نقاد انہیں ساحر مشرق کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ان کے فن اور زندگی پر جیتنے مضامین مغربی ممالک کے اخباروں اور فنی جریدوں میں شائع ہوئے، اتنے کسی اور ایشائی فن کار، مصنف، سائنس داں یا ماہر تعلیم کا مقدر نہ بن سکے ____ خواتین وحضرات! میں زیادہ دیر تک آپ کے اور ماسٹر روشی کے درمیان حائل رہنا نہیں چاہتا، فقط چند جملوں کے ساتھ ان حضرات کا تعارف کرانا ضروری سمجھتا ہوں جو پروگرام "یاران کہن" کے سلسلے میں ہمارے سٹوڈیو میں تشریف فرما ہیں اور ماسٹر ماسٹر روشی کا انہوں نے مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ میرے دائیں ہاتھ ہیں جناب بھائی چھیلا صاحب، معروف سنگر اور مہاراجہ پٹیالہ کے درباری گویے۔ آپ کے ساتھ ہیں جناب نذیر حسینی صاحب، تھیٹر کے اداکار اور ریڈیو، ٹی وی کے فن کار (نذر حسینی مسکرا کر سر ہلاتا ہے)۔ اور آخر میں جناب احمد بشیر صاحب ____ صحافی، اداریہ نویس، فلم ساز اور موسیقی نوز۔ ان تینوں حضرات نے ماسٹر روشی کے فن سے خوشہ چینی کی ہے اور سینکڑوں ہزاروں اور لوگوں کی طرح وقت کے اس عظیم فن کار کو براماں دیتے ہیں ____ ناظرین کرام! اب ہم جناب بھائی چھیلا سے پوچھیں گے کہ انہوں نے سب سے پہلے ماسٹر روشی کو کہاں

اور کب دیکھا؟

بھائی چھیلا: جناب ماسٹر صاحب کو میں نے سب سے پہلے چھ جولائی سن انی سو چھبی میں پٹیالے میں دیکھا۔اس وقت عیدگاہ کے سامنے ان کا تھیٹر لگا تھا اور مہاراج نے خاص تاکید کر کے انہیں ریاست میں بلوایا تھا۔ پہلا دن عام لوگوں کے لئے نہیں تھا، صرف مہاراج اور راج پریوار کی بی بیوں اور درباریوں کے لئے تھا۔ دلی سے وائسرائے کے اےڈی کانگ ایڈن مور اور راج پر مکھ کے لسی ناظم جان گبور صالحؒ مہاراج کے ساتھ موجود تھے۔ درباری گویوں میں سے مہاراج نے صرف مجھ کو آنے کی اجازت دی تھی۔

ایم سی: یہ تھیٹر دربار ہال میں ہوا یا باہر؟

چھیلا: میں نے عرض کیا ناں جی کہ تھیٹر عیدگاہ کے باہر لگا تھا۔ ماسٹر روشنی نے دربار میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

ماسٹر روشی: یہ میرا اصول تھا کہ چھوٹی ریاستوں کے درباروں میں نہیں گاتا تھا۔ بڑی ریاستوں میں سے بھی میں نے چھ کا انتخاب کر رکھا تھا جہاں میں پانچ راجوں اور چھٹے نظام کے سوا اور کہیں اپنے فن کا مظاہرہ نہ کرتا تھا۔

ایم سی: خواتین وحضرات! یہ ایک فن کار کی غیرت اور انا کا سوال ہے۔ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن فن کو بیچتا نہیں۔ فن ایک ایسی چیز ہے جو نہ بیچی جاتی ہے نہ خریدی جاسکتی ہے۔ فن تو فن ہی ہوتا ہے_____ ہاں جی بھائی چھیلا صاحب، تو آپ نے ان میں کیا کمال دیکھا؟

چھیلا: جناب عالی ماسٹر صاحب ایک سمندر تھے، ایک ساگر تھے۔ رکھب، کومل، گندھاران کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ سرتیاں ان کے گھر کا پانی بھرتی تھیں۔ جب انہوں نے سٹیج پر کھڑے ہو کر پہلی تان لی تو بدھ سنگ پکھاوجی نے بتایا دھاماں خود بخود گونجنے لگا اور پکھاوجی ڈر کر جوڑی سے پرے ہو گیا۔

ایم سی: شاید وہ ابھی کچا پکھاوجی تھا۔

چھیلا: جی نہیں جناب، بیدی بدھ سنگھ اکی سال دربار صاحب میں ارداس کرتا رہا تھا اور سارے ملک کا مشاہور طبلہ بجانے والا تھا۔ مہاراج جب دربار صاحب متھا ٹیکنے گئے ہیں تو انہوں نے بدھ سنگھ پکھاوجی کو سنا اور وہیں سے اسے ساتھ لیتے آئے۔ بھلے زمانے میں تین سو روپے مہینہ اور رہنے کو گھر دیا تھا مہاراج نے۔

ایم سی: ماسٹر روشی صاحب نے وہاں پہلا گانا کون سا گایا؟

چھیلا: مجھے اب تک یاد ہے جناب عالی! وہاں انہوں نے "پٹیالہ ولا راجہ بول ہور بولدا، نی چکور بولدا کوئی مور بولدا" گایا تھا۔

ایم سی: لیکن یہ گانا تو آپ بھی گاتے رہے ہیں اور آپ نے اس سے کافی شہرت حاصل کی ہے۔

چھیلا: (دونوں ہاتھ کانوں کو لگا کر) توبہ جناب، توبہ! کتھے رام رام کتھے ٹیں ٹیں۔ ماسٹر صاحب کے سامنے ہماری آواز تو کٹے کی ڑنگ تھی۔

ماسٹر روشی: نہیں بھائی چھیلا جی، آپ بھی خوب تھے ماشاءاللہ۔

چھیلا: آپ کی کرم نوازی ہے جناب عالی! ہم مقدر کے کڑ چھے اڑاتے رہے، فن وغیرہ تو توبہ توبہ (پھر کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔)

چھیلا: مہاراج نے کسی ناظم صاحب کو پاس بلایا اور انہوں نے سٹیج پر جا کر اعلان کیا کہ اس گانے سے خوش ہو کر مہاراج نے سنام میں باراں مربعے، پٹیالے میں ایک حویلی اور پیلے جھول والی تھین بھوری بھینس ماسٹر صاحب کے نام کریں۔ ماسٹر صاحب نے (ان سے مخاطب ہو کر) حضور کو یاد ہو گا، اسی وقت ایک شکریے کا ترانہ پڑھا اور سٹیج سے اتر آئے۔

ایم سی: ماسٹر صاحب آپ نے وہاں قیام فرمایا؟

ماسٹر روشی: جی نہیں۔ ایسی خشک اور بے فیض جگہ میں ہمارا دل کس طرح لگ سکتا تھا۔ میں نے ایک مہینہ قیام کرنے کے بعد وہ جگہ چھوڑ دی

ایم سی: اور وہ زمین اور حویلی؟

روشی: وہ میں نے علاقے کے ذیلدار کے ہاتھ فروخت کر دیں۔

چھیلا: جی جناب مجھے یاد ہے۔ ایک لاکھ دس ہزار میں دونوں چیزیں فروخت کر دی تھیں انہوں نے ______ کوڑیوں کے مول سونے جیسی زمین بیچ دی۔

ایم سی: اور بھوری بھینس؟

چھیلا: ایک تو مجھے تحفے کے طور پر دی تھی۔ دوسری دونوں دیپو ساہنسی کی بیٹی کو دے دی تھیں۔ بڑی جوان نچار تھی وہ بھی اپنے وقت کی۔

ایم سی: نذیر حسینی صاحب! آپ نے بھی ماسٹر روشی کے کمالات دیکھے ہیں۔ یہ فرمایئے کہ آپ نے ان سے کچھ سیکھا؟

نذیر حسینی: ان سے کچھ سیکھنا یا ان کے ساتھ مقابلہ سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگا تیلی۔ میں نے اپنے بچپن میں ان کو جالندھر میں عالی کے مے پر دیکھا تھا۔ ان کے پاس پانچ موٹریں تھیں اور ہم علاقے کے سارے لڑکے شام کو کھیل کود سے فارغ ہو کر ان کی موٹریں دیکھنے جایا کرتے تھے۔ یہ سب لوگ سوار ہو کر کمپنی باغ اور پھر چھاؤنی کی سیر کو تشریف لے جایا کرتے تھے۔

ایم سی: لیکن آپ نے ان کو سٹیج پر کب دیکھا؟

نذیر: سٹیج پر میں نے ان کو انبالے میں دیکھا۔ میں گھر سے چوری ان کے فن کا کمال دیکھنے انبالے گیا تھا اور پھر تین سال تک لوٹ کر گھر نہیں آیا۔

ایم سی: وہ کیوں؟

نذیر: جہاں جہاں ان کا تھیٹر جاتا تھا، میں بھی جاتا تھا۔ راستے میں محنت مزدوری کرتے ______ منڈیوں، بازاروں میں بوجھ اٹھاتے ______ کرایہ اور تھیٹر کا ٹکٹ بناتے ______ ہم بردھوان تک پہنچ گئے۔

ایم سی: ہم سے آپ کی کیا مراد ہے؟

نذیر: ہم سے میری مراد ان نوجوانوں سے ہے جو میری طرح سو ڈیڑھ سو کی تعداد میں ان کے تھیٹر کے ساتھ ساتھ چلتے تھے اور جہاں

ماسٹر صاحب قدم رکھتے تھے، وہاں اپنی آنکھیں بچھاتے تھے۔ ماسٹر صاحب کو اپنی زندگی میں جو شہرت، جو مقبولیت اور جس قدر دولت نصیب ہوئی وہ میرے خیال میں اب تک کسی اور آدمی کے مقدر میں نہیں ہوئی۔

ماسٹر روشی: لیکن اس شہرت، اس مقبولیت اور اس دولت سے مجھے کیا فائدہ پہنچا؟

ایم سی: آپ بجا فرماتے ہیں۔ دراصل ہمارے ملک میں فن اور فن کار کی وہ قدر نہیں جو دوسرے ملکوں میں ہے۔ یہاں تو فن کار کو اپنا فن بیچ کو پیٹ پالنا پڑتا ہے ______ ہاں جی حسینی صاحب تو وہ کون سی ایسی چیز تھی جو آپ کو کشاں کشاں ماسٹر صاحب کے ساتھ لئے پھرتی تھی؟

نذیر حسینی: یہ ماسٹر صاحب کے فن اور ان کی صداکاری کا کمال تھا جس نے لاکھوں دلوں کو اسیر بنا رکھا تھا۔ ان کو یاد ہوگا کہ جب یہ ناٹک لیلیٰ مجنوں میں مجنوں کا پرٹ کیا کرتے تھے تو دو دو مہینے پہلے ٹکٹ بک جاتے تھے اور ہزاروں لوگوں کو جو دور دور سے آئے ہوتے تھے، مایوس ہو کر لوٹنا پڑتا تھا۔

ایم سی: آپ اس ناٹک میں ان کے کمال فن کی کوئی ایک خوبی بیان کر سکتے ہیں؟

نذیر: مجنوں لیلیٰ سے جدا ہو کر جنگل میں نکل جاتا ہے اور اسے تن من کا ہوش نہیں رہتا۔ ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر پاؤں پسارتا ہے تو معاً اسے خیال آتا ہے کہ کہیں ادھر لیلیٰ کا گھر نہ ہو۔ اٹھتا ہے اور کھجور کے ایک درخت کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بھوک پیاس سے بے نیاز اور اپنے وجود سے بے خبر وہ کئی مہینے تک اسی طرح کھڑا رہتا ہے۔ اس کا بدن سوکھ کر کیکر کے تنے کی طرح کھر دار اور بے جان ہو جاتا ہے۔ اس وقت جنگل میں چند لکڑ ہارے لکڑی کاٹنے کی غرض سے آتے ہیں اور کیکر کے اس سوکھے ہوئے درخت کو دیکھ کر اس پر آرا چلاتے ہیں۔ آرے کی پہلی رگڑ کے ساتھ ہی اس نحیف و نزار بدن سے ایک کراہ پیدا ہوتی ہے جو نقاہت کی وجہ سے بلند نہیں لیکن پھر بھی آڈیئنس کی آخری قطار تک پہنچتی ہے۔ بس ان کی یہ کراہ لوگوں کا کلیجہ نکال لیتی تھی اور بیسیوں لوگ ہال میں بے ہوش ہو جایا کرتے تھے۔

ایم سی: وہ وا صاحب، وہ وہ ______ جناب یہ ہے تو گستاخی اور ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ کو زحمت دیں لیکن ہمارے ناظرین کی آرزو ہے کہ آپ اس طرح کی آواز ایک مرتبہ نکال کر سنائیں ______ میں معافی چاہتا ہوں۔ (ماسٹر روشی اپنی کرسی سے اٹھتا ہے۔ ایک قدم آگے بڑھا کھڑا ہو جاتا ہے۔ کیمرہ اس کا M.C.U. لیتا ہے اور ماسٹر روشی دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر ایک گمبھیر آہ بھرتا ہے۔ ایم سی ماتھے پر عقیدت کا ہاتھ لے جا کر اسے سلام کرتا ہے اور واپس کرسی میں بیٹھنے میں مدد دیتا ہے۔)

ایم سی: نذیر حسینی صاحب آپ کو ماسٹر روشی صاحب کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا ہوگا اور آپ نے محسوس.....

نذیر: (بات کاٹ کر) نہیں جناب، یہ فخر ہم جیسے خاک نشینوں کو حاصل نہیں ہوا۔ اگر خدا نخواستہ ہمیں ایسا چانس ملتا بھی تو ہم ان کے ساتھ چھوٹے موٹے پارٹ کئے تھے لیکن وہ بھی ان کے آگے اچھی طرح سے جم نہ سکے تھے۔

ماسٹر روشی: محمد حسین میں بڑی جان تھی، بڑی ادائیگی تھی۔ بڑا فن کو سمجھنے والا تھا۔ افسوس اس کی عمر نے وفا نہ کی نہیں تو اپنے وقت کا عظیم

اداکار ہوتا۔اس کے ساتھ کام کرنے میں مزا آتا تھا______ (کیمرے کی طرف چہرا اٹھا کر) لیکن خواتین وحضرات، اچھا ہی ہوا کہ وہ مر گیا اور اس بے دید اور بے مروت دنیا کو چھوڑ گیا۔آخر اس کو کیا مل جاتا! یہ واہ کرنے والے اس کو کیا دے دیتے۔

ایم سی: یہ بڑی دردناک باتیں ہیں ناظرین کرام لیکن اس پروگرام میں پوری کوشش کے باوجود ایسی باتیں آ ہی جاتی ہیں جس کے لئے میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔اب میں جناب احمد بشیر صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ ماسٹر روشی صاحب کے فن کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

احمد بشیر: جناب جہاں تک فن کا تعلق ہے،اس معاملے میں میں خود کورا ہوں البتہ.......

ایم سی: نہیں حضور، ایسی کسر نفسی بھی واجب نہیں۔ہم نے آپ کے مضامین خاص طور پر آپ کے کریکٹر سکیچز بھی پڑھے ہیں اور آپ کی فلم بھی دیکھی ہے۔یہ بات ہم ماننے کے لئے ہرگز نہیں کہ آپ اس راہ سے نا آشنا ہیں۔

احمد بشیر: چلئے جناب آپ کی بات مان لیتے ہیں کیونکہ ٹی وی کے پروگراموں میں ایک دوسرے کی باتیں ماننے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ماسٹر روشی سے بڑا فنکار میں نے اپنی زندگی میں اس برصغیر میں نہیں دیکھا۔ہالی وڈ میں البتہ میں بڑے بڑے آرٹسٹوں اور فن کاروں سے ملا ہوں جنہوں نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔میرے اور ان کی ملاقات 60ء میں کراچی میں ہوئی تھی، جب انہوں نے سٹیج پر آنا چھوڑ دیا تھا اور ڈیزی سینما میں دو آنے کے پتی دار تھے۔اس وقت ان کی حالت اس قدر ناگفتہ بہ نہ تھی۔افسوس کہ طبقاتی نظام میں حالات کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیتے..... خاص طور پر فن کاروں، ادیبوں، شاعروں اور تخلیق صلاحیت رکھنے والوں کے ساتھ بہت زیادتی کرتے ہیں۔(کیمرہ بھائی چھیلا کا کلوز اپ دکھاتا ہے جو اس فقرے پر سر دھنتا ہے اور انگشت شہادت اٹھا کر اس کی تائید کرتا ہے) ماسٹر روشی نے گاہے گاہے کبھی میرے دفتر میں اور کبھی اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر دوستوں کی ایک مخصوص محفل میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور ادائیگی کی باریکیوں سے ہمیں روشناس کرایا۔ان کے فن سے بہرہ مند ہونے کے لئے ہمیں تخلیق کی جدلیاتی قدروں سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ماسٹر روشی کا فن شیکسپیرئن تھیٹر اور مارکسی تصور تخلیق کا ایک ایسا سنگم ہے جس کی مثال ہمیں اور کہیں دکھائی نہیں دیتی۔گو ماسٹر صاحب شعوری طور پر ان دونوں چیزوں سے نا آشنا ہیں لیکن آرٹسٹ کے اندر کا جوہر ایسی خود ساختگی اور خود تراشی کا حامل ہوتا ہے کہ کوزہ گر کی طرح برتن خود بن بن کر چاک سے اترنے لگتے ہیں۔

ایم سی: آپ کے خیال میں ماسٹر صاحب کو ابھی اور کام کرتے رہنا چاہئے تھا تاکہ وہ گمنامی کے گھور اندھیرے سے محفوظ رہتے؟

احمد بشیر: یہ آپ کیا فرما رہے ہیں حضور۔ماسٹر صاحب کے گمنامی میں جانے اور اس طرح کسمپرسی کی حالت میں زندگی بسر کرنے کی ساری ذمہ داری معاشرے پر ہے جس نے ایک فن کار کو وقت سے پہلے بوڑھا کیا اور اب وقت سے پہلے مارنے کے لئے واردات کر رہا ہے۔فن کار ایک انسان، ایک شخص یا ایک فرد نہیں ہوتا۔وہ ایک مکتبہ فکر، ایک سکول آف تھاٹ ہوتا ہے۔اس نے معاشرے کو اچھا دیا ہوتا ہے۔اس نے معاشرے پر کچھ احسانات کئے ہوتے ہیں اور ان احسانات کا بدلہ چکانا معاشرے کے

فرائض میں داخل ہوتا ہے۔

ایم سے: خواتین وحضرات، ہمیں افسوس ہے کہ اس دلچسپ گفتگو میں اس پروگرام کے لئے مخصوص وقت پر توجہ نہ دے سکے اور باتوں کا سلسلہ طویل ہو گیا۔اب میں احمد بشیر صاحب سے معذرت کے ساتھ سیدھا ماسٹر روشی صاحب سے سوال کرتا ہوں کہ انہیں اپنے فن اور اپنی زندگی کے بارے میں کیا کہنا ہے اور آنے والوں فن کاروں کو کیا نصیحت کرنے ہے۔

ماسٹر روشی: میں، اور اپنے بارے میں کچھ کہوں! میں، اور اپنی زندگی کے حالات سناؤں! میں، اور کسی کو نصیحت کروں! ہاہاہا____ خیال دلرباستان، پیکر بے وفائی، جگر کے ٹکڑے ٹکڑے کر، ظالم کے دل کی طرح سیاہ رات، اور تاریک ہو جا۔ بالکل ڈراؤنی ہو جا۔ ہم خوف کھانے والوں میں سے نہیں ہیں۔ لیکن اے بادصبا، اے نسیم سحر! تو اپنے جھونکوں سے، اٹھکیلیوں سے خرام ناز چلتی ہے اور مرجھائے ہوئے دل والوں کے ساتھ روح گلاب کا کام دیتی ہے۔ مگر یہ کیا بے انصافی ہے۔ کیا تو نے میرے زخم جگر کو ہرا رکھنے کی قسم کھائی ہے!

ایم سی: واہ وا کیا کہنے۔ آپ نے تو الفاظ کے روے چن کر ایک رنگین محل کھڑا کر دیا۔

ماسٹر روشی: مجھے آپ سے، آپ کے ناظرین سے یا اس ٹی وی کیمرے سے کچھ نہیں کہنا ہے۔ میں لوگوں کی ناقدر شناسی اور اہل ثروت کی بے قدری کا رونا کب تک روؤں اور کس کس دیوار سے سر ٹکراؤں اور کس کس کے سامنے دریوزہ کا دامن پھیلاؤں۔ میں ایک احسان فراموش اور بے دید زمانے میں پیدا ہوا اور فن کے ہاتھوں ذلیل وخوار ہوا۔ میں نے اپنے معاشرے پر، اپنی قوم پر، اپنے ہم نفسوں اور ہم جیسوں پر احسان کئے۔ ان کے قدموں میں اپنے فن کے پھولوں کو نچھاور کیا۔ ان کی بے رخی کے سامنے اپنے سروں کو سجدے کرائے۔ ان کی کیف اور بے رنگ ساعتوں کو اپنے خون جگر سے سنچا اور اس کا انعام کیا پایا....... دو وقت کی سوکھی روٹی، موت کا قرب، بڑھاپا، ضعف، کاہلی، گراں جانی، گمنامی، بے تعلقی____ میں پوچھتا ہوں میرے خدمات کے صلے میں میری قوم نے مجھے کیا دیا؟ میں پوچھتا ہوں میری خدمات کے جواب میں عوام نے مجھے کیا بخشا؟ میں پوچھتا ہوں.....

ایم سی: خواتین وحضرات، پروگرام "یاران کہن" کا وقت ختم ہوا۔ ایک ہفتہ بیچ اگلے ہفتے ہم پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ اس وقت تک کے لئے اجازت دیجئے۔ خدا حافظ!

عمدہ ہے آدم چائے______ اعلیٰ ہے آدم چائے
ہر گھر میں ہر محفل میں______ یہ رہتی ہے ہر دل میں
عمدہ ہے آدم چائے______ اعلیٰ ہے آدم چائے

بڑی عمدہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ میرے دل کے سیلے سیلاب آنگن میں بہت سے چھوٹے چھوٹے غم تنگ دھڑنگ

بچوں کی طرح سر جوڑے سیلی مہتابیاں روشن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے آج ایک آدمی کو مال روڈ پر دیکھا۔ وہ اس گرمی میں سمر کا سوٹ پہنے روتا ہوا جا رہا تھا۔ پاس سے گزرتے ہوئے لوگ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ بار بار عینک اتار کر رومال سے اپنی آنکھیں پونچھتا تھا اور آنسو پھر اس کی آنکھوں سے رواں ہو جاتے تھے۔ میں چند قدم تک اس کے پیچھے چلا لیکن پھر میں نے اس کی پیروی چھوڑ دی۔ اگر میں اس کے رونے کی وجہ پوچھ بھی لیتا اور وہ بیان بھی کر دیتا تو میں کیا کر لیتا؟

گرمیوں کے اس تکلیف دہ اور گل گھونٹوں موسم میں ٹھنڈی ہوا، مستقبل کے لئے پس انداز کے بینک بیلنس کی طرح سہانی اور خوش گوار ہے۔ جس الماری میں چیک بک، ڈیفنس سیونگ سرٹیفیکیٹ، آدم جی شوگر مل کے شیئرز، این آئی ٹی یونٹ، ای ایف یو کی پالیسی اور مکان کی رجسٹری رکھی ہے، اس کا پٹ کھولو تو اس میں سے بھی ایسی ہی ٹھنڈی ہوا آیا کرتی ہے، چاہے موسم کوئی بھی ہو۔

ملازم نے کہا" کوئی بابا ابراہیم آپ سے ملنے آیا ہے۔"

میں نے کہا" اسے یہیں لان میں بھیج دو اور چھوٹا موڑھا میرے سامنے رکھ دو۔"

ٹھنڈی ہوا کو ہاتھوں سے ٹٹولتا ہوا بابا ابراہیم میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا" بیٹھ جاؤ بابا جی اور حکم کرو۔"

بابا ابراہیم ذرا سا جھک کر موڑھے کو ٹٹول کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا" غریب نواز! میرا نام ابراہیم کھرادیا ہے اور میں پورے تریہ سال پلنگوں اور منجیوں کے پاوے کھرادتا رہا ہوں۔"

میں نے کہا" اچھا بابا جی_____شاباش!"

کہنے لگا" پچھلے سال سے آنکھوں میں موتیا اتر آیا ہے اور مجھ سے کام نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا" بابا جی کوئی پتر؟ کوئی دھی؟"

کہنے لگا" کوئی نہیں جی_____ایک پتر تھا۔ اس کو کھرادکا کام سکھایا تھا پر وہ سنہ پینٹھ والی جنگ میں گولا بارود ٹرک میں چڑھاتا ہوا شہید ہو گیا۔ خیر چنگا رہا۔ اپنا مقدر تھوٹھ کا نا بنا گیا، پر بابے کو اکیلا چھوڑ گیا۔'

میں نے کہا" بڑے افسوس کی بات ہے بابا جی۔"

بولا....." نہیں 'افسوس کی کوئی بات نہیں بس ٹیم مشکل سے پاس ہوتا ہے۔ میں کریم بخش ترکھان کے چھپر میں رہتا ہوں۔ منجی بھی ہے، پانی کا گھڑا لوٹا بھی ہے۔ جمعرات کے جمعرات کریم بخش ایک روپیہ بھی دے دیتا ہے۔ پھر بھی مشکل ہے۔ ان پانی کی گزر نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا" بزرگو، پھر کیا کروں؟"

کہنے لگا" موچی دروازے گھاٹی پر رشید خاں وکیل نے حضور کا پتہ دیا تھا کہ ریڈوے پر آپ نے ماسٹر روشی کا نام بول کر قوم سے اور گورنمنٹ سے بڑھاپے میں اس کا ہاتھ پکڑنے کی درخواس کی تھی۔"

میں نے کہا" ہاں ریڈیو پر، ٹیلی ویژن پر، اخبار میں، سب جگہ اس کے لئے کوشش کی جا رہی ہے۔"

کہنے لگا" پچی کو روپے مہینہ میرے نام بھی لگوا دے۔ میرا ٹیم پاس ہو جائے گا۔"

میں نے کہا" بزرگوں! وہ فن کار ہے، آرٹسٹ ہے، صدا کار ہے۔ اس کے قوم پر بڑے بڑے احسانات ہیں۔ آپ نے قوم کے لئے کیا کیا ہے؟"

بابا ابراہیم نے ڈرتے ڈرتے کہا" جناب میں تیہ سال قوم کے واسطے پاوے بناتا رہا ہوں۔"

میں نے ہنس کر کہا" بابا اس سے قوم کو کیا فائدہ پہنچا!"

کہنے لگا " جناب قوم منجیاں کھاٹاں تے سوندی رہی اے۔"

میں نے کہا" بابا تو کوئی اللہ واسطے پاوے بناتا رہے ہے؟ دہاڑی بھی تو لیتا ہوگا؟"

کہنے لگا" ہاں جی، جھوٹ نہیں بولنا۔ ڈیڑھ روپے روز سے دہاڑی شروع کی تھی، سات روپے روز پر آ کر ختم ہوئی۔ بڑے پیسے بنائے عالی جاہا۔ بڑا اچھا ٹیم پاس کیتا۔ پر اب مجبوری ہے، موتے کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آتا۔ ہو سکتے تو وظیفہ لگوا دیئو۔"

میں نے کہا" یہ کام مشکل ہے۔ تم نے اپنے ذہن سے یا اپنے فن سے یا اپنی فکر سے قوم کی خدمت کی ہوتی تو میں تمہارا کیس لے کر چلتا بھی اور تمہارا قوم پر حق بھی بنتا۔ یہ پاوے بنا کر اور گنڈھے بیچ کر قوم کی خدمت نہیں ہوتی۔ قوم کی خدمت صرف ذہنی کام کرنے والے کرتے ہیں، ہتھیں کام کرنے والے نہیں۔"

کہنے لگا" ہاں جی، یہ بات تو آپ کی چالی سیری سولہ آنے ہے۔ دہاڑی تو میں لیتا رہا ہوں۔ پہلے پہل ڈیڑھ روپیہ روز، آخری دنوں میں ست روپے روز..... میرا ارادہ تو نہیں تھا خاص، وہ اپنے رشید خاں وکیل نے زبردستی بھیج دیا۔ السلام علیکم!"

میں نے کہا" وعلیکم السلام"

اور بابا ابراہیم ٹھنڈی ہوا کو کبا کبا کر ٹٹولتا ہوا لان سے باہر نکل گیا۔

خانگی سیاست

انجمن چوکی پر بیٹھی سوچ رہی تھی کہ اسے اپنے بچپن کا ساتھی رمدا یاد آ گیا جو اس کی جوتیاں بغل میں دبا کر اس کے پیچھے دم کٹے کتے کی طرح پھرا کرتا تھا۔ دن بھر میں صرف گھڑی دو گھڑی انجمن کا ساتھی بننے کے لئے اسے ہر وقت خوشامدیں کرنا پڑتیں، الٹی سیدھی چالیں چلنا ہوتیں اور اس کی کہنی کے پوڑھے کو کتنی ہی مرتبہ سہلانا پڑتا جس کا نہ تو انگوری ہی بھرتا تھا اور نہ زخم ہرا ہوتا تھا۔ آج اتنے سالوں بعد انجمن کو رمدا یاد آیا! بہت ممکن ہے یہ بچہ بھی رمدا کی طرح چماری لڑکیوں کی جوتیاں اٹھائے پھرے اور _____ اس کے بچے نے قلابازی لگا چاہی اور وہ درد سے بے تاب ہوگئی۔ چوکی پر لیٹ کر اس نے اپنی شنیل کی شلوار کے پائینچے اوپر کھینچ لئے اور ایک نظر سفید سفید پنڈلیوں کو دیکھا جن پر کوملبال سنہری سنپولیوں کی طرح کنڈلیاں مارے سو رہے تھے۔ آستینوں کے بٹن کھول کر اس نے باہیں چڑھالیں اور اپنے عریاں بازوؤں کو سونگھنے لگی۔ پسینے کی ہلکی سی مہک اس کی ناک کو کندھوں کی طرف کھینچ لے گئی اور وہ اسی کھیل میں مگن ہوگئی۔ " آج یہ کمبخت مجھے مار ڈالے گا" اس نے آہستہ سے کہا اور پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے ہونے والے بچے کی پوشیدہ شرارتوں سے دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی۔ " ناک میں دم کر رکھا ہے شریر نے، کاش یہ اتنا حسین بھی ہوتا جتنا من چلا ہے" اس نے ایک سانس بھری اور خود ہی اپنے آپ کو ڈھارس بندھا نے لگی" کیوں نہ ہوگا۔ باپ پر تو جائے گا ہی پتا پر گھوڑا _____ اور مجھ پر؟ مجھ سے تو حسن لے سکے گا تھوڑ بہت _____ " آج اسے اپنے حسن کا رہ رہ کر خیال آ رہا تھا۔ میدہ اور شہاب پنڈلیاں ایک دفعہ اس نے پھر دیکھیں اور خوش ہونے لگی، مگر بچہ تھا کہ اپنی جیسی کئے جاتا تھا۔ انجمن نے دو چار لمبے لمبے سانس کھینچ کر اسے ایسا دھتا بتایا کہ خاموش سو رہا۔ صحن خالی پڑا تھا۔ اس نے اپنے انگ انگ پر ہاتھ پھیرا اور ایک عجیب لذت محسوس کی۔ شادی سے پہلے یہ بات نہ تھی۔ چٹاخ سے غسل خانے کی چٹخنی گری اور قمر نچڑتے ہوئے بال تولئے میں لپیٹے باہر نکلی پھنسی ہوئی قمیص گلے کے پاس بھیگ چکی تھی اور پھٹی پڑتی تھی۔ اسے دیکھ کر انجمن نے اپنے کو سنبھالا۔ اٹھی اور پلنگ سے تولیہ اٹھا کر حمام کی طرف چل دی۔ قمر کا دل چاہتا تھا کہ کاش کوئی اس کے جسم پر ایسی برقی شعائیں چھڑک دے جو پل بھر میں سارے جسم کو میموں کی طرح سفید بنا دیں یا برص کے مریضوں کی طرح گلابی گلابی۔ اندر آ کر اس نے اپنی قمیص اتار دی اور پاؤڈر کا ڈبہ لے کر سنولائی ہوئی جلد پر پل پڑی۔ دن رات یہی ایک خیال تھا جو اسے گھن کی طرح کھائے جاتا تھا۔ " انجمن سفید ہے، گوری ہے، دودھ کی طرح چٹی ہے۔ " کبھی بھی

اس کا ذہن اس بات کو نہ سوچ سکا کہ انجمن کی ناک مانو پلی کی سی ہے، اس کے کان لمبے لمبے اور ہموار ہیں، چہرے کے مسام سیاہی چوس کی طرح اپنے دہن کھولے رکھتے ہیں اور چنیاں سی آنکھیں ہر دم جھپکتی رہتی ہیں۔ سفید تھی تو کیا ہوا، قبر کے سرہانے صلیب بھی تو سفید ہی ہوتی ہے۔

دونوں کی شادی ایک ساتھ ایک ہی گھر میں ہوئی، مگر ذرا بے ترتیبی کے ساتھ ..... یعنی انجمن جو چھوٹی تھی، اس کے بڑے کے ساتھ اور قمر جو بڑی تھی، وہ چھوٹے کے ساتھ باہی گئی۔ خالہ ساس بنی اور خالو سسر اور بچپن کے دھینگا مشتی کرنے والے بھائی اب خاوند قرار دیئے گئے۔

قمر کو اپنے نا سفید ہونے کا کافی احساس تھا اور انجمن کو اپنی ننھی ننھی زیرہ سی آنکھیں بہت بری لگتی تھی۔ دن میں بار بار دنبالہ دار سرمہ مگر وہ کمبخت زیرہ سے لونگ بھی تو نہ ہو سکتیں۔ رنگ سفید تھا اور بہت سیفد۔ ہر ایک نظر پہلے ادھری ہی پڑتی اور پھر اسی کے چہرے پر ٹک جاتی۔ یہی اس کی انتہائی خوشی کا موجب تھی۔ قمر گھر کے کام کاج میں ذرا ہاتھ بٹاتی تھی اور ہر نئے آنے والے کو اپنی خدمت سے موہ لیتی۔ ہر کوئی اپنے آرام کو دیکھتا ہے، کسی کی شکل کو نہیں..... اماں ایرانن ہانپتی کانپتی ادھر آتی تو قمر جھٹ پان لگا کر پیش کرتی۔

خوش باش بیٹی خوش باش_____ہو_____چہ کنم رنج وغم۔ مصائب زمانہ ہو بیٹا، عمرت دراز باد۔ بابا سلامت مالک سلامت _____خوش باش ہو_____چہ کنم، ہا_____اور_____اور_____بیا_____بیا قمر_____بیٹا_____چہ کنم _____ہو_____شادی، بیاہ، سہرا_____خوش روی سلامت روی۔ قمر خوب _____ سلامت سلامت!!_____اور پھر قمر اندر دوڑتی جاتی۔

شادی بیاہ ایسی دونالی بندوق ہے جسے چلتی ہوئی دیکھ کر لڑکیاں بہت خوش ہوتی ہیں اور پھر اس کی "دھائیں" سن کر یوں اندر دوڑ جاتی ہیں جیسے وہاں جا کر اس کی آواز اور بھی بھلی معلوم ہو گی۔ انجمن کہتی "پتہ نہیں باجی کو یہ اماں ایرانن کیوں پسند ہے۔ بوڑھی چھپکلی تھل تھل کرتی بد بودار عورت جس کے سینے میں لٹکتی ہوئی رسولی تیسری چھاتی معلوم پڑتی تھی_____ آخ تھو!_____ آخری باجی اس اماں میں ہے کیا جو تو اسے پان دینے دوڑتی ہے؟" انجمن پوچھتی اور پھر ہمہ تن گوش ہو جاتی۔ "بھئی سچی بات تو یہ ہے جو باجی کی تعریف کر دے، باجی اس کی۔" قالین پر لیٹا ہوا ابرار "حسین زمانہ" پڑھتا ہوا کہتا۔ انجمن ایک دم قہقہ لگائی جو اندھی چمگادڑ کی طرح چھوٹے سے کمرے کی چاروں دیواروں سے ٹکراتا۔ "ہوں" باجی چڑھ جاتی" مجھے تعریف سے کیا! ہمیں پونڈ تھوڑی مل جاتے ہیں۔"

"جبھی تو میں پوچھتی ہوں باجی"

"بڑی فتنی ہے تو انجمن!"

"کیوں باجی؟"

"کہ باجی سے ایسی بات پوچھتی ہے جو وہ بتا نہیں سکتی۔" ابرار پھر کہتا اور خوشی کی ایک کرن انجمن کے چہرے پر ناچنے لگتی۔

"تو ہماری باتوں میں دخل دینے والا کون ہوتا ہے بے؟" باجی پوچھتی۔ تو وہ پھر اپنا رسالہ پڑھنے لگتا۔ پھر ذرا خاموشی رہتی، جسے

ابرار ہی توڑتا۔" دیکھ انجمن! زنانہ حسن و آرائش کا سامان کتنا سستا فروخت ہو رہا ہے۔" وہ ایک اشتہار دکھاتا اور جب وہ رسالہ پکڑنے لگتی تو ہاتھ پیچھے کھینچ کر کہتا" چمکا لے اپنے منہ کو بلور کی طرح، تیرا خاوند بھی کیا یاد کرے گا کہ ابرار کی بہن سے واسطہ پڑا تھا"_____"چپ! بے

شرم" وہ ہاتھ کھینچ لیتی۔

"دل میں چاہے لڈو پھوٹ رہے ہوں۔ ہے ناں باجی؟" باجی پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگتی کہ اس کی ہاں میں ہاں ملائے یا نہ۔

امی کا بھی یہی خیال تھا کہ قمر کیسی ہی سہی' ہے اچھی۔ تھوڑا بہت کام تو کر دیتی ہے۔ کبھی روتا ہوا بچہ اٹھا لیا' کبھی چھالیہ کتر کر پان دان بھر دیا اور گاہے ماہے چھوٹے بچوں کا منہ بھی دھلا دیا۔ اور انجمن جو دن بھر میں تین پتلونوں کی ترپائی کرتی' چھ قمیضوں کے بٹن ٹانکتی اور دو چار چھوٹے چھوٹے پائجامے سیتی' کسی گنتی میں ہی نہ تھی کہ سارا دن بیٹھی بیٹھی ہی تو یہ کام کرتی تھی۔ وہ کام ہی کیا جو بیٹھ کر ہو جائے۔

مراد آباد والی خالہ آئیں تو انہیں انجمن بہت اچھی لگی۔ گوری چٹی چینی کی جاپانی گڑیا_________!

''صدقے جاؤں انجمن تو اب بہت خوبصورت ہو گئی۔'' انجمن بظاہر جھینپ گئی۔ قمر پاس ہی بیٹھی تھی' کٹاری سی لگی۔ اللہ میاں اور خالہ بی دونوں کو کوسنے لگی' بس چلتا تو انجمن کا سانس پی جاتی۔ دن بھر خالہ بی انجمن کے ہاتھ کے بنے ہوئے سوئیٹر اور اس کی سلائی کے نمونے دیکھتی رہی۔ قمر نے بھی نہایت مشقت کا نکالا ہوا کریپ کا ایک دوپٹہ چمڑے کے بکس سے نکال کر پاس پڑے ہوئے بڑے ٹرنک پر ڈال دیا کہ شاید بھولے سے خالہ کی نظر ادھر بھی پڑ جائے' مگر وہ پڑتی ہی کیوں! رات کو سوتے وقت انجمن نے کہا'' خالہ بی اچھی ہیں بے چاری_______ کیوں باجی؟''

''ہیں'' قمر نے چونک کر پوچھا اور پھر ایک ٹھنڈی سی ''ہوں'' کر کے خاموش ہو گئی۔

''اگلے وقتوں کی ہیں سیدھی سادی سی!

''ہاں!''

''وہ پیراشوٹ کی قمیض کا جو گلا میں نے بنایا تھا' خالہ اس کی بہت تعریف کر رہی تھیں۔ کیا ہے بھلا باجی پھانسی کا پھندا سا' مجھے تو ذرا بھی پسند نہیں۔''

''کیوں؟'' قمر نے چونک کر پوچھا'' بہت اچھا ہے۔ ایسے ہی تو ہوتے ہیں گلے۔''

انجمن جل گئی کہ باجی نے قرار واقعی داد نہیں دی اور باجی سوچ رہی تھی کہ اب یہ لڑکی خطرناک ہوتی جا رہی ہے۔ شکل کے ساتھ ساتھ لوگ اس کے کام کی بھی تعریف کرنے لگے ہیں۔ ایک نامعلوم کرب سا تھا جو اس کی روح کو فنا کئے جا رہا تھا_____ جس نے اس کی برتری کے لباس کو پھاڑ دیا تھا اور اب کسی اور کی تعریف تپے ہوئے لوہے کے پترے کی طرح اس کے جسم سے چمٹ جاتی تھی۔ اسی دن شام کو انجمن کے ہاتھ ٹنکچر آیوڈین کی پورے بارہ اونس کی بوتل چھوٹ کر ٹوٹ گئی۔ امی کی زبان کا ٹانکا ٹوٹ گیا۔ وہ بے نقط سنائیں کہ شیطان

بھی پناہ مانگنے لگا۔ خالہ بی نے لاکھ صفائی پیش کی مگر اپنا سا منہ لے کے رہ گئیں۔ انجمن بستروں کے ڈھیر میں دھنس کر رونے لگی اور قمر نے زمین پر بکھرے ہوئے کانچ کے ٹکڑے پہلے ایک کاغذ پر جمع کئے' پھر ردی کے ڈھول میں پھینک آئی۔ سارے کمرے میں آیوڈین کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی جہاں قمر ایک جہاندیدہ نرس کی طرح پھر رہی تھی۔ جوں جوں انجمن سسکیاں بھرتی' اس کے دل کا غبار دھواں بن کر چھسک! چھسک!! کرتا ہوا اوپر کو اٹھتا اور وہ اپنے آپ کو ہلکا محسوس کرنے لگتی۔

دو چار دن بعد خالہ نے قمر کی اہمیت کو محسوس کیا۔ وہ وقت بے وقت اٹھنے پر گریز نہ کرتی۔ رات کو گھر بھر کی کنڈیاں کھٹکے چڑھا کر سوتی۔ سر شام ہی سے مکان کا کونا کونا نیولے کی طرح سونگھتی اور باہر جانے والی موریوں میں اینٹیں پھنسا دیتی۔ رات کو کوئی بچہ منمنایا اور اس نے لپک کر اٹھا لیا۔ کبھی موقعہ ملا تو خالہ بی کے پاؤں بھی داب دیئے۔ اب وہ قمر کی طرف داری کرنے لگی تھیں۔ گو دونوں بہنوں کی در پردہ کھٹک سے بخوبی واقف تھیں مگر اپنا الو سیدھا کرنے کا موقع دیکھ کر اس رنگ میں ڈھل جاتیں۔ دوپہر کو قمر ڈلی کتر رہی تھی۔ خالہ کو پان کی سخت طلب لگ رہی تھی۔ امی بچی کو گود میں ڈالے تذکرۃ الاولیاء پڑھ رہی تھیں اور انجمن فرش پر بیٹھی فراک سی رہی تھی۔ خالہ منہ پکا کر کے کہنے لگیں "بھئی خدا کی خدائی اور محمد کی بادشاہی میں کہوں پر کہوں قمر جتنا کام آج کی کوئی لونڈیا بھلا کیا کرے گی۔" انجمن نے یوں محسوس کیا جیسے خالہ نے پیک بھرا تھوک اس کے منہ پر اگل دیا ہو۔ آخر کیا کام کرتی ہے قمر؟ سارا دن قمر' ساری رات قمر۔ کڈ کڑے مارتی پھرتی ہے' پھر کلونتی کی کلونتی۔ آنکھ نہ ناک بنو چاند کی سی۔ اس کا دل چاہا کہ ساری باتیں پکار کر کہہ دے مگر اس جگہ تو سبھی لوگ موجود تھے۔ خود باجی بھی وہیں موجود تھیں' وہ کہتی تو کیسے؟ اور خالہ نے پان لے کر ظلم جو کیا تو پلنگ سے نیچے اتر کر فرش پر بیٹھ گئیں' کلی میں بیڑا دبا کر اگالدان میں پچکاری چھوڑی پھر دو فراک ہاتھ میں پکڑ کر بولیں "بس رات بھر ممیائی اور ایک بچہ بیائی ____ صبح سے لے کر اب تک یہی دو فراک!" قمر ہنسنے لگی۔ انجمن کے لئے زمین سخت اور آسمان دور والا معاملہ تھا۔ منہ نیچے کر کے مشین کی ہتھی زور سے گھمانے لگی۔ خالہ نے گھڑی کے سامنے کھڑی ہوئی قمر کو دیکھا۔ روشنی سلاخوں سے گزر کر اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور اس سے اس کی آنکھوں کے موتی اور چمکنے لگ گئے تھے۔ اس نے ایک دفعہ کوشش بھی کی کہ اٹھ کر پاؤں پر سر رکھ دے اور شبیر کے لئے رشتہ مانگ لے' مگر اٹھ نہ سکی۔ اسے معلوم تھا کہ سب جانتے ہیں شبیر بیڑی پیتا ہے۔ گلے میں سرخ رومال اور ہاتھ میں سیاہ ڈنڈا رکھتا ہے' کندھوں تک گھنگھریالے بال چھوڑ رکھے ہیں اور ستھروں کے ساتھ مل کر "پیسہ ہی رنگ روپ ہے پیسہ ہی مال ہے" گاتا ہے۔ خالہ جلدی جلدی پان چبانے لگی اور کھڑکی کے سامنے کھڑی ہوئی قمر کو تکنے لگی جو اب ذہنی طور پر اس کی بہو بن چکی تھی۔

جلیل بھائی سے اپنے بچے کا علاج کرانے یہاں آئے تو چند دن میں ہی قمر کی خدمت گزار طبیعت کو بھانپ لیا۔ وہ انہیں ہر صبح شیو کے لئے گرم پانی کر دیتی۔ چائے بنا کر لاتی۔ بوٹوں کو پالش بھی کر دیتی اور ہر شام سونے سے پہلے بجلی کی استری گرما کر ان کی چمڑہ قسم کی پتلون پر استری پھیر دیتی۔ ایک شام انہوں نے سینما چلنے کو کہا۔ قمر جھٹ سے برقعہ پہن کر تیار ہو گئی اور انجمن کو اسی طرح کھڑے دیکھ کر بولی "انجمن! چلو سینما چلتی ہو؟" اس نے جلیل بھائی کو یہ کہنے کو موقع ہی نہ دیا اور جب اس نے ساتھ جانے کی رضامندی ظاہر کی تو برقعہ لہراتی ہوئی جھٹ پٹ باہر نکل آئی جیسے اپنی دعوت کی غلطی کا مداوا کر رہی ہو۔ انجمن نے کھڑکی سے دیکھا' ان کا تانگہ بہت دور جا چکا

تھا۔''دونوں سو رہیں'' اس نے آہستہ سے کہا اور بستروں کے انبار میں جا کر لیٹ رہی۔ پھر اٹھی اور قمر کی تصویر اس کے بکس سے نکال کر زمین پر پھینک دی۔اس پر پاؤں رکھ کر دیر تک کھڑی رہی' بعد میں ٹھوکر مار کر کنستروں کے پیچھے پھینک دی۔

ایک انہونی سی نفرت تھی جو دونوں طرف سے شعلے کی طرح لپک رہی تھی۔یوں تو دونوں دن بھر اکٹھی کھاتی پیتیں اور ساتھ ساتھ سوتیں پر ان کے درمیان ہزاروں فرسنگ کا فاصلہ تھا جو کسی صورت بھی قرب میں بدلتا نظر نہ آتا تھا۔بچپن سے لے کر جوانی تک تو ان کی زندگی اچھی رہی۔ چھینا جھپٹی اور مار پیٹ میں وقت گزر گیا' لیکن اب سکون کا ایک لمحہ بھی کاٹے نہ کٹتا تھا۔ان کے اس ناقابل عبور بعد کی ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی تھیں جو ایک کی موجودگی میں دوسری کی تعریف کر دیتے اور وہ بھی اس رنگ میں کہ دوسری انگاروں پر لوٹنے لگے۔

قمر بیمار پڑی اور ایسی کہ جان کے لالے پڑ گئے۔تپ محرقہ اس خاندان میں جس جو چڑھتا' لحد میں لے کر اترتا۔گھر بھر میں فکری کی لہر دوڑ گئی۔امی بیچاری دن بھر اس کے پاس نہ بیٹھ سکتیں، چھوٹے چھوٹے بچے تھے اور مرض متعدی! انجمن کو بھی فکر پڑی۔ڈاکٹر نے جواب دے دیا۔باجی کے بال جھڑ رہے تھے اور آنکھیں چپکی جا رہی تھیں۔انجمن اپنی سرد مہری پر بہت نادم ہوئی۔رات بھر لحاف میں منہ چھپا کر روتی رہی۔"اگر باجی مر گئی! اگر باجی مر گئی تو اس کا خون کس کی گردن پر ہوگا؟" رات بھر یہ آوازیں اس کے کانوں میں گونجتی رہیں، جیسے کوئی دیوانہ کسی کھنڈر میں اونچے اونچے ہنس رہا ہو۔پھر مری ہوئی باجی کا دھویا دھایا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور قمر کے بستر کی طرف دیکھنے لگی۔اس کے سرہانے مدھم سا بلب جل رہا تھا اور وہ کروٹ بدلنے کی کوشش کر رہی تھی۔انجمن اس کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔" کیوں کیا ہے باجی؟"

قمر نے آنکھیں کھول دیں اور اس کی طرف دیکھ کر لبوں پر زبان پھیرنے لگی۔تپائی پر پڑے ہوئے چینی کے پیالے مین سے انجمن نے پانی سے تر رومال اٹھایا اور اس کے لبوں میں ٹپکا دیا، پھر اس کے سرہانے بیٹھ کر سر دبانے لگی۔باجی تو ایک دم بدل گئی ہے،اس نے سوچا اور اس کے ساتھ لیٹنے کی خواہش عود کر آئی، مگر اس کا مرض خوف ناک تھا۔انجمن نے اپنی جان کو پیار سے دیکھا اور وہ خیال چھوڑ دیا۔

دوسرے دن چچا ابا عیادت کے لئے آئے۔چند لمحے قمر کے پاس بیٹھے حقہ گڑگڑاتے رہے۔شام کو پھر مریض کے پاس ایک چکر لگا کر گھر چلنے کو تیار ہوئے تو دکھی دل بن کر کہنے لگے "میری اس رام گنو کو تو اللہ کبھی بیمار بھی نہ کرے۔گھر کی رونق اجڑ گئی ہے۔اب یہاں کوئی پانی تک کو تو پوچھتا نہیں نہ کوئی اس آنکھ منڈی کے پاس آ کر بیٹھتا ہے۔پتہ نہیں اس گھر میں قمر سے ہمدردی کرنے والا بھی کوئی ہے کہ نہیں!""

وہ تو یہ کہہ کر چلے گئے مگر انجمن کو تکنے کے لئے چھوڑ گئے۔تھوڑی سی ہمدردی جو باجی کے متعلق اس دل میں پیدا ہو چکی تھی، بھک سے بارود کی طرح جل بجھی اور وہ قمر سے اتنی ہی دور ہو گئی جتنی پہلے تھی۔امی، ابا، ابرار حتیٰ کہ ماما نے بھی اس کے رویہ کو بری نظروں سے دیکھا مگر وہ قمر کے بستر کے پاس تک نہ پھٹکی۔اٹھائیسویں دن کہیں جا کر قمر کا بخار اترا۔اب وہ بہت نحیف ہو گئی تھی۔سر کے بال جھڑ چکے تھے۔دن بھر پلنگ پر لیٹ بٹر بٹر ہر آنے جانے والے کو تکتی رہتی۔گھر کے لوگ اس کی موت سے بے خوف ہو گئے۔امی بہت کم اس کے پاس بیٹھتیں۔اب وہ بیمار نہیں تھیں، کمزور تھی۔گھر کا تھوڑا سا کام انجمن نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔اب وہی اماں ایرانن کو پان

بنا کر دیتی۔ خالو ابا کے حقہ اور پان کا انتظام کرتی۔ امی کے بچوں کا منہ دھلاتی اور ماما کو دال بگھارنے میں مدد دیتی۔ سب اس کے حسن اور حسن انتظام کی تعریف کرنے لگے۔ اسے قمر سے محبت ہوگئی۔ وہ اس کے لئے جئی کا دلیہ پکاتی۔ کوئیکر اوٹس دودھ میں ابالتی اور خود اپنے ہاتھوں سے باجی کو کھلاتی۔ انسان کی یاداشت بہت کمزور ہے' وہ ماضی کو بہت جلد بھول جاتا ہے۔ لوگوں کو قمر کی دیرینہ خدمت بھول گئی' وہ انجمن کی محبت کے گن گانے لگے اور انجمن کی حیثیت قمر کے لئے بڑھتی گئی' بڑھتی گئی۔

خالہ نے جہاں قمر کو مانگا تھا' وہاں انجمن کا رشتہ بھی کھلوالیا۔ سعید اب شادی کرنے پر رضا مند ہوگیا تھا۔ اپنے چھوٹے بھائی کی منگنی کے بعد اسے بھی خیال پیدا ہوا کہ کہیں تکلف میں عمر بھر کنوارا ہی نہ رہ جاؤں۔ اس وجہ سے اسے انجمن ملی۔ دونوں بہنوں کے ڈولے ایک دم اٹھے اور ایک ساتھ اترے۔ دیکھنے والیوں نے انجمن کو پسند کیا۔ کیا لڑکی ہے، جانو سنگ مرمر کی جیتی جاگتی مورت۔ ایسی بھی تھیں جنہیں قمر کی مشرقی تراشیں پسند آئیں مگر وہ بہت تھوڑی تھیں۔ جو کوئی آتا، انجمن کے حسن کی تعریفیں کرتا۔ قمر سنتی، خار چھوڑ کٹار کا زخم لگتا۔ ایک دو چکر بھو بنے گزر گئے تو قمر نے باورچی خانہ میں جانا شروع کیا۔ مغلانی سے محبت کی پینگیں بڑھالیں اور رات کو خالہ کے پاؤں دبانے لگی۔ وہ تھٹیا کی ماری اوپرسے تو نہ نہ کرتی رہتیں مگر پہلو بدل بدل کر قمر کی خاصی "ٹرائی" لیتیں۔ انجمن اور اس کا خاوند بڑے مزے سے سوتے رہتے اور جب قمر کا شوہر شام کا کھانا کھانے کے بعد چکر لگا کر گھر واپس آتا تو قمر کو اپنی والدہ کے پاؤں دباتے ہوئے دیکھ کر بہت کڑھتا۔ وہ بھی اس کے ساتھ بیٹھ کر تلوے سہلانے لگتا اور کبھی کبھی اپنا ایک ہاتھ تھام کر اس کی پسلیوں میں ٹھوکے دینے لگتا۔ قمر ہاتھ سے پرے دھکیلتی تو وہ اور شیر ہوجاتا اور اس کی ران میں پھنسی ساٹن کی شلوار پر زور سے چٹکی بھرتا تو وہ تڑپ اٹھتی۔ وہ پھر تلوے سہلانے لگتا۔ ذرا دیر کے بعد پھر یہ کھیل شروع ہوجاتا تو اس کی والدہ گھبرا کر کہتیں "بس بھئی اب تم سو جاؤ۔ ہاں بس! اب آرام ہے، بہت آرام۔" وحید ایک دم اٹھ کھڑا ہوتا اور قمر بدستور دبائے جاتی۔ اسے اگر قمر سے کوئی شکایت تھی تو یہی کہ وہ اس کے سب کاموں میں سے "ذرا ادھر تو آنا" کو بہت دیر سے مانتی ہے۔ انجمن کو پتہ بھی نہ تھا کہ خالہ گھٹیا کی مریض ہیں اور انہیں پاؤں دبوانے کی بھی ضرورت ہے۔ وہ تو باتوں باتوں میں ہی چوم چاٹ کے چھوڑ دیتی۔ اس کے خاوند نے آج تک اپنی والدہ کی ٹانگیں چھو کے بھی نہ دیکھی تھیں کہ چورس ہیں یا گول!

جسے ہر روز آرام ملے، وہ آرام دینے والے کے گن گیوں نہ گائے۔ والدہ قمر کی تعریفیں کرنے لگیں۔ "طبعیت کی بہت اچھی ہے قمر" سے شروع ہو کر بات "ہوا انجمن نخرے پیٹی تو دن بھر اپنے بناؤ سنگار میں ہی لگی رہتی ہے" تک جا پہنچی۔ گھر کی فضا پہلے مٹیالی سی ہوگئی اور پھر سیاہ! امڈ گھمڈ کر بادل آئے اور تل دھار بارش ہونے لگی۔

"خالہ جان مجھے ہر وقت بولیاں مارتی رہتی ہیں۔" انجمن نے ٹسوے بہاتے ہوئے کہا۔

"مگر کیوں؟"........باجی........باجی"

"باجی کیا؟"

"باجی........ قمر باجی........ پتہ نہیں کیا کیا کہتی ہیں ان سے؟"

"یہ باجی بھی عجیب ہے تمہاری!"

"عجیب ہی تر ہے۔ ہر ایک کو بھاڑے۔ یہ ڈال لیتی ہے......بھیا کو دیکھو کیسے تل چاٹتے ہیں بنو کے۔"

"میں تو سمجھتا تھا قمر سیدھی سادھی ہے بچاری۔" سعید نے سوچتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی ایک ہی کہی، بالی اور سیدھی۔ یہ آپ سے کس نے کہا؟" انجمن نے بن کر پوچھا۔

" کہا تو کسی نے بھی نہیں پر میں نے خود ہی محسوس کیا۔ بچاری دن بھر ادھر ادھر آہلی گیلی جو بھرتی ہے۔ میں تو یہی سمجھتا رہا۔"

" آہلی گیلی، واہ! کنسویاں لیتی پھرتی ہے۔ اس کے پھپڑوں لالوں میں نہ آ جانا۔" تو سعید متحیر ہو کر ادھر ادھر تکنے لگا۔ اس کا چہرہ اب قدرے محتاط دکھائی دیتا۔ کھونٹی پر لٹکے ہوئے کوٹ سے ایک سگریٹ نکالکر سلگائی اور پھر انجمن کی ران پر سر رکھ کر کش کھینچنے لگا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا اور انجمن اس کے بالوں میں انگلی کئے جاتی تھی۔ گھر کے کام میں قمر ہی کو دخل تھا۔ خالہ کا کوئی مشورہ اس کے بغیر طے نہ ہو سکتا تھا۔ باورچن اسے ہر بار نعمت خانے میں بلا کر پوچھتی "بی بی بھنڈی میں پانی تو نہ ڈالوں؟" حالانکہ اسے چالیس سال پہلے کا پتہ تھا کہ بھنڈی میں پانی نہیں ڈالا کرتے۔ نصیر کو نئی کاپی خریدنا ہوتی، لٹو لانے کی ضرورت پڑ جاتی یا کنکوا چڑھا چڑھانے کو دل چاہتا تو پیسے قمر وباجی سے ملتے۔ گوالا بھینسوں کے لئے بھوسہ چوکر لاتا تو باجی کو حساب دیتا۔ دھوبن کے کپڑے وہی لکھتی۔ درزی، قصائی، نائی، کنجڑہ، دھنیا، تیلی سب باجی بیگم سے درخواست کرتے اور اپنی محنت انہی سے وصول کرتے۔ وہ جہاں ان کا ایک آنہ ضبط کر لیتی، وہاں دو آنے کی مزید رعایت بھی دے دیتی۔ وہ سب اس کی دریا دلی کے معترف تھے اور جہاں اکٹھے مل بیٹھتے، قمر کی تعریف ضرور کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ بڑی بہو تو کسی بڑے گھر کی بیٹی ہے۔ اپنی بیویوں سے ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے "خدا بخشے دلاور حسین خان کی سگی بیٹی معلوم ہوتی ہے۔ وہی دل گردہ، ویسا ہی رعب دا اور ویسا ہی نرم دل۔" قمر کی ہر دلعزیزی کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور انجمن کا تنگ۔ گاؤں کے لوگ کچھ تو پہلے ہی سے گورے رنگ کے خلاف ہوتے ہیں، کچھ انجمن کی طبعیت بھی ایسی ملنسار نہ تھی کہ ہر ایک کے من میں کھب جاتی۔ سعید کو ایک ضروری کام سے باہر جانا پڑا۔ وہ چلا گیا تو انجمن سے بات کرنے والا بھی کوئی نہ رہا۔ اپنے کمرے میں منہ سر لپیٹے پڑی رہتی۔ قمر کی مقبولیت کا ڈنگا گھر سے باہر بھی بج رہا تھا۔ انجمن کو اس طرح ناکام دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی اور انجمن سے اس کا پیار بڑھ گیا۔ وہ دن بھر اسی کے کمرے میں گھسی رہتی اور ہنستے ہنسانے کی باتیں کرتی مگر انجمن کا سل تو بجھتا ہی جا رہا تھا.....اس موم بتی کی طرح جو گھٹتے گھٹتے بالکل بجھ جاتی ہے اور دھوئیں کہ لکیر ننھی پری کی روح کی مانند بل کھانے لگتی ہے۔ قمر ابھی بات بھی مکمل نہ کر پاتی کہ باہر سے آوازیں پڑنا شروع ہو جاتیں اور وہ بظاہر مجبوریاں دکھاتی، مصروفیت کو کوستی باہر چلی آتی۔

انجمن کو اچانک پسلی درد کے دورے شروع ہو گئے، جو کسی علاج سے بھی نہ رک سکے۔ میٹھے تیل سے لے کر کارڈی مم آئیل تک کی مالش ہوئی۔ جلدا چٹ گئی مگر درد نہ رکا۔ خالد کو بہت فکر ہوئی۔ مغلانی روز روز کوئی نئی دوائی لے کر آتی۔ بر لیٹھن نے ایک پوربی نسخہ بتایا۔ قصائی نے اپنے بیوی کے ہاتھ خصی بکرے کی چربی بھیجی۔ اس نے اپنی لڑکی سے جوان کے ہاں قرآن شریف پڑھنے جاتی، بہو کی بیماری کا حل سنا تھا اس کا دعویٰ تھا کہ دوسرے سے تیسرا دن نہ ہوگا۔ چربی میں لونگ، الائچی، جائفل کڑ کڑایا گیا۔ پھر اس قوام کی مالش ہوئی مگر درد بڑھتا ہی گیا۔ خالد کو خدشتہ تھا۔ ایک تو انجمن دو جی سے تھی، دوسرے اس کا جسم اتنا نازک تھا کہ ہوا کے جھونکے سے ڈھنٹل کی طرح ٹوٹ

جائے۔ وہ دن بھر اس کے کمرے میں بیٹھی رہتی۔ خانہ داری کا سارا کام مکمل طور پر قمر کے کندھوں پر آ گیا۔ انجمن بستر میں بیٹھی دودھ ملائی کھاتی اور وہ سارا دن ادھر سے ادھر گھومتی رہتی۔ اب اسے انجمن پھر بری لگنے لگی تھی ـــــــ پرنچی چڑیا سی فرنگن بندریا۔ مگر صرف بری لگنے سے کیا ہوتا ہے۔ جو کوئی آتا، انجمن کا حال پوچھتا۔ ہمسایہ عورتیں گھر میں داخل بعد کو ہوتیں، پہلے انجمن کی خیریت اور اس کی صحت کی دعائیں مانگنے لگتیں۔ قمر جھلا اٹھی تھی۔ اس کا ساتھ دینے والا کوئی نہ تھا اور نہ وہ پکار پکار کر کہتی انجمن بیمار نہیں، بہانے کرتے ہے۔ اسے کوئی روگ نہیں کوئی تکلیف نہیں، اڑان گھائیاں بیماری ہے تو وہ بھوکے گھوڑے کی طرح ہنہنا کر ہنسنے لگا" بھئی یہ عورتوں کی بیماریاں تم ہی جانو، ہمیں کیا خبر۔" قمر جل گئی۔ لحہ بھر کو اس کا خاوند بھی اس کے دل سے اتر گیا۔ وہ پلنگ پر بیٹھ کر انگلیاں چٹخانے لگی۔ کوئی بات نہ تھی جو وہ کرتی۔ ایک یہی خیال تھا جو روپ بدل بدل کر اس کے سامن راس دھاریوں کی طرح ناچ رہا تھا۔

"ادھر دیکھنا مت" اس کے خاوند نے ڈھیلا منہ کر کے کہا" ہم تنبا پہننے لگے ہیں۔" پھر وہ سیٹی بجانے لگا اور چر چراتے ہوئے پلنگ پر دھم سے گر کر بولا" لو بھئی، اب دیکھ لو۔" مگر جب وہ اسی طرح بیٹھی رہی تو اسے فکر ہوئی مبادا وہ اس سے روٹھ گئی ہو۔ چارپائی سے اٹھ کر وہ اسے اپنے ساتھ لوا لایا اور منہ اونچا کر کے پوچھنے لگا:

"ہم سے روٹھی ہو؟"

"نہیں"

"تو پھر کیا بات ہے؟"

" کچھ بھی نہیں"

" کچھ تو ہے۔"

"اوں ہوں"

"تو پھر یہ خاموشی کیوں؟"

"ایسے ہی"

"ایسے ہی؟ ارے بھئی ایسے کیوں آخر کس لئے؟ لوگ دیکھیں گے تو کیا سمجھیں گے۔"

" کیا سمجھیں گے؟"

" کہ دونوں میں تناتنی ہے۔"

"پڑے سمجھیں"

"اچھا جی! تو گویہ کچھ بات ہی نہیں ـــــــ میں نے کہا میری جان آخر ماجرا کیا ہے؟"

" کچھ نہیں بابا، مجھے سونے دو۔"

"پھر وہی بابا! دیکھو اتنے دنوں سے ہمارا نکاح ٹوٹ رہا ہے اور تم کچھ دھیان ہی نہیں دیتی ہو۔"

وہ ہنسنے لگی تو اس نے قمر کی پسلیوں میں انگلیاں دے دے کر اسے اور ہنسانا شروع کر دیا۔ جب یہ کیفیت ختم ہوئی تو قمر پھر رونکھی ہو بیٹھی۔ "اچھا ہے اگر خدا ہماری پسلی میں بھی درد پیدا کر دے۔"

" کیوں؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بس یونہی دل چاہتا ہے انجمن کی طرح"

"خدا سے ڈرو!"

"خدا سے ڈرو!"

"ڈر کر ہی تو یہ کہہ رہی ہوں۔ سارا دن بڑی مزے کرتی ہے اور میرے سعید بھیا جیسا بال باندھا غلام ملا ہے سونے پر سہاگہ۔ کیا مجال جو بنو سے ایک کام بھی کروائیں، مجھی کو ہر جگہ جھونکتے ہیں۔ دن میں دس دوست لے آئیں بیس لے آئیں، ان کو بلا سے۔ قمر سلامت رہے۔ پیس موئی پکا موئی، آئے لوٹھے کھا گئے۔ اور انجمن کے بھی ٹیس اسی وقت اٹھتی ہے جب سعید بھائی صحن میں گنگنا رہے ہوں۔"

"تو کیا انجمن واقعی بیمار نہیں؟" وحید نے حیران ہو کر پوچھا۔

"نہیں"

"جھوٹ! وہ تو ہر دم درد سے کراہا کرتی ہے اور تم..... نہیں بھئی ____ یہ نہیں ____ یہ جھوٹ ہے ____"

"جھوٹ! ہاں جی میری باتیں تو جھوٹ ہی ہوتی ہیں۔ واہ کیسا منہ پھاڑ کے کہہ دیا جھوٹ ____ میں کہتی ہوں اگر جھوٹ نکلے تو تھومتے تیروں سے اڑا دینا۔"

"نہیں بھئی، ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"ہاں جی ہو سکتا ہے بھلا۔ شرط بدتے ہیں؟ لائیے بارہ گنا لکھتی ہوں۔"

" مگر ____ مگر ____ بھئی یہ تمہاری باتیں تم ہی جانو۔"

دوسری صبح جب وحید سو کر اٹھا تو اسے سعید بھیا زہر لگتے تھے۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ان کی ریاکاری کا پول کھول دے اور ان کے دل میں دبی ہوئی خواہشات کا مرقع چوراہے میں ٹانک دے۔ ان کے انجمن کو لکھے ہوئے خطوط گھر کی ساری دیواروں پر چسپاں کر دے، مگر وہ ایسا کر نہ سکا۔ اسے سعید بھائی پر رحم آ گیا۔ وہ ان سے ڈر گیا۔

غسل خانے میں پھسلن تھی۔ انجمن کا پاؤں جو رپٹا تو پانی سے بھری ہوئی نافذ پر گر پڑی۔ کنارا تیز تھا، کان کے نیچے جبڑا چر گیا۔ تسلے کا پانی عنابی ہو گیا۔ کون تھا کہ برساتی نالے کی طرح امڈا چلا آتا تھا۔ قمر نے دیکھا تو بھاگ کر اسے اٹھایا، پھر سہارا دے کر دالان میں لے آئی۔ خالہ نے سر پیٹ لیا۔ کریمن کو پتہ چلا تو وہ باورچی خانہ سے صدقے واری کرتی دوڑی۔ کلے سے خون بہتا دیکھ کر بولی " کیا ہو گیا میری بنو کو؟ ہے ہے چاند سے چہرے پر داغ پڑ گیا۔" اور قمر جو دوسرے کمرے میں پٹی پھاڑنے لگی تھی، کپڑا پرے پھینک کر بڑبڑاتی باہر نکل گئی۔ "ہوں داغ پڑ گیا چاند پر جیسے چاند ہی تو تھی۔ شکل تو دیکھو، پتہ نہیں دنیا کو کیا ہوا ہے۔ پھر وہ باورچی خانہ میں جا کر کام کرنے لگی۔ اور

جب کریمن واپس آئی تو اس پر برس پڑی۔" آج پھر ہنڈیا میں نمک زیادہ ڈال دیا۔دیکھتی نہیں ہو برتن کس طرح بکھرے پڑے ہیں۔کچھ تو خیال چاہیے،آخر دام لگے ہیں ان پر۔یہ مصالحہ دانی کم بخت تو کبھی ڈھک ہی نہ سکی۔اسی خانے میں لونگ تو اسی خانے میں چوہوں کی مینگنیں۔آخر تمہیں ہوا کیا ہے۔" منہ بسور کر بولی" سارا الزام مجھی ٹھڈا ٹوٹی کو دو۔بھ بی،غلام حسین بھی تو ہے۔اس دیدوں پھوٹے کو کوئی نہیں پوچھتا۔صبح کی کہو تو شام کی خبر لاتا ہے۔اب بھی دیکھ لو پتہ نہیں کہاں مرا ہوا ہے۔میں اللہ ماری اتنے جوگی کہاں کہ ہنڈیا چڑھا کر ادھر ادھر کے کام بھی کرتی پھروں۔" پھر وہ میلے دوپٹے سے جھوٹ موٹ اپنی آنکھیں پونچھنے لگی۔جتنے عرصہ میں انجمن کے زخم کے کنارے ملتے گئے،دونوں بھائی دور ہوتے گئے اور وحید نے تو والدہ سے یہ بھی کہہ دیا کہ اب وہ اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔ادھر انجمن بھی یہی کوشش کرتی رہی کہ سعید بھی یہی بات کہہ دے مگر وہ ابھی کترا تا رہا تھا۔

پھر وہ دن آیا جس کی بڑی دیر سے آرزو تھی۔انجمن کے ایک لڑکا پیدا ہوا____ نہایت خوبصورت،چینی کا باوا۔اس کی ناک اونچی تھی اور آنکھیں بڑی بڑی۔وہ اپنے باپ کی طرح صحت مند اور سرخ وسپید تھا۔قمر ننھے بھانجے کی آمد پر بہت خوش ہوئی۔اسے اٹھا کر چومتی رہی۔اس کی بھنچی ہوئی مٹھیاں کھولتے وقت اس سے تلاّ تلاّ کر باتیں کرتی رہی۔بچے اسے شروع ہی سے پسند تھے اور پھر یہ تو انجمن کا بچہ تھا.....اس کی اپنی بہن کا بیٹا،یہ کیوں نہ اچھا لگتا!

سردیوں کی طویل راتوں میں ڈھولک ڈھمکتی رہتی اور ایک ہی چارپائی پر بیٹھی ہوئی چھ عورتیں پان کھاتی رہیں اور" بچا گیریاں" گاتی رہیں۔قمر انجمن کی چارپائی کے ساتھ لیٹی تھی اور بچہ اسی کے ساتھ سو رہا تھا۔جب عورتیں ایک لمبی سر لگاتیں۔

میرے بابل کو لکھنو سندیس جنڈولا آج ہوا

تو قمر کا کلیجہ منہ کو آجاتا۔اس کا بابل پردیس میں تھا اور اس کی انجمن کے گھر لڑکا پیدا ہوا تھا۔اور جب وہ گا کر یہ کہتیں

بابل ہمارے راجہ کے چاکر برن بالے بھیس

جنڈولا آج ہوا

تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے یہ گیت انہی کے لئے لکھا گیا ہو۔واقعی ان کا باپ سرکاری دفتر میں ملازم تھا۔پر یہ گیت انہیں کیوں سنایا جا رہا تھا ؟کس لئے؟قمر رجائی میں منہ چھپا کر رونے لگی اور اسے وہ رات یاد آگئی جب اس کے ابا اس کے لباس کے کئے چاندی کے جھمبر جھمبر کرتے آویزے لائے تھے تاکہ صبح اٹھ کر وہ سب سے بڑھ چڑھ کر عید منا سکے۔اور وہ صرف اس وجہ سے بستر میں دب کر رونے لگی تھی کہ رات ختم ہونے میں نہ آتی تھی اور صبح عید کا کوئی نشان نہ تھا۔اس رونے اور اس رونے میں کتنا فرق ہے،اس نے اندازہ لگایا اور کروٹ بدل لی۔عورتیں اب بھی بچا گیریاں گا رہی تھیں۔اتنے سارے آنسو بہا لینے کے بعد اب اسے سسکیاں آنے لگی تھیں اور ان سسکیوں میں اسے ننھے بچے کے سانس لینے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ان گنا مہینہ تھا۔اس نے اپنے پہلو پر ہاتھ پھیرا اور ہنستا ہوا گول مٹول لڑکا ریں ریں کرتی ضدی لڑکی میں تبدیل ہو گیا۔اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور رضائی اور اوپر کھینچ لی۔ایک سال میں ایک ہی گھر دو لڑکے کہاں پیدا ہو سکتے ہیں!اس نے اندازہ لگایا اور پھر خود ہی اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دینے لگی کہ اگلے سال میرے ضرور لڑکا پیدا ہوگا۔اب انجمن کے

ساتھ کوئی پرخاش نہ تھی۔قدرت نے جواسے اس نعمت سے نوازا تھا،وہ کون ہوتی ہے مین میخ نکالنے والی۔پھراس کا انجمن سے خار کھانا سب کو کھٹکنے لگتا۔وہ لڑکے کی ماں بنی تھی۔سب قدر کرتے تھے،اورواقعی سب کو کرنی چاہئے تھی۔قدرت نے اہمیت کے میدان میں انجمن کا ساتھ دیا۔وہ جیت گئی۔اب قمراس کی فتح پر نالاں نہیں تھی۔اتنی بڑی مدد سے بھی نہ جیتی!

بیس دن بعد ہی انجمن پلنگ کو لات مار کر اٹھ کھڑی ہوئی۔اس دوران قمراس کے گن گانے والوں میں سے ایک تھی۔اس کے پاس سوتی۔دب بھر پلنگ کے گرد چکر لگاتی رہتی۔انجم،بنو،انجمی ______ اس کے سوا قمر اسے کسی اور نام سے پکار ہی نہ سکی۔انجمن بھی اپنی برتری کو خوب محسوس کر رہی تھی اور اس سے ضرورت سے زیادہ فائدہ اٹھا چکی تھی۔اس دن دوپہر کو قمر انجمن کے سر میں تیل لگا رہی تھی اور وہ اپنے بچے کو گود میں لٹائے مغلیہ شاہزادی کی طرح سر اونچا اٹھائے مالش کروا رہی تھی۔قمراب پورے دنوں سے تھی۔گھبراہٹ کے آثار ہر وقت اس کے چہرے پر ڈوبتے ابھرتے رہتے۔مالش چھوڑ کر اس نے انجمن سے پوچھا" کتنی تکلیف ہوتی ہے انجمن؟"اس کے لہجہ میں گھبراہٹ تھی۔

" کس میں باجی؟"انجمن نے دھوپ کی تمازت سے ایک آنکھ بند کر کے پوچھا۔

"یہی____یہی____وہ____بچہ "

"اوہ بچہ پیدا ہونے میں اب کچھ نہیں باجی_____ذرا بھی تو نہیں۔خوا مخواہ کا خوف ہے۔"

" مگر ...."

" مگر کیا؟ یونہی باتیں ہیں مردوں پر رعب ڈالنے کے لئے۔وہ بے چارے تو قیامت تک اس سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔"

"ہاں!ہاں شاید.....شاید"وہ ابھی تک گھبرائی ہوئی تھی۔

"باجی تمہارے بھی لڑکا ہوگا"انجمن نے نہایت محبت سے دل میں یہ کہتے ہوئے کہ خدا کرے ہرگز نہ ہو،قمر کو تسلی دی۔

" نہیں!نہیں!!" قمر نے سراسیمہ ہو کر جواب دیا۔

" کیوں؟"

"مجھے پتہ ہے"

" کیسے؟"

"بس!مجھے پتہ ہے۔"

پھر وہ اٹھی کر اندر چلی گئی اور انجمن کو یہ سوچنے کے لئے چھوڑ گئی کہ اگر کہیں باجی کے بھی لڑکا پیدا ہو گیا تو؟

پھر ایک دن ننھی سی چیخ دالان سے بلند ہوئی اور انجمن اندر دوڑی گئی۔خالہ کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ان کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو رہا تھا۔"مبارک ہو انجمن،خدا نے تمہیں بھانجا دیا۔"اور انجمن کی گود سے اس کا بچہ پھسل چلا۔تھوڑے عرصہ بعد محلّہ بھر کی عورتیں ادھر آنی شروع ہو گئیں۔کوئی انجمن کے پاس ٹھری بھی نہ،نہ کسی نے اس کے بچے کو چمکارا نہ بلایا۔وہ کھڑی خود ہی اس کا دودھ پلانے والا شیشہ صاف کرتی

رہی۔ "ایسی ہے ہوتی ہیں یہ اجڈ عورتیں "اس نے سوچا اور اپنے کام میں مشغول ہوگئی۔ اور جب شام کو وہ کسی کام سے اندر گئی تو ابھی تک دس بارہ عورتیں وہاں بیٹھی تھیں۔ ایک نے نیا بچہ اپنی گود میں ڈال رکھا تھا اور اس سے تتلا تتلا کر باتیں کر رہی تھی۔ انجمن دوسرے کمرے میں جانے لگی تو قمر نے آواز دی" ٹھہرو تو بی مٹکو، کہاں جا رہی ہو۔ کسی کے مرے جینے کی خبر بھی ہے یا اپنے ہی چونچلوں میں دن ختم کرتی ہو!" پھر اپنی کمر کے نیچے سے گرم پانی کی بوتل کھینچ کر بولی "لو اسے پھر سے بھر لاؤ، پانی ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ احتیاط سے بھر کر لانا۔ زیادہ گرم بھی نہ ہو۔ سن لیا؟" اور جب وہ گرم پانی ربڑ کی بوتل میں بند کر چکی تو جھلکتا ہوا پانی یوں ہلا جیسے کہہ رہا ہو سن لیا! سن لیا!! اور پھر یہ سن لیا..... دیکھ لیا! دیکھ لیا!! میں تبدیل ہو گیا۔ اندر عورتیں اونچے اونچے ہنس رہی تھیں اور باہر پنگوڑے میں انجمن کا لڑکا زور زور سے چلائے جا رہا تھا۔

مسرور مرثیہ

بادشاہ اور وزیر، دونون ایک ساتھ، جان کے خوف کے مارے، سرکنڈے کی بیڑ میں چھپے بیٹھے تھے اور باغی انہیں ڈھونڈ رہے تھے ۔جب باغیوں کے ژدئیں ژدئیں کرتے نیزے ان کے اردگرد آ کر گرتے تو دونوں سہم کر ایک دوسرے کے ساتھ چمٹ جاتے۔ تلاش کرتے باغیوں کے کتے، لگڑ بگڑ، لومڑ اور پالتو بجو تخت چھوڑ کر بھاگ جانے والے بادشاہ کی کھوج میں اپنے مالکوں کا ساتھ دے رہے تھے، لین دونوں ہی ن اکام تھے..... باغی بھی اور ان کے پالتو جانور بھی۔ سرکنڈے کے جنگل میں ہر طرف تیز دھار استرے اگے ہوئے تھے اور ان کے اندر داخل ہونا موت کو دعوت دینا تھا۔

لیکن زندگی بھی ایسی پیاری چیز ہے جسے بچانے کے لیے انسان موت کی بازی لگا کر بھی بچالیتا ہے اور اپنے پیچھے عجیب عجیب داستانیں چھوڑ جاتا ہے۔ بادشاہ اور وزیر دونوں ہی استروں کے منڈپ میں چھپے اپنی زخم خوردہ زندگی کو بچانے کی کوشش کرتے تھے اور ان کے بدنوں پر جگہ جگہ چیروں سے خون رس رہا تھا، پاؤں کے چھالے پھٹنے سے تلووں پر دلدل کی ہلکی سی تہہ چڑھ آئی تھی اور مسلسل بھوکے رہنے کی وجہ سے ان میں زندہ رہنے کی شکتی پیدا ہو گئی تھی، گو وہ اندر سے کبھی کے مر چکے تھے۔

جب بادشاہوں اور وزیروں پر افتاد پڑتی ہے تو اسی طرح سے ہوتا ہے اور جب حکومتیں تبدیل ہوتی ہیں تو سرخ آندھیاں ضرور چلتی ہیں۔ باہر چلیں یا بھیتر، بستیوں میں چلیں یا سینکوں کے اندر چلیں، خون خرابہ ضرور ہوتا ہے۔ رت کے اندر کچھ ایسا رسائن ہے کہ اس کے جوش مارنے سے رت جگا ضرور ہوتا ہے انقلاب ہو چاہے شب عروسی، لوگوں کو جاگنا ضرور پڑتا ہے۔ بادشاہ اور وزیر بھی کئی راتوں کے جگے ہوئے تھے اور موت کی لمبی نیند سونے پر دونوں ہی تیار تھے، لیکن اپنی جبلت کی آمریت کے سامنے بے دست و پا اپنے آپ کو بچائے بچائے پھرتے تھے حالانکہ ان میں قدر و قیمت والی کوئی چیز بھی باقی نہیں رہی تھی۔ اگر وہ اپنے رستے ہوئے زخموں کے ساتھ نقاہت کے مارے سرکنڈوں کے جھنڈ میں بیٹھے بیٹھے فوت ہو جاتے تو ان کو خوشی ہوتی اور وہ خوشی کے ان لمحات کو زندگی بھر نہ بھلا سکتے۔

بادشاہ کا نام راڑا تھا اور اس کے وزیر کا نام دڑ وُ تھا۔ دونوں الگ الگ علاقوں میں پیدا ہوئے، الگ الگ بڑھے پھولے اور دونوں نے الگ الگ ہی اپنی زندگیوں کا آغاز بے کاری اور بے روزگاری سے کیا۔ دونوں ہی اچھے دنوں کی تلاش میں ایک ایسے مقام پر آ کر ملے جو ابھی دوسرے ترقی یافتہ دیسوں کے مقابلے میں پس ماندہ، گنوار، بے عقل اور مورکھ تھا۔ یہاں کے بہت سے لوگ ابھی تک جانوروں کی

سی زندگی بسر کر رہے تھے اور جو جانوروں کی سطح سے ذرا اوپر اٹھ آئے تھے، وہ بھی بے یقنسنے سے تھے بڑے بزرگ، مرد عورتیں، سارے کے سارے زمین پر ہتھیلیاں ٹیک کر چوپایاں کی طرح چلتے تھے اور جو نوجوان لڑکے لڑکیاں دونوں پاؤں پر کھڑے ہو کر چلنے لگے تھے، وہ بھی ابھی کے کے سے چلتے تھے اور درختوں کے تنوں کو تھام تھام کر آگے بڑھتے تھے۔ بڑے بزرگ نو جوانوں کو گھور گھور کر دیکھتے اور چلا چلا کر کہتے "ناں الفت پنے کرو۔ ناں اسمان میں ٹاکیاں لگاؤ۔ سیدھی طرح اپنے باپ دادا کی ریت پر چلو۔ بے اصولے چلنے سے منہ کے بل گرو گے اور ہڈی پسلی تڑوا لو گے۔" لیکن ہر بستی کے نوجوان چونکہ بے وقوف ہوتے ہیں، اس لیے وہ اپنے بزرگوں کی بات مانے بغیر دو پاؤں پر ہی چلتے رہے اور ڈگماتے رہے۔

راڑا سوواں ندی کا باشندہ تھا اور اس کے علاقے کی بستیوں کے لوگ بڑی دیر سے دو پاؤں پر چل رہے تھے۔ ان بستیوں کے بڑے بادشاہ بھاماں کی دور دور تک کلا جگی ہوئی تھی کیونکہ وہ ندی کنارے اگی ہوئی گھاس سے نرمہار نکال کر ایسے دستر بنا دیتا تھا جن کو پہن کر نہ سردی لگتی تھی نہ گرمی۔ وہ سارا دن سواں ندی کے کنارے بیٹھا نرم نرم ہار نکال کر ان کے گھٹے بناتا رہتا اور شام کو ان میں جوڑ ڈال کر گٹھ بھر چوڑی اور لال سانپ سے دو ہاتھ لمبی پٹی تیار کر لیتا۔ یہ پٹی جنے جنانی کے سینے اور پیٹ پر لپٹنے کے بعد بھی تھوڑی سی بچ رہتی جو چھوٹے بچے کے کندھے اور چھاتی کے ڈھانچے کے کام آجاتی۔

بھاماں کا وزیر سہنگی تھا۔ سہنگی کو پہاڑوں کے اوپر کالے رنگ کے پتھر سے شیشے کا ایک ایسا تیز دھار ٹکڑا مل گیا تھا جس نے کٹاس کی ایک ڈلی پر صدیوں کی دھوپ پڑنے سے یہ صورت اختیار کی تھی۔ جن لوگوں کے بال چپک جاتے یا بدن کے کسی حصے سے چپٹ جاتے یا آنکھوں اور منہ کے سامنے جھالروں کی طرح یوں اٹک جاتے کہ بندہ نہ دیکھ سکتا نہ کچھ کھا سکتا، وہ سہنگی کے پاس آکر شیشے سے بال کٹوا کر اپنا پنڈ چھڑوا کے لے جاتے۔ اس کے اس کمال کی وجہ سے بھاماں بادشاہ نے اسے اپنا وزیر بنا لیا تھا۔

اصل میں اس زمانے کا یہی دستور تھا کہ انسانوں کے گروہ کو جس چیز کی اشد ضرورت ہوتی اور جس کے بغیر ان کی زندگی کے لالے پڑے ہوتے، اگر وہ چیز کوئی شخص بنا کر یا دریافت کر کے یا اختراع کر کے ان کو فراہم کر دیتا تو وہ اس کو اپنا پیشوا مان کر اسے اپنا بادشاہ بنا لیتے تھے اور زندگی بھر اس کی اطاعت سے سر نہ پھیرتے تھے۔

اکثر آبادیوں کے بادشاہ جولاہے تھے۔ بہت سے گروہوں پر پتھر جوڑ کر گھر بنانے والوں کی حکمرانی تھی۔ کچھ لوگ جنہوں نے کھودا کھودی کے پترے اور سوئے بنا کر دکھا دیے تھے، ان کو سب نے کوش ہو کر اپنا بادشاہ مان لیا تھا۔ کئی علاقوں میں بال کاٹنے اور ناخن تراشنے والے بادشاہ تھے اور ان کی دور دور تک مانگ تھی۔ سوسو، دو دو سو کے گروہ ان کے آگے ناچتے گاتے، انہیں اپنی اپنی بستیوں میں لے جاتے تھے اور ان سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ سب سے بڑے نامی گرامی، طاقت ور اور مشہور زمانہ وہ بادشاہ تھے جنوں نے خودرو پودوں سے ان کے بیج تلاش کر کے انہیں مٹی میں دبانے کا فن نکالا تھا۔ وہ اپنی بستیوں کے اندر کودرو پودے اپنی مرضی سے اگا لیتے تھے اور انہیں خوراک کی تلاش میں دور نہیں جانا پڑتا تھا۔ بیج نکالنے اور دبانے کا فن ان بادشاہوں نے اپنی مملکتوں کے علاوہ دوسرے سلطنتوں کے لوگوں کو بھی سکھا دیا تھا، اس لیے یہ لوگ بادشاہوں کے مقابلے میں شہنشاہ کہلانے لگے اور غاروں اور درختوں کی کھوہوں میں ان کی پوجا عام ہونے لگی

تھی۔

اس زمانے میں چونکہ لوگوں کوصرف ہاتھ کا کام ہی آتا تھا اس لیے اعلیٰ درجے کا کام کرنے والے اور دوسروں کو ہاتھ کا کام سکھانے والے ہی راجے، مہاراجے اور راج ادھیراج تھے۔ اس وقت کرۂ ارض پر جولاں ہوں، ترکھانوں، لوہاروں، موچیوں، مستریوں اور دستکاروں کی حکومت تھی اور ان ہی کے پیشوں سے مملکتیں، سلطنتیں اور راجدھنیاں پہچانی جاتی تھیں۔

اپنے ہڑپہ سے کوئی بارہ کوس آگے چیچاوطنی کی طرف ایک بہت بڑی آبادی صبہ کی تھی، لیکن یہ ہڑپہ کے وجود میں آنے سے کئی ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ صبہ کے لوگوں نے دونوں پاؤں پر چلنا شروع تو کر دیا تھا، لیکن اب ان کی زندگی ایک دردناک عذاب میں مبتلا ہو گئی تھی۔ پہلے جو راہیں اور پگڈنڈیاں ان کی نگاہوں سے بانہ بھر دور ہوتی تھیں اب چھ سات فٹ نیچے اتر گئی تھیں۔ اونچے نیچے راستے، قدم قدم پر نوکیلے پتھر، سولوں کانٹوں سے بھری واٹیں..... پانچ دس قدم کے بعد پاؤں لہولہان ہو جاتے اور لوگ بیٹھ بیٹھ کر اور رک رک کر اپنے غاروں اور کھوہوں میں واپس پہنچتے۔ عورتوں اور چھوٹے پھونک کر قدم دھرتے تھے اور جوانوں سے پہلے اپنی منزل پر پہنچ جاتے تھے۔

راڑا سواں ندی کا باشندہ تھا۔ رمتا جوگی تھا۔ کام کاج سے اس کو دلچسپی نہ تھی۔ سیر و سیاحت کا دیوانہ تھا۔ ایک اچھے گھوڑے جتنی مسافت دن بھر میں طے کر کے کسی درخت کے نیچے یا درخت کے اوپر رات گزار کر اگلے دن اپنا سفر پھر شروع کر دیتا۔ اس کے پاؤں لمبے سفر کی صعوبتیں سہ سہ کر گھوڑے کے سموں کی طرح سخت ہو گئے تھے اور جب وہ چلتا تھا تو جنگلی گھوڑیاں دریا کنارے چرتی چگتی سر اٹھا کر اسے غور سے دیکھنے لگ جاتیں کہ باقی دو سموں کی ٹاپ کیوں نہیں آ رہی!

راڑا جب صبہ پہنچا اور اس نے ہتھیلی جیسی ہموار سرزمین پر خوب صورت مخلوق کو ایک دردناک عذاب میں مبتلا پایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بستی کی گابھن اور شیردار عورتیں اس کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئیں اور باری باری اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے اپنے گال اور گردنیں سہلانے لگیں۔ راڑا نے جب ان کے سوجھے ہوئے، لہولہان، زخمی اور کٹے پھٹے پاؤں دیکھے تو وہ کلیجہ مسوس کر رہ گیا۔ چپ تو وہ پہلے ہی تھا کہ ان کی بولی اس کی سمجھ سے باہر تھی، لیکن اب ساکت اس لیے ہو گیا تھا کہ سواں ندی کی عورتوں کا مساس صبہ کی عورتوں سے مختلف تھا۔

جب صبہ کے بادشاہ نے، جس نے اپنی رعایا کو گھاس سے رسی بٹنے کا علم سکھایا تھا، راڑا کے سامنے کچی گندم، جنگلی پونڈا اور کول ڈوڈے کے بیج رکھے تو بادشاہ کے پیپ دار لیس بھرے پاؤں دیکھ کر روڑا کھانا پینا بھول گیا اور اس نے اپنے دل میں مخلوق خدا کی اس مشکل کو آسان کرنے کا پکا ارادہ کر لیا۔

راڑا بستی سے باہر نکل گیا اور اس نے باہر درختوں میں اپنا بسیرا کرنا شروع کر دیا۔ زخمی پاؤں والی عورتوں نے اسے بہت یاد کیا، لیکن وہ اتنی دور تک چلنے سے لاچار اور راڑا تک پہنچنے سے معذور تھیں۔ صبہ کے بادشاہ نے پردیسی مہمان کو کھانا بھجوانے کی کوشش کی، لیکن اس کے خدمت گار زیادہ فاصلہ طے نہ کر سکے۔ بستی کے لوگ بہت روئے اور ان سے الگ ہو کر راڑا بھی بہت رویا۔

روڑا نے اپنے پاؤں کے ساتھ پتے باندھ کر چلنے کی کوشش کی، لیکن پتے پہلے ہی قدم پر پھٹ گئے۔ اس نے درختوں کی چھال کے

ساکھے ٹوٹے ایڑی سے پنجے تک باندھ کر چلنا شروع کیا تو دس بارہ قدم کا پینڈا صاف طے کر گیا، لیکن پھر اس کے سموں کے نیچے چھال کے ٹوٹے کرچی کرچی ہو گئے۔ اس نے گھاس کی رسیاں بٹ کر پاؤں کے گرد لپیٹیں اور بڑی دور تک آگے نکل گیا، لیکن جب وہ مڑنے لگا تو رسیاں ٹوٹ کر ریشہ ریشہ ہو گئیں اور اس کی انگلیوں میں سبز گھاس کے تنکے رہ گئے۔

اس کو بستی سے باہر زندگی گزارتے کئی مہینے ہو گئے لیکن اس کا نخلِ تمنا ہرا نہ ہو سکا۔ اس عرصے میں وہ دو تین مرتبہ بستی کے اندر آیا بھی اور اعترافِ شکست اور ناکامی کی خفت کا اظہار کر کے واپس چلا گیا۔ اس نے روتی ہوئی عورتوں کو بھی مڑ کر نہ دیکھا جو اپنے پاؤں کے زخموں سے بے نیاز اس کی جدائی کے بوجھ تلے رو رہی تھیں اور درختوں کے نیچے ان ہرنیوں کی طرح کھڑی تھیں جن کے کالے مرگ کو شکاری بانس سے لٹکا کر کندھوں پر دھرے لیے جا رہے ہوں۔

جس روز سردیوں کی دھوپ میں زمین پر پالتی مارے راڑا مارے راڑا اپنی چکڑ بھری انگلیوں سے چپنیاں پھاڑ پھاڑ کر گول ڈوڈے کے بیج کھا رہا تھا، اس وقت دڑ وُ عین اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ راڑا نے جب اپنے ہاتھوں اور چھاتی پر اچانک اندھیرا سا دیکھا تو اس نے نظریں اوپر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے دڑ وُ کھڑا تھا اور اس کے منہ جنگلی پونڈے کے ٹوری تھی۔ دونوں نے ہاتھ کے اشارے سے ایک دوسرے کی خبر پوچھی، لیکن دونوں ہی ان اشاروں کا ٹھیک ٹھیک مطلب نہ سمجھ سکے۔ اصل میں ان کے اشاروں میں گرامر کی گئی غلطیاں تھیں اور ابلاغ کے علم میں علم بالکل کورے تھے۔ دڑ وُ بڑے اطمینان سے راڑا کے سامنے بیٹھ گیا اور غور سے اس کے پاؤں دیکھنے لگا۔

دڑ وُ سمندر کے پاس دلدلی علاقوں کا باشندہ تھا اور اس کے پاؤں پیدائشی طور پر بڑے نرم و نازک تھے۔ وہ بھی راڑا کی طرح کا سیلابی جھونکا تھا جو رکتا، چلتا، دبکتا، گھومتا سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے صبہ آ پہنچا تھا۔ اگر یہاں دھوپ میں راڑا نہ بیٹھا ہوتا تو وہ اس سے بھی آگے نکل کر پتا نہیں کہاں پہنچ جاتا، لیکن وہ رک گیا۔

چند دنوں کے اندر اندر ان دونوں کے درمیان ایسی شدید رغبت پیدا ہوئی کہ وہ راڑا کے جٹادھاری بوڑھ کی کھوہ میں کھنڈلی مار کر ایک ساتھ سونے لگے۔ پتا نہیں یہ رغبت انسانی تھی، جسمانی تھی یا روحانی لیکن تھی بڑی سحر انگیز۔ چند دنوں کے اندر اندر وہ ایک دوسرے کی بولی بھی سمجھنے لگے اور ایک دوسرے کے دلوں کا بھید بھی جاننے لگے۔ دڑ وُ کبھی آنکھ کے ساتھ آنے والے ایک سال کی پوری تصویر دیکھ لیتا تھا، لیکن اس کو چولستان سے نکلی ہوئی ہرنوں کی اس ڈار کا پتا نہیں چلتا تھا جو اپنے بڑے غول سے بھٹک کر صبہ سے ساتھ آٹھ کوس کی دوری پر گزر رہی تھی۔ راڑا اپنی آنکھیں چندھی کر کے اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں گھنگھی جتنا فرق رکھ کے آنے والی کئی صدیوں کو اچھی طرح دیکھ لیتا تھا۔ ان صدیوں کی چلتی پھرتی تصویروں میں اسے صرف ایک دو باتیں ہی ٹھیک سے سمجھ میں آتی تھیں، باقی اس کے سر پر سے گزر جاتی تھیں۔ پرندے، ندیاں، آسمان، چوپائے اور درخت تو اس کو کچھ مطلب فراہم کرتے تھے لیکن باقی کی ساری چیزیں انسان سمیت اس کی گرفت میں نہیں آتی تھیں۔ اس کو نظر تو سب کچھ آتا، لیکن سمجھ نہ آتا۔ سمجھ نہ آتا تو بیان نہ کر سکتا۔ بیان نہ کر سکتا تو اس کی خاموشی کے پھیلاؤ اور بھی اضافہ ہو جاتا اور جب خاموشی میں اضافہ ہوتا تو دڑ وُ اس سے خوف زدہ ہو کر دور نکل جاتا۔ دور نکل جاتا تو کئی دن تک واپس نہ آتا۔ کئی کئی دن تک واپس نہ آتا تو رغبت کا مارا راڑا اس کو تلاش کر کے واپس لے آتا۔ پتا نہیں یہ رغبت انسانی تھی، جسمانی تھی یا روحانی لیکن تھی

بڑی طاقت ور اور سحر انگیز!

سوچے سوچے، لہولہان اور زخمی پاؤں کو پہناوا عطا کرنے کے لیے دڑ وُ بھی راڑا کی مہم میں برابر کا شریک تھا بلکہ ان دونوں کے درمیان باہمی رغبت کی ایک بڑی وجہ یہ تلاش ہی تھی جو انہیں صبح سے شام تک دیوانوں کی طرح ویرانوں میں لیے پھرتی تھی۔ اچانک ایک روز درخت کا ایک بڑا سا ڈالا ٹوٹا اور نیچے سوئے ہوئے باگڑ بلے پر گرا۔ یہ سب کچھ اس قدر خاموشی سے ہوا کہ بھورے بلے کو پتا بھی نہ چل سکا کہ وہ مرگیا ہے اور اب اس کا دنیا کے ساتھ کوئی رشتہ بھی باقی نہیں رہا۔ ڈالا بڑا تھا اور پتے زیادہ تھے۔ کئی دنوں تک گدھوں کو باگڑ بلے کی لاش نظر نہ آسکی۔ پتا اس روز چلا جب باگڑ بلے کی سڑتی ہوئی لاش کی بدبو دور دور تک پھیل گئی۔

راڑا نے سانس روک کر باگڑ بلے کو تنسبو سے نکالا اور اپنے گھر کی کھوہ سے بہت دور لے جا کر کھلے میدان میں ڈال دیا۔ تین گدھ کنی مانگتی تکلوں کی طرح فضا میں تیڑھے سے اترے اور دیکھتے دیکھتے بھورے رنگ کے باگڑ بلے کی بھوری کھال مٹیالی ہو کر زمین کے ساتھ چمٹ گئی۔

صبہ کی ایک نوخیز، چھریرے بدن اور سانولے رنگ کی گابھن لڑکی سب کی آنکھ کا تارہ تھی۔ یہ لڑکی نرم دھول کے راستوں پر چلتی اور نرم زمین کی کھوج میں کوئی میل بھر کا چکر کاٹ کر ہر دوسرے تیسرے راڑا کو دیکھنے ضرور آتی۔ ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر وہ راڑا کو تکے جاتی اور اپنی زبان میں کچھ ایسے بول بولتی جاتی جو اس وقت تو راڑا کو سمجھ میں نہیں آتے تھے، لیکن بعدازاں کئی لاکھ برس گزرنے کے بعد جب وہی بول "ماہیا" کے روپ میں زبان زد عام ہوئے تو رارا اس جہان سے کوچ کر چکا تھا۔ اپنے گربھ کی وجہ سے وہ لڑکی بیٹھی ہوئی یوں لگتی جیسے ابھی اٹھنے والی ہے اور جب بھرپور کھڑی ہوتی تو نظر آتا جیسے ابھی بیٹھنے والی ہے۔ اس کے بعدن میں اتنی گولائیاں پیدا ہوگئی تھیں کہ سکون میں بھی اس کا انگ انگ متحرک رہتا تھا۔ اس کے فاختاؤں جیسے پیر زخمی بھی تھے اور سوجے ہوئے بھی۔ راڑا اس کے چہرے اور بدن سے لطف اٹھانے کے بجائے ہر وقت اس کے پیروں ہی کو دیکھا کرتا اور پیروں ہی میں گھرا رہتا۔

جب اس کرۂ ارض پر چمڑے کا پہلا جوتا بنا تو وہ اس باگڑ بلے کی کھال کا تھا جس کو گدھوں نے چاٹ چوٹ کر اندر سے بالکل خالی کر دیا تھا اور اس کی کھال کو زمین پر پھیلا دیا تھا۔ دنیا کا پہلا موچی راڑا تھا اور دنیا کا سب سے پہلا جوتا اس گربھ وتی کے لیے بنا تھا جس کے پاؤں فاختاؤں جیسے تھے۔

صبہ کے ڈور بیٹا بادشاہ نے بستی کے لوگوں کے سامنے کھڑے ہو کر پہلے تو رارا کو سجدہ کیا، پھر اپنی پچیس سالہ پرانی حکمرانی اس کے حوالے کر دی۔ ہاتھ پکڑ کر راڑا کو خود تخت پر بٹھایا۔ اس کی دونوں آنکھوں اور پھر دونوں ہاتھوں کو الگ الگ بوسہ دیا اور بستی کے سارے لوگوں سے اس رسم کی ادائی کی درخواست کی۔ دست بوسی کا یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا اور جو لوگ صبہ کے باسی نہیں بھی تھے، وہ بھی اردگرد کے علاقوں سے آ کر راڑا بادشاہ کے ہاتھ چومتے رہے۔

دڑ وُ جس کو راڑا نے اپنا وزیر بنا لیا تھا، ایک خاص بوتے کا چھلکا اتار کر اس سے باریک اور مضبوط رسی بٹنے کا ماہر ہو گیا تھا۔ پھر اس نے چمڑے کے اندر باریک سوراخ نکالنے کا راز بھی معلوم کر لیا تھا اور ساتھ ساتھ عورتوں کے دلوں کو چھیدنے کا بھی ماہر ہو گیا تھا۔

راڑا بادشاہ کے اوپن ائیر شاہی محل کے ہر طرف ہر طرح کے پالتو اور جنگلی جانور کٹ تہے تھے اور ان کی کھالیں ستھرائی اور صفائی کے لیے اور بعد میں چمڑے کی کمائی کے لیے بادشاہ کے پاس پہنچا دی جاتی تھیں۔ بادشاہ سلامت ستر پر ایک لنگوٹ سا لپیٹ کر سارا دن گندے پانی میں اترے بدبودار کھالوں کو دھوتے رہتے اور ان کے قریب وزیر باتدبیر دڑوُ چمڑے کے کونوں کو تسوارے اور ڈوریاں بٹو ریا لگے رہتے۔ سب سے پہلے صبہ بستی کی عورتوں نے جوتے پہنے، ان کے بعد پاؤں چلنے والے لڑکے لڑکیوں نے، پھر جوانوں نے اور سب سے بعد بوڑھوں کے لیے جوتیاں بنانے کا ڈول ڈالا گیا۔

بادشاہ نے اردگرد کے علاقوں سے لوگ بلوا کر انہیں بھی جوتا بنانے کا فن سکھایا اور وہ بھی چھوٹی چھوٹی راجدھانیوں کے مالک بن گئے۔ اس زمانے کے بڑے بڑے بادشاہ، اونچی عزتوں اور لمبی شہرتوں والے حکمران زیادہ تر جولاہے، نئی، پتھر پھوڑ اور کاٹھ پھوڑ مستری، دھات کار اور بیچ اگئے تھے۔ اب ان میں خاندان موچیاں کا بھی اضافہ ہو گیا۔ موچیوں کے کام کی ایسی کلا جگی کہ بہت سے پرانے دھرانے سیانے بادشاہوں نے اپنے سروں سے راج ادھیراج کا مکٹ خود اتار کر موچیوں کے سروں پر رکھا اور انہیں اپنا بادشاہ بنالیا۔

جب موچی بادشاہ راڑا اور اس کے وزیر دڑوُ کو ہمبہ پر حکومت کرتے دس سال پانچ مہینے اور تیئس دن ہو گئے تو آج کے وسط ایشیا کی اور سے ایک پردیسی گھومتا گھماتا، بھوکوں مرتا، دھکے کھاتا ہمبہ کی بستی میں آنکلا۔ اس پردیسی کا رنگ صاف، بال گھنے، قد لمبا اور آنکھیں کیری تھیں۔ یتز بولتا اور تیز چلتا اور تیز سوچتا تھا۔ ہمبہ کے جنے اور جنیاں سبھی اس کے گرد جمع ہو گئے اور بولی نہ جاننے کے باوجود اس کی محبت کے جھومڑ ڈالنے لگے۔ خود بادشاہ راڑا، بادشاہ کا وزیر اور اس کی عورتیں پردیسی سے دل لگا کر اسے نظروں کے سامنے بٹھا کر کھڑے ہو گئے۔

تیز تیز چلنے اور تیز تیز بولنے والے پردیسی نے بڑی تیزے کے ساتھ ہمبہ والوں کی بولی سیکھ لی اور ان کے اور قریب ہو گیا۔ بستی کے سارے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں کھلے میدانوں، بندرستوں اور گہری نیائیوں میں اس کے ساتھ گھومنے لگے۔ اس لگے کیرے پردیسی کو بات کرنے، بات کو چمکانے اور چمکتی ہوئی بات کو گھما کر پھینکنے کا ایسا ڈھنگ آتا تھا کہ وہ کسی بھی لڑکے کی جانگھوں ور کسی بھی لڑکی کے سینے پر سر رکھ کر لیٹ سکتا تھا اور لیٹتے ساتھ ہی خرمستیاں بھی کر سکتا تھا۔ اس کے بولنے میں بات کی بول بانٹ ایسی خوبصورت ہوتی کہ بڑھت میں چوکور بھی چلتی اور گول گول دائروں میں بھی برابر کی کاٹ کرتی جاتی۔ بڑے بوڑھے اور اپنے سوئے پورے کر چکی عورتیں اس کی راہوں کو پلٹ پلٹ کر دیکھا کرتیں حالانکہ وہ ان راہوں سے کبھی کا گزر چکا ہوتا۔

لگا کیرا ساری بستی کی آنکھوں کا تارا تھا۔ وہ ایک ٹیلے پر بیٹھ کر رات بھر جگمگاتا اور بستی کے سارے لوگ ساری ساری رات اس کی پوجا میں مگن رہتے۔ اس کا سب سے بڑا اپجاری وقت کا بادشاہ راڑا تھا جس نے جوتے بنانے، مساس کروانے اور محبت کرنے کا کام چھوڑ دیا تھا اور اب ایک ہی طرف ٹکٹکی لگا دی تھی۔ لگے کیرے کے پاس آگہی کا خزانہ اور جان کاری کی موہنی تھی۔ اس نے کبھی جوتا نہیں بنایا تھا، لیکن وہ جوتا بنانے پر دن بھر بیان دے سکتا تھا۔ وہ بال کاٹنے کے فن سے ناآشنا تھا، لیکن بالوں کے بارے میں کاٹنے کے حوالے سے، کٹنے کے رشتے سے، تیشے کی دھار سے، کانچ کی جھریٹ سے اچھی طرح واقف تھا، اس کو کپڑا بنانا نہیں آتا تھا، پرپٹھے کی قسم پر، ریشے کی شان میں

،دھاگے کے بیان میں، ڈور کی لٹکن مین، لچھے کی الجھن میں پوری پوری رات بات کر سکتا تھا۔

اس کے پاس بات تھی اور بڑی ہی لمبی بات تھی۔ بول بچن کے زور پر وہ ہر خالی دل میں گھر کر لیتا تھا اور ہر بھرے ہوئے گھر کو خالی کروالیتا تھا اور خالی وقت کو اپنی باتوں سے بھر کر اس میں چکا چوند کے چھلے، گھنگھرو اور گھونگھے سیپیاں ٹانک سکتا تھا۔ کاکیرا ایک ایسی آسمانی مخلوق تھا جس کو کچھ بھی کرنا نہیں آتا تھا اور سارے کرنے والوں پر اس کی حکمرانی تھی۔ وہ محنت سے شدید نفرت کرتا تھا اور سارے محنت کرنے والے ایک ایک کر کے اس کی محبت کے تالاب میں ڈوبتے جا رہے تھے۔

ایک رات پورن ماشی کا چاند اس کے ٹیلے کے عین اوپر آ گیا تو لگے کیرے نے اپنے ساتھیوں سے کہا" میں بے کار رہ رہ کر تنگ آ چکا ہوں اور اب اپنی بقیہ زندگی اس بستی کا بادشاہ بن کر سکون و تسکین اور راحت و آرام سے گزارنی چاہتا ہوں۔" اس کے سارے ساتھی یہ بات سن کر سکتے میں آ گئے۔ بڑی دیر تک چاند کی چاندنی میں پتھر کے بت سا کت وصامت بیٹھے رہے..... دیوتا ٹیلے پر اور پجاری نیچے ٹھنڈی ریت پر۔

جب بڑی دیر گزر گئی تو دیوتا نے اپنی بات ایک بار پھر وضاحت کے ساتھ دہرائی اور ہاتھ کے اشارے سے اس چھوکرے کو اپنی طرف متوجہ کیا جس کے کندھے بکائن کی چھتری کی طرح چوڑے اور جس کا بدن کھجور کے پیڑ کی طرح گھنگریلا تھا۔ اس نے حسرت بھری چیخ مار کر کہا" کاش ہم تیری یہ آرزو پوری کر سکتے اور تجھے اس ٹیلے سے اٹھا کر ابھی اس پتھر پر بٹھا سکتے جو صرف بادشاہوں کے لیے بنا ہے اور نیم کے گھنے اور ٹھنڈے پیڑ کے نیچے اسی مقصد کے لیے رکھا گیا ہے، لیکن یہ بات ناممکن ہے۔"

لگے کیرے کو اس ان گھڑت چھوکرے کی یہ بات پسند نہ آئی اور اس نے نفرت کی ایک عجیب آواز اپنے حلق سے نکالی اور ٹیلے سے نیچے کی طرف تھوک دیا۔ چھریرے بدن کے ایک خوبصورت سے جوان نے ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا" باوجود اس کے کہ ہمارا دل تجھی کو بادشاہ بنانے پر رضامند ہے اور ہم اندر سے تجھی کو اپنے ہردے کا بادشاہ مانتے ہیں لیکن ہمارے دستور کی پہلی شق ہی اس اعلان سے کھلتی ہے کہ جو محنت کش، کارکنندہ کاریگر یا زحمت کش اپنی کسی اپج سے یا اپنی کسی ایجاد سے لوگوں کی بنیادی ضرورت کا حل عملی صورت میں پیش کرے گا اور اس پر باقاعدگی سے عمل کرتا رہے گا، صرف اسی کو بادشاہ بننے کا حق حاصل ہوگا اور وہی لوگوں کے درمیان حکم ہوگا۔"

لگے کیرے نے کہا" میں ایسے دستور کو نہیں مانتا..... نہیں مانتا....... نہیں مانتا۔"

اپنے دستور کی پہلی ہی شق کے خلاف تین مرتبہ نفی کا اعلان سن کر سارے جوان اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے بیک زبان کہا" یہ صرف ہمارا ہی دستور نہیں، ساری دنیا کی ہر بستی اور ہر گروہ کا دستور ہے اور اس کے پری ایمبل کا پہلا فقرہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ ہم اس کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں۔"

کاکیرا سفید دودھیا چاندنی میں دونوں ہاتھ پھیلا کر ٹیلے پر مقدس لکر متے کی طرح کھڑا ہو گیا اور اس نے علم کی برتری اور ہاتھ کی کارکردگی، ہنر دستی، کار جسمانی اور ضائع دستی کی بے وقعتی پر بھاشن دینا شروع کر دیا۔ یہ کرہ ارض کی وہ پہلی تقریر تھی جس میں غیر کارکن، بے حرفہ، بدون عمل اور ناتمام لیکن لسان انسانوں کو بلند و برتر اور رفیع و عالی بتایا گیا جبکہ کارآمد، کارشناس، پیشہ ور اہل حرفہ کو کمی کمین کا نام دیا گیا

۔جب چاندنی میں کھڑے انسانوں کو اس حقیقت کا علم ہوا کہ سخن ساز یے، گل باتے، بیان باز یے اور لفظ انڈیلئے دیوتاؤں کی اولاد ہیں اور ہاتھ بدن سے کام کرنے والے ملیچھوں اور راکشوں کے پھوسڑے ہوتے ہیں تو وہ انقلاب کے نام پر اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے سر کنڈوں کی مشعلیں جلا کر اپنے جولاہے بادشاہ راڑا اور اپنے ڈوربٹیا وزیر ڈڑو کے خلاف بغاوت کر دی۔

بہت سی جذباتی عورتیں اور معصوم بچے پہلے ہی حملے میں مارے گئے اور بہت سے بوڑھے جنہوں نے بلوائیوں سے یہ کہا کہ اس ہری بھری زمین پر فساد نہ پھیلاؤ، اس فقرے کی ادائی پر قتل کر دیے گئے۔راڑا اور ڈڑو نیم تلے کا تخت چھوڑ کر بھاگے اور باغیوں کے آگے بھاگتے ہی گئے۔

صبح ہو چکی تھی۔معزول بادشاہ راڑا اور اس کا وزیر ڈڑو دونوں ایک ساتھ جان کے خوف کے مارے سرکنڈے کی بیڑ میں چھپے بیٹھے تھے۔جب باغیوں کے ژوئیں ژوئیں کرتے نیزے ان کے ارد گرد آ کر گرتے تو دونوں سہم کر ایک دوسرے سے چمٹ جاتے۔تلاش کرتے باغیوں کے کتے ،لگڑ بگڑ اور پالتو بجو تخت چھوڑ کر بھاگنے والے بادشاہ اور وزیر کی کھوج میں اپنے مالکوں کا ساتھ دے رہے تھے،لیکن دونوں ہی ناکام تھے......سونگھنے والے پالتو جانور بھی اور ڈھونڈنے والے باغی بھی۔

جب دھوپ تیز ہو گئی اور باغی تھک ہار کر اپنی نئے بادشاہ لگے کیرے کے پاس چلے گئے تو سرکنڈے کے سمندر میں بے نام سی حرکت ہوئی۔ڈڑو نے پھوس تلے چھپی ہوئی بٹیر کی طرح سر اٹھایا اور اپنے قریب بیٹھے ہوئے چرخ ابوالہول راڑا سے پوچھا"ہماری حکومت گئی؟"

راڑا نے آنکھیں اور ہونٹ ہلائے بغیر کہا" گئی!"

تھوڑی دیر ڈڑو خاموش رہا۔پھر بولا" کچھ عرصے بعد ہمارا تخت و تاج دوبارہ بھی تو مل سکتا ہے؟"

راڑا نے نفی میں سر ہلایا تو ڈڑو تیز پترے سے اس پر حملہ کرنے کو ابھرا۔راڑا نے اس کی کلائی پکڑ کر مروڑی اور پترا اس کے ہات سے چھوٹ کر سرکنڈوں میں گر گیا۔

ڈڑو نے روتے ہوئے کہا "چلو اب نہ سہی، پھر کبھی سہی لیکن ہمارے حکومت ہمیں مل تو جائے گی......واپس!"

راڑا نے پورے شاہی جاہ و جلال سے اسے جھڑک کر کہا" تخت و تاج کو دفع کر و احمق انسان اور اپنی جان بچانے کی فکر کرو۔اگر اس وقت یہ جان بھی بچ جائے تو غنیمت ہے۔"

ڈڑو نے ہاتھ جوڑ کر کہا" مالک! تمہارے پاس تو کشف کا علم ہے اور تم بڑی دور تک دیکھ سکتے ہو۔اگر صرف یہ بتا دو کہ کتنے نئے چاند بعد ہماری حکومت ہم کو واپس مل جائے گی تو پھر میں تم سے کوئی سوال نہیں کروں گا؟"

راڑا نے زچ ہو کر کہا" میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ اب حکومت کبھی لوٹ کر ہمارے پاس نہیں آئے گی اور ہم وہاں ساری عمر اسی طرح ہی رہیں گے اور ساری جونیں اس طرح بکھرے رہیں گے، پر تمہیں یقین کیوں نہیں آتا؟"

ڈڑو نے دونوں خون آلود ہاتھ تیز دھار سرکنڈوں پر ڈال کر وہیں اپنا ہاتھ ٹیک دیا اور رو کر بولا" مجھے آخری بار بتا دو مالک! اپنے

کشف کی لوچن سے دیکھ کر بتاؤ، پھر چاہے اپنے ہاتھ سے مار کر آگے نکل جانا۔۔۔۔ پر دیکھو اور اسی پنتھ کے زور پر جس نے تم کو ہ لتر بنائے کا رج سکھایا ہے۔"

تھوڑی دیر تو معزول بادشاہ خاموش رہا۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں چندھی کر کے اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں کنگھی جتنا فرق کر کے آنے والی صدیوں کے اپنے سامنے لا کھڑا کیا۔ تھوڑا سا وقت اس نے صدیوں کی بھول بھلیاں میں گھوم پھر کر گزارا۔ پھر ہلکی سی جھرجھری لے بولا "ناں بھائی! اپنا راج تو دور دور تک نظر نہیں آتا۔"

"کیوں نہیں آتا؟" دڑ وَ نے خوف زدہ ہو کر کہا "اور پیچھے دیکھو۔ بالکل پیچھے چلے جاؤ۔ اس کے بعد میں بھی ڈھونڈو۔"

"وہاں بھی ان ہی لوگوں کے راج اور ان ہی کی راج دھانیاں ہیں۔" راڑا نے بالکل پیچھے دیکھ کر کہا۔

"اور ہم؟" دڑ وَ نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہم اسی طرح ہیں۔" راڑا نے ذرا سی آنکھیں اور میچ کر کہا "ہمارے دسر، بھیس اور کپڑے بدل گئے ہیں پر ہمارا آسمان وہی ہے جو راج پاٹھ والوں نے طے کر دیا ہے۔ ہم ہنر مند، محنت کش، کارگر اور زحمت کش ہیں۔"

"ہم کو مار مار کر بھگا رہے ہیں سرکنڈوں کے جنگل میں سے؟" دڑ وَ نے پوچھا۔

"ناں ناں ناں" راڑا نے مسکرا کر کہا "مار نہیں رہے، ہم سے کام لے رہے ہیں اور ہم سے بڑے خوش ہیں۔"

"خوش ہیں؟" دڑ وَ نے حیران ہو کر پوچھا "واقعی خوش ہیں؟"

"بہت خوش، بہت نہال، پرسن، دل شاد!"

"دل شاد؟" دڑ وَ اپنی جگہ سے اچھلا۔

"ہم پر نظمیں لکھ رہے ہیں"۔ راڑا نے کہا "ہمیں اپنے پیارے محنت کش، محبوب مزدور، دلارے دہاڑی دار، کڑے کسان اور قیمتی کاشت کار کہہ کہہ کر بلا رہے ہیں اور ہم سے بہت ہی خوش ہیں۔"

"سچ کہہ رہے ہو بادشاہ؟"

"بالکل سچ، بالکل صحیح" راڑا نے کہا "ہمارے گیت بھی گا رہے ہیں اور ہماری جے بھی بلا رہے ہیں۔ ہمارے حقوق پر پوتھیاں، پستکیں، کتابیں اور حکم نامے لکھ رہے ہیں۔ ہماری مورتیاں اور تصویریں بنا رہے ہیں۔"

"اور ہمارے راج سنگھاسن اور تخت اور تاج؟" دڑ وَ نے پوچھا۔

"وہ ان ہی کے پاس ہیں اور ان ہی کے پاس رہیں گے۔" معزول بادشاہ نے کہا "اب تخت و تاج پر اور گدی سنگھاسن پر ہنر مندوں، محنت کشوں، کاری گروں کا جلوہ نہ ہوگا۔"

"وہ کیوں؟" دڑ وَ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تو راڑا نے بہت دور اڑتے ہوئے غبار کو اپنی طرف آتے دیکھ کر آرام سے کہا "وہ اسے لیے کے دستور بدل گیا ہے۔ اب حکومت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بول بچن کے بادشاہوں اور واذ کار گفتار اور بیان کلیان کے راجوں کے

پاس رہے گی...... ہنر مندوں کا، کاری گروں اور محنت کشوں کے پاس نہیں۔"

" کیوں نہیں، کیوں نہیں۔" راڑا نے تسلی آمیز لہجے میں کہا" راج پاٹھ بول بھاشن والوں کے لیے ہوگا اور گیت سلامیاں راج مستری کے لیے ہوں گی۔ تخت اور تاج علم والوں کے پاس رہے گا جبکہ شاعری شاباشی ہنر مندوں، محنت کشوں کے لیے ہوگی۔ تخت اور تاج علم والوں کے پاس رہے گا جبکہ شاعری شاباشی ہنر مندوں، محنت کشوں کے لیے ہوگی۔ بادشاہی اور حکمرانی بے ہنر، بے محنت، بے تعلق، بے اعتبار گفتگو باز واور پھوکے اپدیشکوں کے پاس رہے گی جبکہ تھاپی تھاپڑا کسان کاشت کار کے لیے ہوگا۔ رائل فیلی ذکر اذکار اور باتیں کرنے والوں کی ہوگی اور پچکاری چمکار کی رائلٹی ہنر مندوں کو ملے گی۔"

ابھی دڑوَ کچھ اور پوچھنے والا تھا کہ اس کے اردگرد اندھیرا چھا گیا۔ راڑا نے دیکھا کہ سرکنڈے کے ساگر میں باغیوں کے جم غفیر نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے اور ان کی زندگیوں کا آخری لمحہ آن پہنچا ہے۔

جب فتح مند باغی بادشاہ اور وزیر کی لاشیں سرکنڈوں سے گھسیٹ رہے تھے تو گھسیٹنے والوں میں خوبرو نوجوانوں کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جو بڑی خوش الحانی کے ساتھ طربیہ مرثیہ پڑھ رہا تھا...... اپنی فتح مندی اور گدی نشینی پر مسرور بھی تھا اور دونوں محنت کشوں کی موت پر نوحہ خوانی بھی کر رہا تھا!

شازیہ کی رخصتی

پھیل کے چندر مکھے ،سیت کا پر پڑے
دھن کڑے سلام کر
بیم جاوی پھیل کر
دھلیم تاڑے لاگ پھل
لاگ تار سبا سطور
بڑیا لوگ میری اڑیا،لوگ سمندر کا سکا
بڑے پھل کے دیا چام
کرے است نام،اویس کرے

میں کوئی ہر روز تو اس رقیہ کا اجارن نہیں کرتا۔البتہ کبھی کبھی جب میری طبعیت پر بوجھ ہو اور میرا دل روز روز کی سیر سے اکتا کر ایک ہی جگہ قیام کرنے پر اصرار کرے تو میں اپنے پچھلے آنگن میں پرانے تحت پوش پر بیٹھ کر اس منت کا جاپ شروع کر دیتا ہوں۔تھوڑی دیر کے بعد میرا اندر گونجنے لگتا ہے اور کوئی آدھ گھنٹے بعد میں سراپا گونج بن جاتا ہوں۔پھر مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں رہتی اور میرے سامنے کے نظارے ٹھٹھک کر مجھے دیکھنے لگتے ہیں۔

دراصل یہ رقیہ حاکم وقت کو رام کرنے کا ہے اگر اس کی خدمت میں جانے سے پہلے دو مرتبہ پٹی باندھتے ہوئے اس منتر کا جاپ کر لیا جائے اور ایک مرتبہ اس کے سامنے حاصر ہو کر دل ہی دل میں اسے روانی کے ساتھ پڑھ لیا جائے تو نہ صرف سامنے کا حاکم شیشے میں اتر آتا ہے بلکہ اس کا حاکم جس کے وہ اثر میں ہوتا ہے اور جس کی آشیر واد سے وہ حکمرانی کر رہا ہوتا ہے،وہ بھی مہربان ہو کر نمی پسندی کے باوجود تغیر کن قضارا کر دیتا ہے۔یہ عجیب وار تا ہے اور اس کے الفاظ کی موہنی اس سے بھی عجیب ہے!اس عہد میں کہ امریکہ اور اس کے پانچ پیاروں نے عراق پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی،کوئی بھی حاکم وقت کسی پر بھی ناراض ہو سکتا ہے اور موقع محل دیکھے بغیر،کبھی بھی کسی کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتا ہے۔یہ عہد بادشاہوں،مملوکوں اور آمروں کا نہیں......یہ عہد آزادوں،آزاد منشوں اور حریت

پسندوں کا ہے۔اب زمانہ اکیسویں صدی میں داخل ہو رہا ہے۔اس لئے لوگ آزادی کی قدر و قیمت جان گئے ہیں اور رجعتوں کی وادیوں میں گھرے ہوئے بدنصیبوں کو آزاد کرانے کے لئے ان پر وقفے وقفے بعد میزائل بھیج رہے ہیں۔ایسے دور مین ہر شخص کو یہ رقیہ یاد ہونا چاہیے اور حاکمان وقت کو مہربان رکھنے کے لئے اب کا جاپ کرتے رہنا چاہیے۔

چونکہ آپ نے کبھی میرا گھر نہیں دیکھا اس لئے آپ کو معلوم نہیں کہ میں صبح کہاں ہوتا ہوں اور شام کے وقت کہاں بیٹھتا ہوں۔جن لوگوں کی ہارٹ بیٹ میں ایک دھڑکا لگا ہوتا ہے اور جن کو "بیٹا بلاکر" کی گولی کھا کر اس دھڑکے کے آگے کھٹکا لگانا پڑتا ہے، وہ لوگ سردیوں میں بہت سویرے سیر پر نہیں جاتے۔جب دوسرے لوگ سیر سے واپس آکر دفتر جانے کی تیاری میں مصروف ہوتے ہیں، اس وقت "بیٹا بلاکر" والے زبان تلے گولی دبا کر سیر پر نکلتے ہیں اور ڈاکٹر کے دیئے ہوئے ٹارگٹ سے آدھا چکر پہلے آجاتے ہیں۔

لیکن میں اس روز سیر پر گیا ہی نہیں۔اپنے گھر کے پچھلے صحن میں جہاں کوئی نہیں آتا، وہاں غیر ضروری چیزوں کا ذخیرہ پڑا ہے اور کسی کو ان کی طلب نہیں۔میں اپنے پرانے تخت پوش پر بیٹھا جاپ کر رہا ہوں۔جاپ کی گھومن گھیری نے میرے من کے اندر ایسے لپیٹے دینے شروع کر دیئے جیسے بل دار پراٹھا بنانے کے لئے پیڑے کو مروڑے دیئے جاتے ہیں۔میں نے سوچا اب کچھ ہوگا۔مگر کچھ نہ ہوا اور جب میری لپیٹیں کھلنے پر آئیں اور اندر الٹا تکلا چلنے لگا تو مجھے یقین ہو گیا کہ اب کچھ نہیں ہوگا۔اور اسی وقت یہ سب کچھ ہوا۔

ایک خوبصورت، سرو قد، بھری بھری، میدہ اور ہلدی لڑکی میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔اس کے بال بھورے اور آنکھیں بادامی تھیں۔پاؤں میں کپڑے کے کڑھے ہوئے سینڈل اور کلائی پر سنہری زنجیر میں نقطہ بھر روپہلی گھڑی تھی۔

اس نے کہا" میرا نام شازیہ ہے اور میں اپنے دھیان میں چلی جا رہی تھی کہ مجھے تمہاری آواز نے گھیر لیا۔"

صبح صادق اس بے وقوف لڑکی کو اپنے سامنے ایسی لایعنی باتیں کرتے دیکھ کر میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا تو اس نے ذرا اونچی آواز میں کہا" میرا نام شازیہ ہے اور میں وادی سے آئی ہوں۔"

"لیکن وادی کے تو سارے راستے مسدود ہو چکے ہیں اور وہاں سے کوئی نکل نہیں سکتا۔"

"مجھے دو سپاہیوں اور ایک سویلین نے ریپ کیا ہے اس لئے میں وہاں سے نکل آئی ہوں۔"

"تم ریپ ہو چکی ہو۔" میں نے اس کے چہرے کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اپنے گھر سے صرف سو گز کے فاصلے پر!" پھر اس نے اپنی دائیں جانب اشارہ کر کے کہا" یہ میرے ہزبینڈ ہیں، عمران۔"

میں نے اس کے ہزبینڈ کو غور سے دیکھا۔وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

کہنے لگی ____ "تمہاری شادی کو ابھی پورے چھ ماہ بھی ہوئے تھے کہ سپاہیوں نے مجھے ایک چنار کے پیچھے لے جا کر ریپ کر دیا۔"

"اور عمران کہاں تھا اس وقت؟" میں نے غیر مرئی عمران کو غصے سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس کو انہوں نے گولی مار کر زخمی کر دیا تھا۔"

"لیکن انہوں نے اسے گولی کیوں ماری؟"

"مجھے ریپ کرنے کو۔"

"اور انہوں نے تمہیں ریپ کیوں کیا؟"

"وادی کی موجودہ وضع برقرار رکھنے کو۔"

"تم نے اپنا نام شازیہ بتایا ناں!"

"شازیہ عمران ____ لیکن اب میں آزاد ہو چکی ہوں اور میرا نام صرف شازیہ ہے۔"

"لیکن تم ادھر کیسے آ گئیں شازیہ، اس طرف؟"

"میں تو اپنے دھیان میں چلی جا رہی تھی انکل کہ آپ کے بول کی ایک سنگل نے مجھے پیچھے کھینچنا شروع کر دیا۔"

"میرے بول کی سنگلی نے؟"

" کچھ آپ آوازیں دے کر بلا نہیں رہے تھے، کسی کو منگا نہیں رہے تھے "

میں نے کہا "میں تو جاپ کر رہا تھا، اور جب میری طبعیت پر بوجھ ہو تو میں اسی طرح سے جاپ کیا کرتا ہوں۔ اسی وجہ سے میں آج سیر پر بھی نہیں گیا۔"

شازیہ نے کہا "ہم پر بڑا ظلم ہو رہا ہے اشفاق صاحب، اور ہمارا کوئی پرسان حال نہیں۔"

میں نے کہا " کبھی تم مجھ کو انکل کہتی ہو، کبھی اشفاق صاحب۔ تمہارا کیا ہے؟"

اس نے کہا "میرا ارادہ ہے کہ آپ ادیب اور شاعر ہم پر ہونے والے ظلم کے خلاف آواز اٹھائیں اور ظالم کو قرار واقعی سزا دلوائیں!

"

میں نے کہا "تم چاہتی کیا ہو شازیہ؟"

"میں چاہتی ہوں کہ ہمارے ساتھ جو وعدہ کیا تھا، اسے پورا کیا جائے۔ وہ وعدہ جو ساری دنیا کے سامنے، ساری دنیا کے فورم میں، ساری زبانوں میں چھاپ کر کشمیریوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔"

میں نے کہا "ہم تو اس وعدے کے پابند ہیں اور اس پر کاربند ہیں۔ تمہارے مالک جس کے قبضہ قدرت میں تمہار جان ہے، وہی اس وعدے سے مکر گئے۔"

" مگر آپ بھی تو اس معاہدے کے ایک شریک ہیں۔" شازیہ نے کہا "اور آپ کی بھی تو کوئی ذمہ داری ہے۔ پھر آپ اپنی ذمہ داری پوری کیوں نہیں کرتے؟"

میں نے کہا "ہماری ذمہ داری مجبوری کی نذر ہو چکی ہے، اس لئے ہم معذور ہیں اور ہم سے یہ......."

اس نے میری بات کاٹ کر ذرا غصے سے کہا "انکل ہم مرتے رہیں گے، ریپ ہوتے رہیں گے، جلتے رہیں گے اور آپ اپنی

مجبوری کی وجہ سے خاموش بیٹھے رہیں گے۔" پھراس نے تیوری چڑھا کر کہا" میں ایک عام آدمی سے بات نہیں کر رہی، ایک ادیب سے ہمکلام ہوں۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور یوگا کا ایک چھوٹا آسن کھینچ کر بیٹھ گیا۔ میرا خیال تھا وہ میرے اس لاتعلقی کے رویے سے تنگ آ کر چلی جائے گی، لیکن وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ میرا خیال ہے جو عورت ایک مرتبہ ریپ ہو جاتی ہے، وہ ڈھیٹ سی ہو جاتی ہے۔ اس کو مردوں پر، عورتوں پر، بچوں پر حتیٰ کہ جانوروں تک پر کوئی وشواش نہیں رہتا۔ وہ اپنی ماں سے بھی ڈرنے لگتی ہے..... جس نے اسے جنم دیا تھا، دودھ پلایا تھا، دھوپ مین لٹا کر کڑوے تیل کی مالش کی تھی، آنکھ میں سرمہ ڈالا تھا، بتی دی تھی، گرائپ واٹر پلایا تھا، رات کو دو مرتبہ جانگیا بدلا تھا، ہر بار سوکھے نہالچے پر لٹایا تھا۔ وہ اپنی ماں سے اس لئے ڈرتی ہے کہ اس نے جان بوجھ کر اسے پال پوس کر بڑا کیا تھا اور بڑا کر کے جوان کر دیا تھا۔ اور اسی جوانی کی وجہ سے وہ ریپ ہو گئی۔ وہ ڈرتی ہے۔

وہ اپنے باپ کے خلاف نفرت سے بھر جاتی ہے اور بلغم کی زیادتی کی وجہ سے بار بار تھوک اگلتی ہے۔ اس باپ کے خلاف ہو جاتی ہے جو اسے کندھے پر بٹھا کر بازار لے جاتا تھا، اماں کے روکنے کے باوجود اسے قلفی کھلاتا تھا، چرخ چونڈے میں بٹھا کر گول گول جھونٹے دلاتا تھا۔ جیسے جیسے ڈرتی تھی، باپ کے سینے سے چمٹتی جاتی تھی۔ جس قدر تیز دل دھڑکتا تھا، اسی تیزی سے باپ کی بغل سے جھانکتی ہوئی آنکھیں جھپکتی تھیں۔ اس کو اپنا بابل زہر لگتا تھا .... کہ وہ اس کمیونٹی سے تعلق رکھتا تھا جس نے اسے ریپ کیا۔ بھلا بابل کو کیا ضرورت تھی کہ ان لوگوں جیسا نظر آئے جو دھیوں بہنوں کو ریپ کر دیتے ہیں۔

شازیہ نے ہولے سے ایک مرتبہ پھر "انکل" کہا اور جب میں نے چہرہ اس کی طرف اٹھا کر پوچھا" کیا ہے؟ تو وہ خوف زدہ سی ہو گئی۔ شرمندگی ٹالتے ہوئے بولی" آپ کا کیا خیال ہے ہمارا کشمیر آزاد ہو جائے گا کہ نہیں؟"

میں نے کہا" مجھے کیا معلوم، میں کوئی جوتشی ہوں۔ ویسے میری آرزو تو ہے کہ آزاد ہو جائے کیونکہ آزادی سب سے بڑی نعمت ہے .... لیکن میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

اس نے مسکرا کر میری طرف غور سے دیکھا اور ہنس کر کہنے لگی" انکل جی یہ کسی ادیب کے فقرے نہین لگتے، کالم نویس کی ریکارڈنگ معلوم ہوتی ہے۔ میرے طرف دیکھ کر بات کیجئے۔"

میں نے اپنا چہرا اوپر اٹھا کر کہا" دیکھو بی بی! اگر تم اپنا کشمیر آزاد کرانا چاہتی ہو تو بھارت کے ادیبوں اور دانشوروں سے بات کرو، ان کے ضمیر کو جگاؤ اور ان کی اخلاقی اقدار کو جھنجوڑو۔ شاید ان میں کوئی رائٹر تم کو ایسا مل جائے جو تمہارا ساتھ دے۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی اور اپنی بیاہتا انگلی میں عروسی انگشتری گھمانے لگی۔ میں نے کہا" اگر وہاں تم کو ایک بھی با اصول اور حقیقت پسند ادیب مل گیا تو تمہاری پرغال وادی پھر سے زندہ و سرسبز ہو جائے گی۔ لیکن مجھے اس کی امید نہیں۔

شازیہ نے پرامید لہجے میں کہا" میں افسانہ نگار رام لال سے ملی تھی اور وہ میرے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آئے تھے لیکن انہوں نے معذرت کر لی کہ ان کا میدان افسانہ نگاری ہے، سیاست نہیں۔ وہ حالیہ لکھنوی تہذیب اور اس کی تیزی سے بدلتی ہوئی قدروں کے

بارے میں کہانیاں لکھتے ہیں۔ان کو کشمیر کا کچھ پتہ نہیں۔"

میں نے کہا" رام لال بہت ہی پیارا انسان ہے۔اس کو واقعی کشمیر کا کچھ پتہ نہیں ہوگا۔وہ اس قدر معصوم آدمی ہے کہ اس نے آج تک سوچا بھی نہیں ہوگا کہ کشمیر ابھی تک غلام ہے۔بھارت آزاد ہو گیا، پاکستان معرض وجود میں آ گیا ہے لیکن کشمیر ابھی تک ہری سنگھ کی معنوی اولاد کے قبضے میں ہے۔"

شازیہ نے کہا" میں نے ان کی انسان دوستی اور فضائل آزادی کی کہانیوں کا حوالہ دے کر ان کی منت کی کہ وہ صرف قلم سے ہمارا ساتھ دیں اور اپنی حکومت کو اس کو وعدہ یاد دلائیں لیکن وہ مانے نہیں اور کہنے لگے..... بی بی میں جھگڑوں میں نہیں پڑتا۔میری لائن انسان دوستی ہے، سیاست نہیں۔"

میں نے کہا" شازیہ بی بی! میں اس کی مجبوری کو سمجھتا ہوں۔وہ بہت ہی بھلا انسان ہے، مگر مجبور ہے۔اپنی اپنی گورنمنٹوں کے آگے سب ہی مجبور ہوتے ہیں۔تمہیں اس پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے تھا۔"

شازیہ کہنے لگی" میں نے ان پر بالکل بوجھ نہیں ڈالا۔کبھی ملاقات ہو تو ان سے پوچھ لیجئے گا۔بس چھوٹا سا تقاضا کر کے واپس آ گئی۔البتہ گوپی چند نارنگ صاحب سے میں دو مرتبہ ملی۔وہ چونکہ سرکار دربار میں ایک اونچا مقام رکھتے ہیں اور ہر طبقے کے لوگ انہیں اونچا مقام دیتے ہیں اس لئے میں ان سے ایک مرتبہ مایوس ہونے کے بعد بھی ملی اور بڑی دیر تک ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھی رہی۔"

" پھر کیا کہا انہوں نے؟" میں نے پوچھا۔

" کچھ نہیں انکل، کہنا کیا تھا۔سر جھکا کر بیٹھے رہے اور بڑی دیر تک میری بات کا جواب نہ دیا۔پھر سر اٹھا کر کہنے لے..... شازیہ میں اس معاملے میں تمہاری، تمہاری گھر والوں کی یا تمہارے کشمیر کی کچھ مدد نہیں کر سکتا۔یہ میری فیلڈ نہیں ہے۔میں گرائمر، عروض اور ساختیات کا سٹوڈنٹ ہوں۔اس سلسلے میں اگر تم کچھ پوچھنا چاہو تو میں حاضر ہوں۔اس کے علاوہ اور کسی بات کو میں نہیں جانتا..... میں نے کہا، سر فوجی ہم کشمیریوں کو چن چن کر مار رہے ہیں اور ہم سے ہمارے کشمیری ہونے کا بدلہ لے رہے ہیں کہ ہم نے ریفرنڈم کا ذکر کیوں کیا۔آپ ادیب اور شاعر اور نقاد اور دوسرے دانشور اپنے قلم کو ہماری سہائتا اور رکھشا کے لئے استعمال کریں۔اور ہمارا حق ہمیں دلوائیں۔"

میں نے کہا" شازیہ! نارنگ صاحب بڑے دردمند آدمی ہیں اور ان کا دل ہر دکھی انسانی کے لئے بڑی شدت سے دھڑکتا ہے۔وہ کشمیر کے لئے کیوں اپنی آواز بلند نہیں کریں گے!"

شازیہ نے کہا" وہ فرما رہے تھے کہ وہ اپنی فیلڈ سے باہر نہیں جا سکتے۔ان کی ساری علمی تربیت امریکہ میں ہوئی اور وہ وسکنسن یو نیورسٹی میں کئی سال تک پڑھاتے رہے ہیں۔کہہ رہے تھے کہ مغربی ممالک کے سکالر اس کو حد درجہ کی خیانت سمجھتے ہیں اگر کوئی سکالر اپنی فیلڈ چھوڑ کر اناپ شناپ باتیں کرنے لگے اور بزعم خود ہر فن مولا بن جائے۔میں یہ تو کر سکتا ہوں کہ " اردو زبان کی ترویج و ترقی میں جموں اور کشمیر کا حصہ " پر ایک کتاب، ایک تھیس یا ایک مضمون لکھ دوں لیکن اس کی ہیئت کذائی، موجودہ صورت اور حیثیت عرفی میں کسی قسم کی تبدیلی کا

کوئی سجھاؤ نہیں دے سکتا۔"

میں نے کہا" تم بہت ہی ضدی سی لڑکی دکھائی دیتی ہو، اپنی من مانی کرنے والی۔"

شازیہ نے گردن گھما کر عمران سے پوچھا" کیوں، میں ضدی ہوں عمران؟" لیکن عمران وہاں موجود ہوتا تو اس کی بات کا جواب دیتا۔ وہ کھسیانی سی ہو کر میرے بازو کو کھبا نوچنے لگی اور فقرے جھلا جھلا کر کہنے لگی" اٹھئے ناں انکل، ہمارا ساتھ دیجئے۔ ہماری مدد کیجئے۔ ہماری سروں پر ہاتھ رکھئے۔ ہم کو بھی اپنے جیسی آزادی لے کر دیجئے۔"

میں نے جھلا کر کہا" یہ کوئی آزادی ہے، کوئی فریڈم ہے۔ کوئی اظہار رائے کر سکتا ہے کھل کر۔ کوئی اپنے دل کی بات کر سکتا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کا کوئی مقام ہے اس جگہ۔ کوئی ان کے لئے اچھی نوکریاں یا اچھے رتبے یا پلاٹ اور پینشنیں ہیں کہ معاشرے میں ان کا مقام ہو، ان کی بات سنی جائے، اس پر توجہ دی جائے۔ یہ سیٹھوں کا اور تاجروں کا اور جاگیرداروں کا ملک ہے۔ یہاں ہماری نہیں، افسر شاہی کی عزت زیادہ ہے.... بے ایمانوں، مکاروں اور چور بازاروں کی زیادہ وقعت ہے اور جب تک میری دقعت نہیں ہوگی، میں تمہارا کسی قسم کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ جب تک میرا اپنا کوئی مقام نہیں ہوگا، تم کو اور تمہاری کمیونٹی کو کوئی مقام نہیں دلوا سکتا۔ تم کو بھارت کے ادیبوں اور شاعروں، فلم سازوں، تھڑا اور تھیٹر والوں کا سہارا پکڑنا چاہیئے۔ ان سے مدد مانگنی چاہئے۔"

شازیہ نے کہا" ہم شام بینے گل سے بھی ملے تھے، میں اور عمران...... اور ستیہ جیت رے سے بھی۔ لیکن انہوں نے بھی معذرت کر لی کہ چونکہ وہ نادرن انڈیا کے معاملات کو اچھی طرح سے نہیں سمجھتے اس لئے معذور ہیں۔ وہ بنگال کی حد تک لوگوں کے دکھ درد اور ان کی درگھٹنا سے واقف ہیں، اس سے باہر کچھ نہیں جانتے۔ پھر وہ یہ سارے دکھ درد صرف فلم کے فریم ورک میں پیش کر سکتے ہیں اور ان کو سینسر کی پابندی اور گورنمنٹ کی پالیسی کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

میں نے کہا" دیکھو شازیہ تم اپنا مانی الضمیر ٹھیک سے ان کو سمجھا نہیں سکی ہو۔ تم نے وہاں بھی اپنے ریپ کا قصہ کر دیا ہوگا کہ چونکہ یہ فلم والے ہیں اس لئے ریپ میں زیادہ دلچسپی لیں گے۔"

شازیہ نے کہا" نہیں انکل، اس وقت تک تو میرا ریپ ہوا ہی نہیں تھا۔ اس وقت تو ہم شادی کے فوراً بعد سارے ہندوستان کے ٹوئر پر نکلے ہوئے تھے۔" پھر اس نے ہنستے ہوئے غیر مرئی عمران کی طرف دیکھ کر کہا" بمبئی میں اچانک عمران کا اپنڈیکس کا آپریشن کرنا پڑا...... آناً فاناً آدھی رات کے وقت۔ ابا جی بذریعہ ٹیلکس پانچ ہزار روپے بھیجے سری نگر سے۔"

میں نے کہا" ستیہ جیت رے کو تو سمجھ میں آنی طاہئے تھی تمہاری بات۔ وہ تو بڑا ہمدرد آدمی ہے۔"

" پہلے پہل تو آتی رہی انکل" شازیہ نے سنجیدگی کے ساتھ کہا" لیکن پھر وہ دونوں ہی انکاری ہو گئے کہ تمہاری اردو بہت مشکل ہے اور ہم مشکل اردو نہیں سمجھ سکتے۔ پتہ نہیں تم کیا کہہ رہی ہو۔"

میں نے کہا" ایک وہ دوسرا بھی تو ہے گلزاری لال۔"

" گلزاری نہیں انکل" شازیہ نے بات کاٹ کر کہا" گلزار! اس کو میں تو نہیں ملی البتہ ہم کشمیریوں کا ایک اور وفد انہیں ملا تھا۔ انہوں

نے بھی ہماری بات آگے پہنچانے سے انکار کر دیا۔"

" کیوں، اس نے کیوں انکار کر دیا؟ اس نے تو غالب پر بڑی اچھی سیریز بنائی ہے۔"

"غالب پر اچھی سیریز بنانے کا یہ مطلب تو نہیں کہ آدمی بہتر انسان بن جائے۔ وہ تو میلہ لوٹنے کی بات ہوتی ہے۔ جو لوٹ گیا سو لوٹ گیا" ______

" پھر کیا کہا انہوں نے؟" میں نے پوچھا۔

"انہوں نے کہا، ہم تمہارے کشمیر میں آ کر فلم شوٹنگ تو کر سکتے ہیں۔ اس شوٹنگ سے تم کو مالی فائدہ تو پہنچا سکتے ہیں، لیکن تمہاری آزادی کے لئے کچھ نہیں کر سکتے کہ یہ ہماری پالیسی نہیں ہے۔ ہم جمہوریت پسند لوگ ہیں اور کسی کے ذاتی معاملات میں دخل نہیں دیتے۔"

میں نے اچانک تڑپ کر اپنے زانو پر زور کا ہاتھ مارا اور چیختی آواز میں کہا، شازیہ اگر کہیں تم علی سردار جعفری اور ان کے گروپ سے مل لیتیں تو تمہارے دکھ دلدر آن واحد میں دور ہا جاتے۔ تم کو تلنگانہ یاد ہے۔"

اس نے کہا" مجھے تو یاد نہیں، میرے اباجی اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔"

میں نے کہا" اپنے اباجی ایک مرتبہ ان کی خدمت میں بھیج کر دیکھو اور پھر مشاہدہ کرو کہ ادیب اور لیکھک کیا کچھ کر سکتے ہیں!"

اس نے کہا:" آپ اپنی بابت فرمائیں، علی سردار جعفری کو بعد میں دیکھ لیں گے۔"

"بعد پر بالکل نہیں چھوڑنا۔" میں نے زور دے کر کہا" یہ لوگ خالص انسان دکھ درد کا مداوا کرنے کے لئے اس دنیا میں آئے ہیں اور اپنی جانوں کا نذرانہ دے کر واپس چلے جائیں گے۔ یہ قید و بند کی صعوبتوں سے بھی گزرے ہیں اور دار و رسن کی کشمیر کے بے یار و مددگار لوگوں پر ظلم ہو رہا ہے تو یہ ظم ہو رہا ہے تو یہ ظالموں کی رگوں سے خون کھینچ کر ان کے قلعوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ تم ان کے ساتھ رابطہ کرو، اور فوری طور پر کرو۔ انہیں شاید ابھی تک کسی نے خبر نہیں دی کہ کشمیر پر کیا گزر رہی ہے اور وہاں کے لوگوں پر کیا کیا ظلم ہو رہے ہیں "۔

شازیہ ایک تمسخر کے ساتھ ہنسی اور پھر مجھے غور سے دیکھنے لگی۔

میں نے اسے یقین دلایا کہ اگر کہیں سے علی سردار جعفری صاحب کو پتہ چل گیا کہ کشمیر کے ایک معصوم شخص پر بھی ظلم ہوا ہے تو وہ ایسی دلدوز نظم لکھ کر ضمیر انسانیت کو بیدار کر دیں گے کہ ظالموں کی آنے والی سات پشتیں اس کے خوف سے کانپتی رہیں گی۔ تم ان کو اطلاع تو کر کے دیکھو۔ اور اگر کسی وجہ سے انہیں اطلاع نہیں بھجوا سکتی ہو تو اس وقت کا انتظار کرو کہ انہیں ادھر ادھر سے پتہ چل جائے اور ان کی غیرت جلال میں آ جائے۔

شازیہ نے آگے بڑھ کر میرے کندھے پر اپنا ہاتھ بالکل اسی انداز میں رکھا جیسے میری پوتی مجھے اپنی محبت کا یقین دلانے کے لئے رکھا کرتی ہے۔ میں نے گردن گھما کر اس کے ہاتھ کو غور سے دیکھا تو اس کا نہ تو کوئی دباؤ تھا اور نہ ہی کسی لمس کا احساس تھا۔ آنکھیں نچا کر کہنے لگی " بابا جان آپ ان لوگوں کو چھوڑیں اور اپنی بتائیں۔ آپ ہماری کہاں تک مدد کر سکتے ہیں؟"

میں نے کہا" تمہارے لئے میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔تم کو دوائیاں اور کمبل بجھوا سکتا ہوں۔بے گھروں اور لاوارثوں کے لئے ٹینٹ اور پلاسٹک کے بڑے Containers.....

شازیہ نے کہا" ہمیں ان چیزوں کی ضرورت نہیں، ہمیں آپ کی تحریری آشیرواد کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا" میں اخباروں میں مضمون لکھ سکتا ہوں، آرٹیکل چھپوا سکتا ہوں..... کام مرتب کروا دیتا ہوں۔"

اس نے کہا" اخباری رائٹر کی حیثیت سے نہیں، ادیب کی حیثیت سے لکھ کر دیجئے۔ہمیں ادیب کی تحریر کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا" تم کو یاد ہے ہم ادیبوں اور پروفیسروں نے ویت نام کی جنگ کے خلاف بہت بڑا جلوس نکالا تھا۔"

کہنے لگی" ایسے ہی ایک جلوس کے ہم کشمیری بھی متمنی ہیں۔"

میں نے کہا" ویت نام کی جنگ کے خلاف ہم نے بھنگیوں کی توپ سے جلوس نکالا تھا اور گورنر ہاؤس تک مارچ کرتے ہوئے گئے۔مال روڈ پر دونوں طرف لوگ سادھے کھڑے تھے۔صرف تالیوں کی گونج ہمارا خیر مقدم کر رہی تھی۔"

شازیہ نے کہا" مجھے معلوم ہے۔"

میں نے کہا" ہمارے خوف سے اس وقت کے گورنر نے اپنے آہنی پھاٹک بند کر لئے تھے۔"

کہنے لگی" ایسا ہی ایک جلوس کشمیر کے لئے بھی ہو ...... پرامن، پرخلوص، نعروں کے بغیر، آنسوؤں کے ساتھ۔"

میں نے کہا " آج سے اٹھائیں تیس برس پہلے جب منڈیلا قید ہوا تھا، اس وقت بھی ہم نے زبردست احتجاج کیا تھا۔"

کہنے لگی" کشمیر پر کوئی بڑا شاعر چھوٹی سی نظم لکھ کر کسی ادبی پرچے میں چھپوائے گا تو وادی کے لوگوں کے آنسوؤں کا نذرانہ لے گا، خوشی کے آنسو بابا جان!"

میں نے کہا" ہم نے افریقہ کے کالے لوگوں پر بے شمار نظمیں لکھی ہیں۔ہمارے دل میں درد ہے۔"

کہنے لگی" ہم سات پشت کے کشمیری اپنے ہی دیس میں بے گھر ہو گئے ہیں بابا جان!"

میں نے کہا" ہم نے فلسطین کے بے گھروں پر افسانے بھی لکھے ہیں اور نظمیں بھی لکھی ہیں۔ہم کسی سے ڈرتے نہیں۔"

کہنے لگی" ہم بڑی مشکل میں ہیں، ہمارا ساتھ دیں۔ہمیں صرف آپ کی آواز کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا " ہم نے چی گویرا، کاسترو لوممبا ہر ایک حریت پسند کا ساتھ دیا ہے۔ہم کسی سے ڈرتے نہیں ہیں۔"

کہنے لگی" جس وقت آپ کھانا کھاتے ہیں، وی سی آر دیکھتے ہیں، گرم پانی سے نہاتے ہیں، دھوپ میں اخبار پڑھتے ہیں، اپنی نواسیوں کے ساتھ "فالودی لیڈر" کھیل رہے ہوتے ہیں.......اس وقت ہمارے بچوں کے ہاتھ پیچھے باندھ کر انہیں شوٹ کرنے کے لئے ٹرکوں میں بٹھایا جا رہا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا" ہم نے ہر ظلم کے خلاف لوح و قلم کی پرورش کی ہے اور ہم ہر ظلم کے خلاف زبانی اور تحریری آواز اٹھاتے رہیں گے۔"

شازیہ نے کہا" اشفاق صاحب! پھر ہم پر بھی ایک لمبا سا افسانہ لکھئے۔ایک لمبی سی بات کیجئے۔ایک سچا سا ڈرامہ پروڈیوس کیجئے

۔"

میں نے غضب ناک آنکھوں سے شازیہ کی طرف دیکھا اور چڑ کر کہا" تم میرے ہی پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔اس ملک میں دوسرے رائٹر بھی تو ہیں اور ادیب ہیں،اور شاعر ہیں،اور قلم کار ہیں۔"

اس نے اپنی دونوں ہیتیاں میرے کندھوں پر رکھ کر محبت سے کہا" وہ اس لئے بابا جان کہ آپ سینئر رائٹر ہیں اور سینئر رائٹروں پر چھوٹوں کا حق فائق ہوتا ہے۔"

میں نے کہا" قاسمی صاحب مجھ سے بھی سینئر ہیں۔ضمیر مجھ سے دو سال بڑا ہے۔شوکت صدیقی ڈیڑھ سال سینئر ہے۔میرزا صاحب تین سال بڑے ہیں۔تم ہاتھ دھو کر میرے ہ پیچھے کیوں پڑ گئی ہو۔بیسیوں مجھ سے سینئر اور سارے ہی مجھ سے زیادہ نامور اور محبوب مصنف ہیں،پھر تم اکیلے مجھی پر کیوں بوجھ ڈالے جا رہی ہو؟"

کہنے لگی" کہہ تو رہی ہوں کہ آپ ہی سب سے بڑے ہیں اور آپ ہی سینئر ہیں،لیکن آپ نے خوف کے مارے دوسروں کی عمریں گنوانا شروع کر دیں۔اب آپ سے کیا کہو....... آپ نے تو دس سال تک ایک سطر بھی افغان مجاہدین پر نہ لکھی اور لاکھوں مجاہدین آپ کی نظروں کے سامنے آپ کے گھر کی دہلیز پر شہید ہو گئے۔"

میں نے کہا" وہ سطر تو ہم نے اس لئے نہ لکھی کہ ہو آمریت کا زمانہ تھا اور ہم لکھنے والوں کو آمریت سے،ڈکٹیٹر شپ سے اور مارشل لا سے شدید نفرت ہے۔ہم نہیں چاہتے تھے کہ گھٹن کے زمانے میں ہم اپنے الفاظ کی قندیلیں روشن کریں اور بدبخت تاریکیوں کو اپنا قیمتی اجالا عطا کریں۔"

شازیہ کے چہرے پر نفرت کی سبز کائی پھٹی تو شفاف پانی میں اس کے سرخ بھبھوکا چہرے کا عکس نمایاں ہوا۔پھر دیکھتے دیکھتے اس پر ٹھنڈی سیت آسانی رنگ کی ہوائین چلنےلگیں۔اس نے سب کچھ بھول بھال کر میری طرف غور سے دیکھا اور مامتا بھری شفقت کے ساتھ کہنے لگی" میں بہت ہی شرمندہ ہوں کہ میں نے یہاں آ کر خواہ مخواہ آپ کو ڈسٹب کیا۔آپ تو بہت ہی ڈرے ہوئے اور خوف کے مارے انسان ہیں۔"

" تم بکواس کرتی ہو۔" میں نے چیخ کر کہا" اور میرے ہی گھر آ کر میرا اپمان کر رہی ہو۔جاؤ،میں نہیں لکھتا تم پر کوئی کہانی۔کوئی دھونس ہے،کوئی زبردستی ہے!"

شازیہ نے کہا" آپ تو بہت ہی دہشت زدہ انسان ہیں انکل کہ سوائے پاپولر موضوعات کے اور داد دلانے والے عنوانات کے اور کسی موضوع پر قلم ہی نہیں اٹھا سکتے۔دراصل آپ کو نا مقبول ہو جانے کے خوف نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے اور آپ کوئی اصل، اوریجنل اور طبع زاد بات کر ہی نہیں سکتے۔"

تھوڑی دیر وہ محبت کے جذبات سے سرشار اسی طرح کھڑی رہی اور پھر کہنے لگی" آپ کو اس بات کا خوف تو نہیں انکل کہ اگر آپ نے مظلوم کشمیریوں یا ستم رسیدہ افغانیوں کے حق میں کچھ لکھا تو لوگ آپ کو مذہب پسند سمجھنےلگیں گے؟ آپ کو تنگ نظر،کوتاہ بین،قدامت

پسنداور بنیاد پرست کہہ کر روشن خیال دائروں میں آپ کا داخلہ بند کر دیں گے؟ High minded trend setter سوسائٹی سے آپ پر رجعت پسند کا پکا اور پائیدار ٹھپہ لگوا کر آپ کو ادب کی وراثت سے عاق کر دیں گے؟ آپ اس لئے خوف زدہ ہیں بابا جان کہ آپ کو اس عمر میں بھی مقبولیت کے ساتھ جوانی والا عشق ہے۔ میں نے خواہ مخواہ آپ کو پریشان کیا اور ایسے ہی صبح سویرے آپ کے محبوب ورد سے نکالا۔"

پھر وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوگئی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں شرمندگی، لجاجت اور ندامت کا اظہار کرنے لگی۔ میں نے اس بے باک و گستاخ اور دیدہ دلیر لڑکی سے منہ موڑ کر اپنا سر جھکا لیا اور ورد کی طرف پوری طرح توجہ کا دھارا چھوڑ دیا۔

تھوڑی دیر بعد میرا سب سے چھوٹا بیٹا اثیر ہانپتا کانپتا، گھبرایا اور ہڑبڑایا اس متروکہ و منسوخ صحن میں داخل ہوا جہاں میرا تخت پوش رکھا ہے۔ اس نے خوف زدہ ہو کر مجھے کاندھے سے ہلا کر دیکھا کہ میری ٹھوڑی سینے میں بالکل پیوست ہوگئی تھی اور منکا گویا ڈھلک گیا تھا۔

میرے سر اٹھانے پر اس نے چیخ کر کہا "بابا جان! ابھی کون آپ سے مل کر گیا ہے؟"

" کون مجھ سے ملک کر گیا ہے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"ابھی ابھی....... جب میں Gymnasium سے لوٹا ہوں تو ہمارے پھاٹک سے ایک نوجوان جوڑا نکل رہا تھا..... خوبصورت، صحت مند، خوش طبع و خوش خرام______ ان دونوں نے مجھے ایک ساتھ سلام کیا، لیکن میں ان کے سلام کا جواب نہ دے سکا۔"

پھر میرا بیٹا رک گیا_____ اور میں بھی اس کے انتظار میں رکا رہا۔

اثیر نے کہا "ان دونوں کے بدن پر گولیوں کے بے شمار نشان تھے اور ان کے زخموں سے ابھی تک خون رواں تھا۔ یہ کون لوگ تھے بابا جان جو مرنے بھی جا رہے تھے اور آپس میں باتیں بھی کئے جا رہے تھے؟"

میں نے اپنے بیٹے کی بات کا کوئی جواب نہ دیا کہ وہ ان دونوں جنوں، بھوتوں، آسیب زدہ کہانیوں کے ویڈیو لا کر دیکھتا رہتا ہے اور سپر نیچرل پر اعتقاد کرنے لگا ہے۔ لیکن میں زیادہ پریشان نہیں ہوں کہ جب بنک میں اس کا آزمائشی پیریڈ ختم ہو جائے گا تو وہ ایک اچھا کامیاب اور حقیقت پسند بینکر ثابت ہوگا۔ اور اس کو اپنی حفاظت کرنے کے کئی طریقے خود بخود آ جائیں گے۔

بے غیرت مدت خان

www.HallaGulla.com

"تم کو معلوم نہیں اے باچا بیگم! اور اس راز کو میرے جیسی گہرائی سے اور کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا کہ اسباب سوال امت بس ایک ہی ہے اور وہ ہے علم سے دوری، علم سے بیگانگی، علم سے نفرت۔ جس قوم نے علم سے محبت کرنا چھوڑا باچا بیگم...... وہ غرق ہو گیا، تباہ ہو گیا۔ اس کا پھرڑ کا بھی نہ رہا اس دنیا میں۔ مسلمان کی تباہی کا راز ہی اس حقیقت میں چھپا ہوا ہے کہ مسلمان نے شروع دن سے علم سے محبت نہیں کیا۔ اس کو غیر ضروری سمجھا اور اس کو حاصل کرنے کے واسطے کوئی کوشش نہیں کیا۔ نہ آج نہ کل۔ نہ ہی آگے اس کے واسطے کوئی کوشش کا خیال ہے۔ اور یہ ہمارے پاکستان میں ہی نہیں باچا بیگم، کل مسلمان ملکوں میں اس کا یہی حال ہے۔ علم کا داخلہ ہر جگہ بند ہے۔ علم کے اوپر ہر مسلمان گھر میں ٹیکس لگا ہوا ہے۔"

باچا بیگم نے حیرانی سے خان کی طرف دیکھا۔ عینک اتار کر اپنی اوڑھنی سے صاف کی، کھاٹ کے پاس پڑی اپنی الٹی جوتی کو جھک کر سیدھا کیا اور پھر مسکرانے کے ارادے سے نگاہیں اوپر اٹھائیں تو جلال خان نے کہا:

" صرف عینک کے شیشے صاف کرنا علم نئیں اے باچا بیگم! اس کے لیے جان دینا پڑتی ہے، کوشش کرنا پڑتی ہے، دن رات ایک کرنا ہوتی ہے، علم کوئی مذاق نئیں اے۔"

ان کی کوٹھی سے باہر، بڑے لان میں جلال خان اور باچا بیگم کا بیٹا اپنی سیاہ ترکی دنبیوں کو نہلا کر ان کی چکیوں پر تین قسم کے گھگھوں سے برش کر رہا تھا۔ مدت خات بابا جلال خان کی شادی کے پورے چودہ برس بعد پیدا ہوا تھا، اور ایف اے تک تعلیم حاصل کر چکنے کے بعد آگے پڑھنے سے انکاری ہو گیا تھا۔ اس کے پاس خوبصورت چکوروں کا جوڑا تھا۔ سات دنبے دنبیاں تھیں۔ چاچا چنیر کا نگر کوٹ سے بھجوایا ہوا ایک مور تھا اور لال رنگ کی ایک جیپ تھی۔ درے کی رائفل کے علاوہ اس کے پاس ایک کلاشنکوف بھی تھی۔ ڈجٹل گھڑی، کیمرے اور سرخ رنگ کے ایک آسٹرین ٹینٹ کے علاوہ ایک دور مار ٹارچ بھی تھی جس کی بلٹ ان بیٹری، ٹارچ کی سپرنگ لوڈ کمر دو سو سے دو سو بیس مرتبہ دبانے پر فل چارج ہو جاتی تھی۔

مدت خان کے پاس سوائے علم کے اللہ کا دیا اور سب کچھ تھا۔ محبت، شفقت، جواں مردی، اطاعت، مسکراہٹ، غریب پروری، جفا کشی یہ سب چیزیں مدت خان کے پاس وافر مقدار میں موجود تھیں۔ لیکن علم کے معاملے میں اس کا خانہ خالی تھا۔ اس نے ایف اے اچھی سیکنڈ ڈویژن میں کرنے کے بعد آگے پڑھنے سے جواب دے دیا تھا اور جلال خان کی زندگی بڑھاپے کی آمد سے پہلے ہی برف پوش ہو گئی

تھی۔

مہذب ملکوں میں علم حاصل کرنے کی لگن صرف روس اور مریکہ ہی کو نہیں بلکہ یورپ کے بے شمار چھوٹے چھوٹے ملک بھی اس لگن میں دیوانہ وار تڑپ رہے ہیں اور انہوں نے علم کی کمی پوری کرنے کے لیے اپنی ہر شے داؤ پر لگا دی ہے۔لیکن بابا جلال خاں کا اکلوتا بیٹا مدن خان اپنی ساتوں سیاہ دنبیوں کو برش کر کر کے ان کی سیاہ فر کو ایسے چمکا تا ہے کہ وہ روشنی جذب کرنے کے بجائے رخشندگی منعکس کرنے لگتی ہیں۔اس کا کیا بنے گا!

اس وقت آسٹریَن ٹائی رول سے ایک،کوپن ہیگن سے دو،ایٹل برک لکمبرگ سے ایک،زیورچ سے دو اور ہالینڈ سے بھی دو سکالر پاکستان کے تین بڑے شہروں میں دیوانہ وار گھوم رہے تھے اور ان سب کا مرکز اسلام آباد تھا۔جیسے کنوئیں کی ٹنڈیں بڑی لمبی ماہل پر ایسے ہی بیکار اور خالی خالی گھومنے کے بعد پانی کے مرکز میں ضرور غوطہ لگاتی ہیں۔اسی طرح یہ سکالر بھی اپنے اپنے وقت پر اسلام آباد کا چکر ضرور لگاتے تھے۔

زیورچ: بڑی حیرانی کی بات ہے برناب گل..... کہ تم ٹارگٹ تک پہنچنے میں کامیاب ہی نہیں ہو سکے۔

برناب: نہیں صاحب! یہ بات نہیں ہے۔ہم ٹارگٹ پر پہنچا اور برابر پہنچا لیکن اس وقت کابل کا آدھا علاقہ مجاہدین کے قبضے میں تھا۔

زیورچ: مجاہدین کا قبضہ تو تمہارے فائدے کی بات تھی برناب گل!

برناب: نہیں سر! فیدے کی نئیں ،خطرے کی بات تھی۔پورے چھ گھنٹے وہ علاقہ مجاہدین کے کنٹرول میں رہا۔اس وقت آپریشن مشکل تھا۔

زیورچ: پھر جب مجاہدین کا کنٹرول ختم ہوا......؟

برناب: اس وقت دوسرا کنٹرول شروع ہو گیا صاحب! سرکاری اور روسی۔اس وقت بھی آپریشن مشکل تھا۔

زیورچ: پھر تم کدھر روپوش ہوا؟

برناب: روپوش ہونے کی کیا ضرورت تھی صاحب! ہم بس کے اڈے پر بیٹھا چائے پیتا رہا۔

زیورچ: کسی کو تم پر شک تو نہیں ہوا؟

برناب: نئیں صاحب! شک کیسے ہو سکتا تھا،ہم چائے پی رہا تھا اور پیالہ خالص کابلی تھا۔چائے خالص کڑک تھا۔ہمارے کپڑوں کا بدبو لاری کے اڈے کے بدبو سے ملتا جلتا تھا۔شک کدھر سے ہونا تھا!

زیورچ: لیکن اب مشکل یہ ہے برناب گل......

برناب: آپ فکر نئیں کرو صاحب! ہم اسی رقم میں ایک اور اٹیک کرے گا۔

زیورچ: رقم کی بات نہیں ہے برناب گل! یہ وقت کی اور موقع کی بات ہے۔اس وقت ہم وقت کے خلاف چل رہے ہیں.....

برناب: توبہ توبہ سر! وقت کے خلاف کون چلا سکتا ہے۔اللہ پاک جب انسان کے بچے کو پیدا کرتا ہے تو اس کو وقت کے اندر ڈال کر وقت

کے ساتھ ساتھ چلاتا ہے۔ایک سال، دوسال، تین سال...... وقت کے برخلاف کوئی نہیں چل سکتا...... جو چیز ایک مرتبہ وقت میں داخل ہو گیا وہ باہر نہیں نکل سکتا۔

زیورچ: دیکھو یہ بحث کا وقت نہیں ہے، سوچنے کا وقت ہے۔

برناب: یہ کام تمہارا ہے، سوچنے کا ____ یہ تم کرو۔ اٹیک کرنا ہمارا کام اے، وہ ہم کرے گا۔ ویسے ایسا خیال دل سے نکال دو صاحؑ کہ انسان کا بچہ وقت کے خلاف چل سکتا ____ کوئی نہیں چل سکتا ______ بڑا بڑا پیر پیغمبر اپنے آخری وقت پر آخرت میں چلا گیا، خلاف نہیں چلا۔ وقت نہیں ٹل سکتا صاحب! وقت کے خلاف کدھر سے چل سکتا ہے انسان کا بچہ!

زیورچ: ٹھیک اے ٹھیک اے ٹھک اے ______ اب بولنا نہیں ہے ______ مجھے سوچنے دو ______ شاباش!

برناب: ٹھیک ہے سر! سوچو ____ سوچو ______ شوق سے سوچو۔

ڈئیر سر! جب میں ڈین ہاگ سے چلا تھا تو میں نے گیارہ صفحے کی ایک سمری صاحب ثقافت کی خدمت میں بھجوائی تھی جس میں اس حقیقت کی وضاحت کی گئی تھی کہ یہ آپریشن کچھ ایسا آسان نہیں۔ چیکوسلواکیہ والوں کو یہ سہولت ہے کہ وہ فاتح ملک کے ساتھ وابستہ ہیں اور انہیں افغانستان کے اندر باہر جانے کی پوری پوری آزادی ہے۔ ہم کو ہر کام مجاہدین کی مدد سے کرنا پڑتا ہے اور مجاہدین پرس سلسلے میں بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے سامنے اپنا ہی اتنا بڑا مشن ہے کہ وہ ہماری اس لگن کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن ہم اپنے جذبے سے پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں۔ ہم کچھ نہ کچھ تو ضرور حاصل کر کے رہیں گے خواہ اس کے لیے ہمیں سال بھر یہاں بیٹھ کر انتظار کرنا پڑے۔ ایک برق انداز کو ایک نئی کوشش پر روانہ کر دیا گیا ہے لیکن مشرقی ممالک میں چونکہ تعلیم عام نہیں اور علم سے محبت نہیں اس لیے برق انداز اس مرتبہ بھی اس مشن کو ادھورا چھوڑ کر آ جائے گا۔ ہم نے روپے کا لالچ بڑھا دیا ہے اور معرکہ مارنے کی فیس دگنی کر دی ہے۔ امید ہے کہ اب وہ روپے کی لالچ میں آ کر ضرور ہمارا ساتھ دیں گے لیکن اس عارضے کا کیا علاج کہ دوسرے یورپی ممالک ہمارے حریف بنے بیٹھے ہیں اور ہر معاملے میں ہم سے سبقت لے جانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ بہر کیف آپ خاطر جمع رکھیں تمام مشکلات کے باوصف ہم سیدھی اور صحیح لائن پر جا رہے ہیں۔

اس وقت زیورچ کے دوسکالر ہمارے مقابلے میں تیزی سے کام کر رہے ہیں اور ان کو فارن ایکسچیج کی کوئی مشکل نہیں۔ مشکل تو ہمیں بھی نہیں لیکن ان کے پاس زرمبادلہ کے فاضل ذخیرے ہیں جو وہ ٹارگٹ پر بے دریغ لگا رہے ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ہمارا ایک مشن کیریران کے ساتھ بھی ملا ہوا ہے اور ان کو بھی اتنا ہی مان دیتا ہے جتنا ہم کو۔ جب مشن پورا ہو جائے گا تو وہ یقیناً سودے بازی کرے گا۔ مشرق کے لوگ علم فروخت کر دیتے ہیں۔

ہمارے مقابلے میں لکمبرگ نے بہت حد تک ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ ان کا نمائندہ ان دنوں دیپال پور میں مقیم ہے اور پرانے

آثار کے فوٹو اتار رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس مہم سے بہت حد تک کنارہ کش ہو چکا ہے لیکن پھر بھی ہم کو چوکس رہنا چاہیے۔

اب میں اس رپورٹ کو یہیں ختم کرتا ہوں لیکن اسے روانہ نہیں کروں گا۔ کل اور پرسوں کے حالات دیکھ کر پھر ایک نوٹ لکھوں گا اور اسی رپورٹ کے ساتھ منسلک کر کے بھجواؤں گا۔

خصوصی یادداشت: پاکستان اور پاکستان کے لوگ اور پاکستانی حکومت ہماری کارروائیوں سے بالکل بے نیاز ہے۔ ہم کو گھومنے پھرنے، یاری دوستی لگانے اور کارروائیاں کرنے کی پوری پوری آزادی ہے۔ پاکستان کا اعلیٰ درجے کا تعلیم یافتہ طبقہ جو مشکل سے دو یا سوا دو یا حد ڈھائی فیصد تک ہے، بالکل ہماری طرح کی سوچ رکھتا ہے اور ہماری طرز زندگی کو اپنائے ہوئے ہے۔ یہی اس ملک کا رائے گر طبقہ ہے اور اسی کی یہاں پر حکمرانی ہے۔ یہی طبقہ Trend Setter ہے اور ہر جگہ اسی کا سکہ چلتا ہے۔ گویا اس عہد کی ایسٹ انڈیا کمپنی یہی ہے۔ باقی سارے لوگ عہد مغلیہ کے آخری شہزادے ہیں..... ذہنی طور پر بودے، جسمانی طور پر تودے اور ہر ایک کے لیے بکاؤ سودے ____ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ہمارے ساتھ ہے اور ہم کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دیتا۔ اپنے وطن میں ہمیں ہزار مشکلات ہوتی ہیں لیکن یہاں ایک بھی مشکل نہیں سوائے مشن کی تکمیل کے۔

اب میں اس رپورٹ کو پھر بند کرتا ہوں اور کل صبح تک کا انتظار کرتا ہوں۔ خوون ڈانخ!

ایکٹ دوسرا ____ سین پہلا

صبح کا وقت۔ وہی لکڑی کا کیبن اور وہی اس کے باہر ذرا سے فاصلے پر فولادی رسے کا پل۔

دریائے کنہار اپنی پوری تیزی کے ساتھ رواں ہے اور اس کا شور پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہو گیا ہے۔ گوجر لوگوں کے قافلے پہاڑوں کی چوٹیوں پر واپس جا رہے ہیں۔ ان کی رفتار میں تیزی اور ان کے چلن میں خوشی ہے۔ قدم راستوں سے مانوس اور چہرے فضاؤں سے آشنا ہیں۔ گرمیوں کا یہ سارا موسم گوجر لوگ اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں پر گزاریں گے اور پھر اکتوبر کے اواخر میں میدانوں کی طرف لوٹنا شروع کر دیں گے۔

ان کے شاٹ لیتے وقت کا خیال رکھا جائے کہ جاتے ہوئے قافلوں کے پہلو سے شاٹ لیے جائیں، چہروں کو یا قدموں کو ایکسپوز کرنے سے حتی الامکان احتراز کیا جائے اور جاتے ہوئے قافلوں کو ان کی بیک سے ایکسپوز کیا جائے۔ ہر مرد عورت بچے بوڑھے کا چہرہ دکھائے بغیر ان کی پشتوں، ان کے سرینوں سے اس حقیقت کو گرفت میں لیا جائے کہ وہ اپنے مسکنوں کی طرف جانے کے لیے کیسے کیسے بے قرار ہیں اور ان کا شوق ان کی پشتوں میں کس کس طرح سے گھمن گھیریاں ڈال رہا ہے۔

نوٹ: یہاں تیز تیز اٹھتے قدموں کے کلوز شاٹس ہرگز نہ لیے جائیں نہ ہی مویشیوں کے کھروں کو ایکسپوز کیا جائے۔ ہر جانور اور ہر مویشی کی دم کے کٹ ٹو کٹ شاٹس لیے جائیں جس کی جھٹک اور پھٹک سے جانوروں کے شوق وطن کا بھاؤ دیا جائے۔

اس وقت وہی بوڑھا گورا نیلی نیکر پہنے اسی بڑے پتھر پر بیٹھا ہے، لیکن آج اس کے ہاتھ میں ایک دوسری پیپر بیک ہے جس کا ٹائٹل

نیلا ہے۔گورے کی پشاوری چپلوں کے دونوں سٹریپ کھلے ہیں اور وہ آہستہ آہستہ اپنے پاؤں ان چپلوں سے باہر کھینچ رہا ہے۔
دریائے کنہار کے دوسرے کنارے، پہاڑوں کے تنگ درے سے ایک انسانی دھبہ نمودار ہوتا ہے جو آگے بڑھ کر فولادی رسے کے پل کے پھندے میں کھڑا ہو جاتا ہے۔بوڑھا گورا نگاہیں اٹھا کر اس طرف دیکھتا ہے اور کتاب پتھر پر رکھ کر اپنے چپل کے سٹریپ باندھنے لگتا ہے۔آدمی سٹیل روپ کے لوپ میں ایک پاؤں رکھ کر دوسرے ہاتھ سے رسہ کھینچتا جاتا ہے اور اس کی بہنگی کی پھرکی تیزی سے چلنے لگتی ہے۔

بڈھا گورا اٹھ کر کھڑا ہو گیا ہے اور بے چینی سے لٹکتے ہوئے مسافر کو دیکھ رہا ہے۔بڈھے گورے کے چہرے کا کلوز اپ اور اس کی آنکھوں کا ٹائٹ کلوز اپ لیا جائے۔رسے کے پل پر آتے ہوئے آدمی کو بدستور لانگ میں رکھا جائے۔

(یہاں اچھے اچھے ڈائرکٹر زوم ان کرنے کی غلطی کر جاتے ہیں لیکن اس سے احتراز کیا جائے)

آدمی اس کنارے پر پہنچ کر فولادی رسے کے لوپ میں سے نکلتا ہے اور اپنے گلے میں لٹکائے ہوئے تھیلے کو ٹھیک کرتا ہے ____ (زوم ان ایم سی یو) ____ آدمی اپنے گلے سے جزدان اتارتا ہے اور اسے ہاتھ میں لٹکا کر آگے بڑھتا ہے۔بڈھا انگریز اس کی طرف بڑھتا ہے۔بیک گراؤنڈ میں فن فئر بجتا ہے۔دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔کٹ ٹو کٹ ____ گورا اوپر سے نیچے کو ڈھلک رہا ہے، آدمی نیچے سے اوپر کو لپک رہا ہے۔دونوں ملتے ہیں۔مصافحہ کرتے ہیں۔آدمی جزودان گورے کے حوالے کرتا ہے۔گورا اس کے اندر جھانک کر دیکھتا ہے۔خوشی سے آدمی کا کندھا تھپتھپاتا ہے۔آدمی اس کے ساتھ گرم جوشی میں بغلگیر ہو جاتا ہے۔دونوں خوش ہیں۔بڑی گھٹ کے بچھی ڈالی ہوئی ہے۔ان کے جڑے ہوئے کندھوں کے پوائنٹ آف دیو سے دریائے کنہار کی تیزی، بے قراری اور تڑپ کا شاٹ لیا جاتا ہے۔

ڈزالو

جب ایٹل برک اپنی کٹھارہ جیپ پھاٹک کے قریب چھوڑ کر جلال خان کی کوٹھی کے پورچ میں داخل ہوا، تو جلال بابا اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے پرانی جامع اللغات کو بٹر پیپر کی چیپیاں لگا رہے تھے۔یہ لغت بابا جلال خان کے والد نے خریدی تھی جو ہر شام باقاعدگی سے اس کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ان کو اس لغت کی ضرب الامثال والا حصہ بہت ہی پسند تھا۔انہوں نے کئی مرتبہ اس بات کی کوشش کی کہ جلال خان بھی اس لغت کا مطالعہ کیا کرے۔لیکن جلال خان کو مطالعے کا کچھ ایسا شوق نہیں تھا۔وہ ہر بات کو وقت وقت کی بات کہا کرتا تھا۔یہی بات کہنے والا جلال خان اب اپنے مرحوم باپ کو چھوڑی ہوئی بوسیدہ ڈکشنری کو چمکتے کاغذ کی چیپیاں لگا کر اس کی مرمت کر رہا تھا۔

ایٹل برک کو ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے دیکھ کر جلال خان اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مصافحے کا ہاتھ آگے بڑھا دیا لیکن ایٹل برک کا اس طرح بے وقت آنا جلال خان کو اچھا نہیں لگا۔

ایٹل برک نے صوفے پر بیٹھ کر اپنے دونوں پاؤں کو زور سے قالین پر مارا اور اس کی نیلی جینز سے تھوڑی سی گرد نمودار ہو کر پھر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔وہ کئی مہینوں سے جلال خان سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جلال خان اسے سوائے اپنی مہمان نوازی کے اور

کچھ بھی فراہم نہیں کرتا تھا۔ایٹل برک نے کہا:" کابل میوزیم سے میں دونوں مسودے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں لیکن اس پر روپیہ بہت خرچ ہو گیا۔"

جلال خان نے کہا:" خیر اے یارا، علم حاصل کرنے میں اگر زندگی بھی خرچ ہو جائے تو کم ہے۔"

" زندگی بھی خرچ ہی ہے ناں جلال خان!" ایٹل برک نے سنہری مونچھوں کے نیچے پھونک بھر کر اسے ذرا سی دیر کے لیے روکا اور پھر پھک سے ہوا نکال کر بولا" راستے کے تین بھاری پتھروں کا اٹھا کر گہری وادی میں پھینکنا پڑا۔ایک چوکیدار، ایک کلرک اور تیسرا نا معلوم دخص جو اس وقت کابل میوریم میں موجود تھا۔" تینوں کو قتل کروا دیا؟" جلال خان نے بے تعلقی سے پوچھا، تو ایٹل برک تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔پھر اپنے سیاہ پشاوری چپلوں پر چھڑی مارے ہوئے اپنے آپ سے کہنے لگا کہ "یوں تو ایک معمولی سا اور بے معنی سا کام ہے لیکن اس کے ساتھ قوموں کی زندگی وابستہ ہے۔یہ ایک ایسی جرات مندانہ، عاقبت اندیش اور مصلحت کوش پیش قدمی ہے، جس سے کار گزاری کرنے والی قوم کا پلڑا بہت اوپر اٹھ جاتا ہے۔"

"اور جب ایک طرف کا پلڑا اوپر اٹھ جائے" جلال خان نے کہا" تو دوسرا پلڑا خود بخود نیچے چلا جاتا ہے۔"

ایٹل برک نے کہا" گو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے....... لیکن پھر بھی......." اس نے بات بیچ ہی میں چھوڑ دی اور پشیمان سا ہو کر مسکرانے لگا۔

جلال خان اس معرکے کے بعد اور بہت کچھ جاننے کا خواہش مند تھا، لیکن اس کے چہرے پر بے تابی کے آثار نہیں تھے۔وہ ایٹل برک سے بی زیادہ گمبھیر انسان تھا اور تجسس کو کبھی ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔کچھ دیر تک ایٹل برک اس کے پاس چپ چاپ بیٹھا رہا۔پھر وہ اٹھا، مسکرایا اور ہاتھ آگے بڑھا کر مصافحے کا طلب گار ہوا۔جلال خان اس کو اس کی جیپ تک چھوڑنے گیا اور پھر واپس آ کر اپنی لغت میں چسپاں لگانے لگا۔

جب ایٹل برک کی کھٹارہ جیپ کوٹھی کے پھاٹک سے باہر نکل گئی تو باچا بیگم اندر ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر جلال خان کے سامنے بیٹھ گئی۔بابا جلال خان نے اپنی بیوی کو ایسی نظروں سے دیکھا جن میں سارے زمانے کا دکھ بھرا ہوا تھا۔انسانوں کی اس دنیا میں سب سے تکلیف دہ لمحہ وہ ہوتا ہے جب کوئی کسی ایسے بوڑھے پٹھان کے سامنے آ جائے جو شدت ندامت سے رونے کے قریب ہو۔اس کی آنکھوں پر روغنی نمی کی ہلکی ہلکی تہہ چڑھ چکی ہو لیکن وہ رونے سے معذور ہو۔جلال خان نے رندھے ہوئے گلے سے باچا بیگم کو بتایا کہ ایٹل برک کابل میوزیم سے اپنی پسند کے دونوں مسودے اٹھوانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔اس نے یہ کام ایک دبلے پتلے برق انداز کے سپرد کیا تھا، جس نے مغرب کے وقت تین آدمیوں کو ختم کر کے مسودے الماری سے نکالے اور انہیں پلاسٹک کی باریک جھلی میں لپیٹ کر یہاں بھجوا دیا۔"

" یہاں کیسے بھجوا دیا؟" باچا بیگم نے حیرانی سے پوچھا۔

" یہاں ایٹل برک کے پاس بابا!" جلال خان نے جھلا کر کہا" ابھی آیا تھا ایٹل برک۔"

" میں نے کس کے پاس نہیں پوچھا!" باچا بیگم نے چڑ کر کہا" میں نے یہ پوچھا ہے کہ کس طرح..... کیسے.....؟ "

"پلاسٹک کی باریک تھیلی میں لپیٹ کر سندر خانی انگوروں کی پیٹی کے نیچے رکھ کر۔"

"اور جب تین آدمیوں کو ختم کیا، مغرب کے وقت تو کھٹا کا نہیں ہوا؟" باچا بیگم نے پوچھا۔

"اوئے نہیں بابا! اب کھٹا کا کدھر ہوتا ہے۔ اب تو پستولوں کے آگے سیلنسر لگا ہوتا ہے سیلنسر، کھٹا کا مٹا کا نہیں ہوتا ہے۔ انسان بیٹھا بیٹھا اپنے کمبل میں فوت ہو جاتا ہے۔ اردگرد کے لوگ سمجھتے ہیں سو گیا ہے کمبل کی گرمائی ہے، نیند آ گئی ہے۔"

"لیکن ایک ناکارہ اور پرانے کاغذ کے بدلے لوگوں کو قتل کرنا' انسانوں کا اس میں کیا فیدہ ہے؟"

"اوئے بابا! یہ فرنگی علم کا دیوانہ ہے' علم کا شوقین ہے۔ کل دنیا کا گورا علم کی خاطر لاکھوں ہزاروں انسانوں کو قتل کر سکتا ہے۔ سیلنسر کے بغیر یا سیلنسر کے ساتھ' جیسے اس کا دل چاہے۔"

باچا بیگم تھوڑی دیر تک اسی طرح حیران بیٹھی رہی' پھر پوچھنے لگی: "دنیا میں اتنی کتابیں بکتی ہیں' اتنا علم بکتا ہے...... گورا اس کو خرید کر اپنی کمی پوری کیوں نہیں کر لیتا؟"

بابا جلال خان نے تین مرتبہ اپنے ماتھے پر زور زور سے ہاتھ مارا اور پھر خاموش ہو گیا۔ باچا بیگم کو اس کا اس طرح خاموش ہو جانا اچھا نہ لگا۔ اس نے اپنے علم کی کمی کا اظہار ایسی معذرت سے کیا کہ جلال خان کو اس کی حماقت پر پیار آ گیا۔ اس نے اپنی کم علم اور جاہل بیوی کو معاف کرتے ہوئے کہا" کانوں کو ہاتھ لگانے اور توبہ کرنے سے علم کی دولت نہیں مل سکتی۔ اس دولت پر صرف گوری قوموں کا حق ہے اور یہ دولت انہی لوگوں کے تصرف میں ہے۔ لیکن اس کے لیے وہ محنت بھی ایسی کرتے ہیں باچا بیگم کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس وقت سارے افغانستان میں جہاں لوگوں کو زندگی کے لالے پڑے ہوئے ہیں' گوری قوموں کے دانشور اور علم اکٹھا کرنے والے پرانی اور تاریخی چیزوں اور آثاروں کو اور مسودوں اور مخطوطوں کو وہاں سے نکال نکال کر اپنے محفوظ ملکوں میں لے جا رہے ہیں۔ وہ زندہ لوگ ہیں باچا بیگم! طاقت ور لوگ ______ غیرت مند لوگ۔"

باچا بیگم نے ڈرتے ڈرتے کہا: "خان!" اور جلال خان نے پوری آنکھیں کھول کر زبان ہلائے بغیر کہا "بول"

باچا بیگم ہچکچاتے ہوئے بولی: "ان کتابوں میں اور پرانی چیزوں میں کیا ہوتا ہے جو وہ یہاں سے اٹھا کر لے جاتے ہیں؟"

"ان میں علم ہوتا ہے......... علم .... تاریخی علم، زمینی علم، آسمانی علم! لاکھوں کروڑوں ڈالر کا ہوتا ہے ایک ایک مسودہ، لاکھوں پاؤنڈوں کا۔ ہم لوگ ان کی قدر نہیں جانتے۔ گورا جانتا ہے، گورا۔ ان کو علم سے محبت ہے۔ علم کی قدر شناسی ہے۔ وہ ایک کتاب کے بدلے پورے ملک کو تباہ کر سکتا ہے، پوری بستی کو نیست و نابود کر سکتا ہے۔ وہ قدردان اے......" باچا بیگم یہ سن کر جی ہی جی میں بہت شرمندہ ہوئی کیونکہ جب وہ تخت بھائی مڈل سکول میں پڑھتی تھی تو اس کو نہ علم کی کوئی قدر تھی نہ کتاب کی۔ وہ بس ایسے ہی پڑھنے چلی جاتی تھی اور ایسے ہی پڑھ کر چلی آتی تھی۔

جلال خان نے کہا "باچا بیگم! علم کے ترازو کا تول دوسرے تول سے الٹ ہے...... جس پلڑے میں علم زیادہ ہوتا ہے، وہ اوپر اٹھ جاتا ہے۔ ساری دنیا کا عالم اس کو دیکھتا ہے۔ ایڑیاں اٹھا اٹھا کر دیکھتا ہے۔ اور جس پلڑے سے علم نکلتا جاتا ہے وہ نیچے ہوتا جاتا ہے،

چھپتا جاتا ہے، خالی ہوتا جاتا ہے، اندھیرے میں چلا جاتا ہے...... پس ماندگی میں۔"

باچا بیگم نے کہا: "خان! تم نے یہ بات مجھے پہلے کیوں نہ بتائی؟"

"پہلے اس لیے نہیں بتائی" جلال خان نے کہا" کہ تم نے میری بات پر کبھی توجہ نہیں دی۔"

"توبہ، توبہ!" باچا بیگم نے ایک مرتبہ پھر کانوں کو ہاتھ لگایا اور سر جھکا کر بولی "اللہ رسول کے بعد میں تمہاری بات ہی سنی خان، اور تمہارے حکم کی ہی تعمیل کی۔"

" گورا جب ہمارے یہاں سے علم لے جاتا ہے" جلال خان بولا" تو وہ طاقتور ہو جاتا ہے اور وہ جتنا طاقتور ہو جاتا ہے اتنا ہی ہم کمزور ہو جاتا ہے۔"

" کمزور تو ہونا ہی ہوا خان!" باچا بیگم نے کہا" ہمارا علم جو اس کے ہاتھ آ جاتا ہے، اتنا قیمتی علم لاکھوں کروڑوں پونڈوں والا۔"

"یہ بات نہیں ہے باچا بیگم! ہمارے علم میں کوئی خاص بات نہیں اے۔ کوئی سرخاب کا پر نہیں اے ہمارے مسودوں مخطوطوں میں۔ لیکن ان کے لے جانے سے ایک فائدہ ضرور ہوتا ہے......"

"وہ کیا؟" باچا بیگم نے بے چینی سے پوچھا۔

جلال خان تھوڑی دیر تک خاموش رہا اور یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ یہ بات بتائے یا نہ بتائے لیکن پھر خود ہی سر جھٹک کر کہنے لگا: " کوئی لعل نہیں لگے ہوتے ہمارے علم میں۔ کوئی سائنس کا، ہوائی جہاز کا، ایٹم بم کا علم نہیں ہوتا اس میں...... بس اس میں صرف ایک خوبی ہوتی ہے باچا بیگم!........ اس کو اٹھا کر لے جانے میں کہ جس ملک سے وہ علم اٹھایا گیا ہوتا ہے...... ایشیا سے، افریقہ سے، جنوبی امریکہ سے، کسی جزیرے سے..... اس کی آنے والی نسلوں کو اپنا بڑوں کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں رہتا۔"

باچا بیگم نے حیرانی سے پوری آنکھیں کھول دیں۔

"ہر آنے والی نسل اپنے سے اگلی نسل کو طعنے دیتی رہتی ہے کہ تم اپنے علم کی حفاظت نہ کر سکے، اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے اور گورے کو دیکھو جو کافر، یہودی، نصرانی ہوتے ہوئے بھی ہمارے علم کو کس طرح سینے سے لگائے بیٹھا ہے اور کس طرح اس کی حفاظت کر رہا ہے، کس طرح اس کا کیٹلاگ بناتا ہے، کس طرح اس کی فیومی گیشن کرتا ہے، کیسے کیسے اس کی لیمی نیشن کرتا ہے۔" باچا بیگم کو ان الفاظ کی وجہ سے جلال خان کی بات خاک بھی سمجھ نہ آئی لیکن جلال خان اپنی لہر میں بولتا گیا کہ "جس طرح بیوی سے ٹوٹ کر محبت کرنے والے نوجوان کو اپنے ماں باپ کے بجائے بیوی کے والدین اور اس کے گھر والے اچھے لگنے لگتے ہیں اسی طرح پس ماندہ قوموں میں علم سے مھبت کرنے والی نسل کو گورا اور اس کے گھر والے اور ان کے ملک اور ان کے انداز اور ان کی ادائیں اچھی لگنے لگتی ہیں....... اپنے ملک، اپنے ملک کے لوگ، اپنے گھر، اپنی مائیں بری لگنے لگتی ہیں۔"

" کیوں؟" باچا بیگم نے زور سے پوچھا۔

"اپنا علم گنوا بیٹھنے کی وجہ سے!"

" گنوا بیٹھنے یا چوری کروبیٹھنے کی وجہ سے؟"

جلال خان نے غصے سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا، جس نے ڈرتے ڈرتے کہا:" یا اپنی کمزوری کی وجہ سے چھنوا بیٹھنے کی وجہ سے؟ آخر قوموں کو شکستیں بھی تو ہو جاتی ہیں۔"

" شکستوں اور فتحوں کا مجھے کچھ علم نہیں۔" جلال خان نے کڑک کر کہا" مجھے تو صرف علم سے محبت ہے۔ گو میں خود علم حاصل نہیں کرسکا لیکن علم سے محبت میرے بابا جان سے میرے خون میں منتقل ہوئی ہے۔ میں تو اتنی عمر گزارنے کے بعد بس ایک ہی بات سمجھ سکا ہوں کہ جس ملک کے مسودے، مخطوطے، مورتیاں اور ممیاں گورا اٹھا کر اپنے ملک میں لے گیا، اس ملک کی چھوٹی نسل اپنی بزرگ نسل سے نالاں اور ناراض رہ کر ہی پروان چڑھی اور پھر اپنے بڑے ہونے پر آنے والی چھوٹی نسل کی لعنت ملامت کا ہدف بن گئی کہ جاؤ جاہلو، علم کے دشمنو، تم سے تو اپنے علم کی حفاظت بھی نہ ہو سکی۔"

"اس سے گورے کو کیا فائدہ پہنچا، خان؟" باچا بیگم نے حیرانی سے پوچھا تو جلال خان جوش میں آ کر بولا:" گورا اب لڑ نہیں سکتا ہے باچا بیگم! اس میں اب پہلے والی قوت اور طاقت باقی نہیں رہی ہے۔ اب وہ ساری دنیا کی بے گوری قوموں کو ذلیل وخوار کر کے اور شرمندہ کر کے اور ان کو علم سے بے بہرہ قرار دے کر ہی حکمرانی کر سکتا ہے۔ اس کو احساس کمتری میں مبتلا کر کے ہی ان کے جسموں اور روحوں پر قبضہ قائم رکھ سکتا ہے۔" پھر وہ رکا اور بڈھے عقاب کی طرح گردن ہلا ہلا کر کہنے لگا:" لیکن علم سے محبت صرف گورے کو ہے۔ اس وقت چودہ ملکوں کے بائیس گماشتے افغانستان کے اندر اور باہر گھوم کر قیمتی مسودے اور مخوطے اپنے اپنے ملک لے جا رہے ہیں اور ایک ایک مسودے کی کا طر چاہے انہیں سوسو لوگوں کو بھی ختم کرنا پڑے، وہ گریز نہیں کرتے۔ وہ مرد لوگ میں باچا بیگم! علم دوست لوگ ہیں۔"

باچا بیگم کو حقیقت میں پہلی مرتبہ اپنے وفا شعار، سخی دل اور صاف باطن شوہر پر پیار آیا جس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بوڑھا ہو رہا ہے اور اس کی باتوں میں اب پہلے والی منطق اور ربط باقی نہیں رہا۔ جب وہ بہت چھوٹی تھی تو ہشت نگر کے ایک مولوی صاحب کا دماغ بھی اسی طرح چل گیا تھا اور وہ بھی جلال خان جیسی باتیں کرنے لگے تھے۔

مدت کان کی لال سوزوکی ڈرائنگ روم کے عین سامنے آ کر رکی اور اس میں سے سات سیاہ دنبیاہ کودبکود چھلانگیں مار کر باہر آ گئیں۔ مدت خان انہیں دیکھ کر باغ باغ ہو رہا تھا اور بڑی بے چینی سے سوزوکی کی چابیوں کا چھلا اپنی انگلی میں گھما رہا تھا۔

بابا جلال خان نے کھلے دروازے میں سے اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھا جس کے پاس سوائے محبت، شفقت، جواں مردی، مسکراہٹ اور غریب پروری کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے بغیر آواز نکالے اپنے جبڑے بھینچ کر دل ہی دل میں کہا" اوئے بدبختا! تیرے پاس کلاشنکوف ہے۔ کیا تو بھی گورے کی طرح کوئی مسودہ مخطوطہ اٹھا کر نہیں لا سکتا؟ لیکن تو علم سے محبت نہیں کرتا ناں بے غیرتا، اس لیے بد نصیب ہے۔" جب اس نے دل ہی دل میں اپنے بیٹے کو بے غیرت کہا تو بابا جلال خان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انے انہیں چھپانے کی غرض سے منہ اوپر اٹھا کر اونچی آواز میں کہا:" ڈرائنگ روم میں سفیدی ہونی چاہیے باچا بیگم! سارا چھت سے پپڑی اتر گیا ہے۔"

بندر لوگ

شملہ کے ساتھ میری بڑی گہری یادیں وابستہ ہیں۔ میں نے اس کو خالہ کی زبانی اپنے کانوں سے سنا تھا اور اپنی خالہ زاد بہنوں کی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ چونکہ میں شخصیتوں سے فوراً مرعوب ہو جاتا ہوں اس لیے مجھے لوگوں کی زبانی اچھے اچھے شہروں کے سننے کا بڑا شوق ہے...... اچھے اچھے شہروں کے اچھے اچھے باسیوں کو دوسروں کی آنکھ سے دیکھنے کا بڑا چاؤ ہے۔

جب میں نے پہلی مرتبہ شملہ دیکھا تو میں جوان ہو رہا تھا بلکہ مجھے پہلے دن شملے جا کر ہی پتہ چلا کہ میں جوان ہو گیا ہوں۔ یہ نویں جماعت کی گرمیوں کی چھٹیوں کا ذکر ہے!

شملے میں کھٹمل بھی تھے اور ٹین کی چھتوں والے مکان بھی، رکشا بھی اور کمروں کے اندر گھس آنے والے بادل بھی لیکن وہاں کی جو مخلوق میرے ہوش اڑا کر لے گئی، اس کا ذکر میں پھر کبھی کروں گا۔ اس وقت فقط اتنا جان لیجئے کہ میرے بڑے بھائی جو اس زمانے میں بی اے میں پڑھتے تھے، میرے ساتھ گئے تھے اور خالہ کے گھر میں ایک الگ کمرے میں رہا کرتے تھے۔ وہ ہمارے خاندان کے سب سے لائق اور حسین نوجوان تھے اور انہوں نے اپنی محنت کے بل بوتے پر کبھی کسی کو اپنی کلاس میں فرسٹ نہیں آنے دیا تھا۔ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ اتنے ذہین نہیں تھے کیونکہ وہ ایک دن میں دو دو غزلیں لکھ لیا کرتے تھے اور اپنے ہاتھ سے ان کی کتابت کر کے دوستوں کو بھیجا کرتے تھے۔ ہمارا سارا خاندان ان پر فخر کرتا تھا اور اپنے خاندان میں بھی شامل تھا۔

ایک شام یہی کوئی چار پانچ بجے کا وقت ہو گا کہ بھائی جان کے کمرے میں زور کا پٹاخہ چلا اور ایک دلدوز چیخ کی آواز سنائی دی۔ میری خالہ اور ان کی صاحب زادیہ مال روڈ کی سیر کو گئی ہوئی تھیں اور گھر پر سوائے میرے اور میرے بھائی جان کے اور کوئی نہیں تھا۔ پٹاخہ اس زور سے چلا تھا اور چیخ ایسی بلبلا کر نکلی تھی کہ مجھے ان کے کمرے میں جانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ سامنے شکیلہ اور شوکی کے گھر میں دو کالے کالے بادل گھسنے کی کوشش کر رہے تھے اور انہوں نے دروازے بھیڑ رکھے تھے۔ بارش ہو رہی تھی، بجلی چمک رہی تھی۔ کسی گھر کے سامنے گھپ اندھیرا تھا، کوئی کوئی گھر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے حوصلہ کر کے چارپائی سے پہلے ایک پھر دوسرا قدم اتارا اور سیلے فرش پر ایستادہ ہو گیا۔ پھر میں نے خوف دور کرنے کے لئے انگڑائی لی اور بھائی جان کے کمرے میں پہنچ گیا۔ بھائی جان اپنی کرسی سے گر کر فرش پر پڑے تھے۔ ان کا چہرہ سرخ اور سوجا ہوا تھا، گردن میں تشنج کی کیفیت تھی اور دونوں ٹانگیں ایک دوسری کے ساتھ اڑنگا ڈالے ہوئے تھیں۔

ایک موٹا سا لدھا باندر کھڑکی میں بیٹھا بے ہوش بھائی جان کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شرافت اور ہمدردی کے آثار تھے لیکن چونکہ وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا اس لئے کھڑکی میں آرام سے بیٹھا تھا۔ بارش کی پھوار سے اس کے سینے بال نمناک تھے۔ وہ اپنا ایک ہاتھ کھلی ران پر اور دوسرا کھڑے زانو پر ٹکائے کھڑکی میں بالکل ننگا بیٹھا تھا۔ جب میں بھائی جان کو فرش پر سے اٹھانے کے لئے جھکا تو وہ کھڑکی سے چھلانگ لگا کر چھجے پر اور چھجے پر سے اوپر ممٹی کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایسا بڑا لدھا باندر میں نے شملے میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جاکھوں کی پہاڑ پر بندروں کا سب سے بڑا مرکز تھا اور یہاں لوگ دور دراز سے آ کر بندروں کو کھیلیں ڈالتے تھے اور دور کھڑے ہو کر ان کا نظارہ کرتے تھے۔ ان بندروں کا لیڈر ایک بہت بھورے بھالو جیا، بوڑھا بندر تھا جس کے رخسارے ضعیفی کی وجہ سے ڈھل گئے تھے اور جس کی پوستین چھدری ہو کر نیچے سے اس کا بدن دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کے پیٹ کا استر بستر ایک جھلی میں بند تھا اور اس کی ناف کے گرد ایک بڑا سا گرمڑا تھا۔ ہندو مرد اور عورتیں اس بندر کے سامنے ہاتھ باندھ کر دور سے پرنام کرتے تھے اور وائسرائے کے دفتر کے مسلمان منشی کلرک اور افسر کولھوں پر ہاتھ رکھ کر دور سے اس کو دیکھا کرتے تھے۔ وہ جاکھو پہاڑی پر موجود سب لوگوں کو یہی امپریشن دیا کرتے کہ ہم ان بندروں سے ڈرتے نہیں اس لیے ہم نے کولھوں پر ہاتھ دھرے ہوئے ہیں۔ لیکن اندر سے وہ بھی ڈر رہے ہوتے کیونکہ انہوں نے کولھوں پر ہاتھ دھرے ہوتے۔

میں نے بڑی مشکل سے بے ہوش بھائی جان کو گھسیٹ گھساٹ کر چارپائی پر ڈالا۔ ان کی ٹانگوں اور پیٹ کے گرد کمبل لپیٹا اور دوسرے کمرے سے چائے کی تھرموس اٹھانے چلا گیا۔ دوسرے کمرے میں ایک چھدرے بادل کا دھواں بھرا تھا۔ میز پر تھرموس، اس کے قریب جاز کا ٹائم پیس اور ان دونوں کے پیچھے خالہ کی کارمینیٹو مکسچری کی بڑی بوتل پڑی تھی۔ یہ سب چیزیں ایک لمحہ کے لیے مجھے ضرور آئیں لیکن دھندلی سی دکھائی دیں۔ بجلی کا ایک چھ سات انچ کو کوندا این زیڈ کی شکل بناتا کھلی کھڑکی سے بڑھک مار کر اندر تڑپا اور میں بے ہوش ہو کر فرش پر گر گیا _____ تیسرے دن ہماری خالہ نے ہم دونوں بھائیوں کو واپس گھر پہنچا دیا اور شملہ ہمارے لیے خواب بن کر رہ گیا۔

اس واقعے کو کئی برس گزر گئے۔ ہماری زندگیوں میں بڑے بڑے انقلاب آئے۔ کچھ لوگ قریب آئے، کچھ دور ہو گئے۔ دور ہونے والوں میں کچھ مرد تھے کچھ عورتیں۔ کئیوں کی شادیاں ہو گئیں، کئی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ کچھ ہمارے طبقے سے نکل کر نیچے کو لڑھک گئے۔ چند ایک شہر بدل گئے۔ ایک نے نیلا تھوتھا کھا کر خودکشی کر لی۔ ایک فیروز پور چھاؤنی میں گوروں کے کلب میں مجرا کرنے لگی۔ ایک مذہب تبدیل کر کے لدھیانہ مشن میں پادر بن گیا۔ ایک مہاراجہ گائیکواڑ کے چھوٹے بھائی کی بیوی بن کر ہمیشہ کے لیے راج محل میں چلی گئی۔ لیکن ان سب انقلابوں سے بڑا انقلاب چودہ اگست 47ء کا انقلاب تھا جب ہم کو بخوشی اپنے گھروں کو چھوڑنا پڑا، بخوشی اپنی جائیدادوں کو ترک کرنا پڑا اور بخوشی اپنے عزیز و اقارب کو قتل کروانا پڑا _____ ان تمام نفیسوں کے بدلے ہمیں ایک بہت بڑی مثبت مل گئی تھی اور ہم ہر روز لاہور کے ڈاک خانے میں جا کر پوچھا کرتے تھے کہ لفظ "پاکستان" کے حامل ٹکٹ کب چھپیں گے اور جارج ششم کے نوٹوں کے بدلے قائداعظم کے نوٹ کب جاری ہوں گے۔ میرے نزدیک ابھی آدھا پاکستان بنا تھا۔ چودہ اگست رات کے بارہ بج کر ایک منٹ پر آل انڈیا ریڈیو لاہور سے اناؤنسمنٹ ہوئی تھی "پاکستان براڈکاسٹنگ سروس، لاہور"۔ لیکن باقی کا آدھا ٹکٹ اور نوٹ کے چھپنے کے بعد

وجود میں آنے والا تھا۔

ہم سب بھنگیوں کے چبوترے پر بیٹھے چھوٹے درجے کی عالمانہ باتیں کر رہے تھے۔ ہمارے رخ عجائب گھر کی طرف تھے اور عجائب گھر کے اوپر سفید بادل کا ایک بڑا تودہ اپنی ہیئت تبدیل کر رہا تھا۔ میں ان دنوں افسانے لکھ کر ادیب بنتا سا جا رہا تھا کہ مظفر نے چبوترے کے پاس سائیکل روک کر کہا "پاکستان کا ایک آنے کا، دو آنے کا اور چار آنے کا ٹکٹ چھپ گیا ہے۔" پھر اس نے اپنی جیب سے چرمی بٹوہ نکالا۔ اس میں سے سفید کاغذ کی تہہ کی ہوئی ایک چوکور پڑیا نکالی اور اسے کھول کر کہنے لگا "سنو آٹھ آنے، بارہ آنے اور ایک روپے کے ٹکٹ اٹھارہ تاریخ کو اشوع ہوں گے"۔ پھر اس نے وہ کاغذ اسی طرح تہہ کر کے بٹوے میں بند کیا اور بٹوہ جیب میں ڈال کر نیو ہاسٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ حرام زادے سے اتنا نہ ہو سکتا کہ ڈاک خانے سے ٹکٹ خرید ہی لیتا۔ اپنی ماں کی خالی انفرمیشن لے کر زمرے پر چڑھ دوڑا تھا۔

یہ 51ء کی سردیوں کا ذکر ہے۔ میں آزاد کشمیر جانے کے لیے مری کے پہلو سے گزرا تو سڑک پر جا بجا سفید برف کے گولے پڑے تھے جیسے تھکا ہوا ڈھگا منہ سے جھاگ گراتا جاتا ہے۔ جھیکا گلی کے پاس میں نے سڑک کے دونوں طرف اور ٹین کی چھتوں پر پہلی مرتبہ برف کو اور دوسرے مرتبہ بندروں کے ایک چھوٹے سے گروہ کو دیکھا جو بڑی خاموشی کے ساتھ یاتریوں کی طرح ترائی سے نیچے اتر رہا تھا۔ یہاں لاری پندرہ بیس منٹ کے لیے رکی۔ ہم نے سڑک کے کنارے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں چائے پی، پیشاب کیا اور سگریٹ خریدے۔ ہوٹل کے باہر سے چیل اور دیودار کی خوشبو آ رہی تھی اور ہوٹل کے اندر سے ٹھنڈک، پرانے مٹکے کی کائی، نئے سبز وارنش اور پتھر کے کوئیلوں کی ملی جلی باس آ رہی تھی۔ مجھے بخوشی یہ ٹھنڈک اچھی لگی، بخوشی یہ سفر پسند آیا اور بخوشی سارا پاکستان اچھا لگا ______ بندر لوگ ترائی پر تھوڑی دیر کے لیے رک گئے تھے اور وہ پلٹ کر ہماری لاری کو دیکھ رہے تھے۔ ان کو اس علاقے کے چیڑھ، اس علاقے کے پتھر، یہاں کی طرف اور رنگ دار لاری بخوشی ناپسند تھے اور ان کے ماتھے کی تیوریاں اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں پر باریک پلاسٹک کے گلابی پپوٹے بتا رہے تھے کہ وہ خوش نہیں ہیں اور ہم سب کو چوتے سمجھ رہے ہیں۔

قرونِ وسطیٰ کی تحریروں میں جہاں اس کائنات کے بارے میں بہت سی باتوں کا علم موجود ہے وہاں بندروں اور بوزنوں کی ابتدا کے ضمن میں بھی بہت سی کہانیوں کا ذکر ملتا ہے۔ ایک عام خیال یہ ہے کہ جب حوا کو باغ عدن سے نکال کر زمین پر پھینک دیا گیا تو خدا اس کا حال احوال پوچھنے کے لیے اکثر اس سے ملتا رہا۔ حوا کی آل اولاد اس قدر تھی کہ اسے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ خدا ان کے بارے میں پوچھ نہ لے۔ کیونکہ اگر خدا کو معلوم ہو گیا کہ وہ اپنے نو دریافت جسمانی شعور سے متمتع ہو رہی ہے تو لامحالہ اس کی سزا تبدیل کر دی جائے گی اور اس کی کوکھ بند کر دی جائے گی۔ چنانچہ ایک روز استفسار پر اس نے سامنے کھیلنے والے چند ایک بچوں کو دکھا کر کہہ دیا "حضور بس یہی پان سات چھتڑے سے ہیں جو اس وقت آپ کے سامنے الٹ بازیاں لگا رہے ہیں۔" باقی کے بچوں کو وہ عتاب کے خوف سے چھپا گئی اور ان کا ذکر صاف بچا گئی۔ لیکن عالم الغیب سے کون سا راز پوشیدہ رہ سکتا تھا۔ نہ گنوائے جانے والے بچوں پر عذابِ الٰہی نازل ہوا اور ان کو بندروں میں تبدیل کر دیا گیا ______ بندروں کو جاننے اور سمجھنے کے لیے آپ کو پہاڑوں اور وادیوں سے محبت کرنا ضروری ہے۔ کوہ ہمالیہ اور

کوہ ہندوکش کے سلسلوں کو پہچاننے کی ضرورت ہے۔ ہمارے شمال میں جہاں ہندوستان، پاکستان، کشمیر، روس اور افغانستان کی سرحدیں ایک دوسرے کے ساتھ کندھے جوڑے پڑی ہیں، ان کے کندھوں اور ابھاروں کو محسوس کرنے کی ضرورت ہے۔

جب گھروں میں شادیاں ہوتی ہیں اور جوان لڑکیاں ایک کمرے میں اکٹھی ہو کر قالین پر اپنا ڈیرا جمالیتی ہیں تو وہ کمرہ بڑی نگاہوں کا مرکز بن جاتا ہے۔ نوجوان اور نوخیز نگاہوں کا مرکز ہی نہیں، بڑی نگاہوں کا مرکز بھی۔ اس کمرے کے پہلو میں ایک کوٹھڑی ہوتی جہاں کپڑے تبدیل کئے جاتے ہیں' پرائے کپڑے ٹانکے جاتے ہیں' میک اپ کیا جاتا ہے۔ جمعدارنی کو بلا کر بار بار غسل خانہ صاف کرایا جاتا ہے۔ چھوٹے بلبوں کی جگہ بڑے بلب لگائے جاتے ہیں۔ بلب تبدیل کرنے اور بجلی کے پوائنٹ دیکھنے کے لیے مردوں کو بار بار ادھر آنا پڑتا ہے، بار بار سٹول لانے اور لے جانے پڑتے ہیں، بار بار جھٹکے کھانے پڑتے ہیں۔ ایسا ہی ہمارے شمال میں ہوتا ہے جہاں اتنی ساری سرحدوں کے کندھے ملتے ہیں اور سرحدیں ایک قالین پر لیٹی ہوتی ہیں اور ان کے کندھے بڑے صحت مند ہوتے ہیں۔ ان کے طلائی لاکٹ سینوں کے اندر سے لپک کر باہر گردنوں پر یا قالین کے حاشیوں پر لٹکے ہوتے ہیں۔ سارا کمرہ نینا رچی، کرسچین ڈائر اور دیسی عطر کی خوشبو میں رچا ہوتا ہے اور اس میں کندھوں کی، سائن کی، ڈیکرون کی اور تازہ دھلے ہوئے بالوں کی باس بھی شمل ہوتی ہے اور منتظمین بار بار دروازہ بجا کر کہتے ہیں " بھئی ذرا اندر سے بالٹی لیتی ہے، باہر نائی لوگ مانگ رہے ہیں۔ بالٹی چلی بھی جاتی ہے پھر بھی لوگ بار بار بالٹی لینے کے لیے آتے رہتے ہیں۔ ان میں بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں واقعی بالٹی لانے کا کام سونپا گیا تھا لیکن راستے میں پکڑے گئے۔ چلم دھرنے لگے۔ ستلی سے بوری کا منہ باندھنے لگے۔ چھواروں کی گھڑی اندر رکھنے گئے۔ ٹھنڈا پانی پلانے لگے۔ اور جب انہیں اپنا اصل کام یاد آیا تو بالٹی لینے چلے گئے۔ اس میں خد بالٹی کا یا بار بار بالٹی مانگنے والوں کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ کسی کی نیت کا فتور بھی نہیں ہوتا۔ ٹھرک بھی نہیں ہوتی۔ بس اک طلسم سا ہوتا ہے۔ جس سے لوگ اندر کو کھچے چلے آتے ہیں۔ کہتے ہیں جس جگہ پر بہت سے ملکوں کی سرحدیں ملیں یا جس جگہ پر لیٹی ہوئی لڑکیوں کے کندھے ملیں' ان کے نیچے یا سونا ہوتا ہے یا تیل کے کنوئیں..... یا آئل ہوتا ہے یا ٹرمائل!

ریڈیو تڑاڑ کھیل کی چوٹی پر بیٹھ کر بڑائی لڑائی کی۔ بڑے بڑے طعنے مہنے، کوسنے، گالیاں ایک دوسرے کو دیں۔ گونجے' گرجے' خوفیائے۔ ہم بھی ضدی تھے' دشمن بھی ضدی۔ سال سال' ڈیڑھ ڈیڑھ سال بعد اعصاب جواب دینے لگتے۔ دشمن اپنے سینکوں کو شملہ، نینی تال، دھرم سالہ بھیج دیتا۔ ہم نتھیا گلی، سوات اور چھانگا گلی کی طرف نکل جاتے۔ ٹھنڈی ہوائیں، اونچے درخت، نیلا آسمان، سفید بادل، پڑھنے کے لیے صرف ایک اخبار، آرام کرنے کے لیے سارا دن، سونے کے لئے ساری رات، باتیں کرنے کے لیے خانسامے باورچی گڈوریئے پہاڑی کسان ــــــــ ایسی فراغت اور ایسی آسودگی اس کے بعد پھر کبھی نصیب نہ ہوئی۔

بھوربن کے بندر تعداد میں کم ہیں لیکن ان کی عادتیں اور خصائل شملے کے بندروں سے ملتی جلتی بھی ہیں اور مختلف بھی ہیں۔ اس علاقے کے بندر اپنی شخصیت اور فردیت کے اعتبار سے زیادہ باوقار اور زیادہ قابل اعتماد ہیں۔ ان کے جسم مضبوط اور قد درمیانے ہیں۔ دمیں چھوٹی اور پٹھے گول ہیں۔ آنکھیں قدرے بڑی اور ٹھوڑیاں نوک دار ہیں۔ کان بڑے، سر چھوٹا اور ماتھا تنگ ہے۔ یہ راہ چلتے لوگوں کو تنگ نہیں کرتے۔ سڑک پر کم اترتے ہیں ہوٹلوں اور ہوسٹلوں اور گولف کلب کی طرف کم آتے ہیں۔ گھروں پر یورش نہیں کرتے۔ جس سر

سبز تودے پر میں نے ایک یکہ وتنہا کوٹھڑی کرائے پر لے رکھی تھی، اس کے عین نیچے ایک گہرے لیکن وسیع وعریض کھڈ میں بندر لوگ آباد تھے ۔میں نے انہیں اورانہوں نے مجھے کبھی تنگ نہیں کیا۔ہم ایک دوسرے کو جانتے بھی تھے اور ایک دوسرے کے لیے اجنبی بھی تھے۔ جب کبھی ان کو مجھ سے ملنے کی ضرورت محسوس ہوتی، وہ میری کھڑکی کے نیچے دو بڑی چٹانوں کے درمیان آجاتے اور میں ان کی خدمت میں باسی ڈبل روٹی، سبز اخروٹ اور ڈاگ بسکٹوں کا پیکٹ اچھال دیتا۔اور جب کبھی مجھے ان سے ملنے کا اشتیاق ہوتا تو میں سوٹ کیس سے آرمی اوپی والی دوربین نکال کر اور کھڑکی میں آرام کرسی کھینچ کر ان کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتا۔

بندر لوگ، بادشاہ لوگ ہیں۔ان کی سب باتیں، آپ سے، ہمارے عزیز واقارب سے ملتی ہیں۔ وہ عالمی سیاست دانوں کی طرح ایک دوسرے کو بھبھکیاں بھی دیتے ہیں اور مقامی سیاست دانوں کی طرح کی ٹانگ بھی کھینچتے ہیں۔ بیوروکریٹ بن کر ساتھی بندروں کا کام بھی نہیں ہونے دیتے اور کمزور کلرکوں کی طرح بڑے بندروں کی خوشامد بھی کرتے ہیں۔ زبردست پر قربان ہو ہو جاتے ہیں اور زیردست کی کھال ادھیڑ کے رکھ دیتے ہیں۔ بندر لوگ بڑے بادشاہ لوگ ہیں، بالکل ہماری طرح سے ______ فرق صرف اس قدر ہے کہ ہم ہمیشہ عمو داً چلتے ہیں اور وہ کبھی کبھی یہ شغل اختیار کرتے ہیں۔

بھوربن کے بندر جاکھو اور شملے کے بندروں کی طرح گروہوں میں زندگی بسر کرتے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ شملے اور جاکھو کے بندروں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور بھوبن کے بندروں کی کم۔ جس گروہ کو میں جانتا ہوں اور جس سے میری قریباً دو مہینے مسلسل ملاقات رہی ہے، وہ بھوربن کے سب سے بڑی عمر کے باندر کا گروہ تھا۔اس کے گروہ میں تیس پینتیس بندر شامل تھے اور عمر اور رتبے کے لحاظ سے اچھے عہدوں پر سرفراز دکھائی دیتے تھے۔اس گروہ کی باندریاں صحت جسمانی کے اعتبار سے ان گروہوں کی بندریوں سے اچھی تھیں جن کو میں نے ڈوہنگا گلی اور چھانگلا گلی کے گروہوں میں دیکھا تھا۔میں موخرالذکر گروہوں کے بارے میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا لیکن میرے علاقے کے اس گروہ کی بندریاں اپنی جنسی رعنائی کو نر بندروں کی جنسی آسودگی کے لیے بھی استعمال میں لاتی تھیں اور اپنی ترغیب جنسی یا سیکس اپیل سے دوسرے کام بھی نکلواتی تھیں۔ بہار پر آئی ہوئی ایک بندریاں نر بندروں میں بڑی مقبول ہوتی تھی۔ وہ ان کے ساتھ اٹھکیلیاں بھی کرتی تھی، جعتی بھی کرتی تھی اور ان سے اپنے بدن کی "جوئیں" بھی نکلواتی تھی۔ان دنوں اس سوشل سٹیٹس بہت بڑھ جاتا تھا ۔وہ ہر دوسری بندریاں کو کاٹ کھانے کو دوڑتی۔اس کے دوہتڑ مارتی، پر چینڈوں سے ان کی تھوتھنیاں نوچتی اور اگر گروہ کے بڑے لدھے باندر یعنی لیڈر کے ساتھ ہم صحبتی کرتی تو پھر جوان اور لونڈے قسم کے نر بندروں کو سزا بھی دلواتی۔ کمزور اور دبو بندر بڑے اور جابر بندر کے سامنے آنے سے ہمیشہ کتراتا ہے۔گو سارے ایک ہی گروہ میں رہتے ہیں لیکن ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں۔ایک دوسرے سے آنکھ بچا کر وقت گزارتے ہیں۔ کمزوروں کو ہر گھڑی یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ زبردست آئے گا اور مجھے خواہ مخواہ دھونسے گا، بر کائے گا اور میری جان عذاب میں ڈالے گا۔اس لیے اگر بڑے درختوں پر ہوں تو چھوٹے زمین پر رہتے ہیں اور اگر بڑے درختوں سے نیچے اتر آئیں تو چھوٹے بڑی شرافت سے کھسک کر درختوں پر چڑھ جاتے ہیں۔

دوسرے جانوروں میں نر اور مادہ اس وقت جھتی کھاتے ہیں جب مادہ جنسی خواہش رکھتی ہو اور جوڑے کو جبلی طور پر اپنی نسل

بڑھانے کی لگن ہو،لیکن بندروں میں ایسا نہیں ہوتا۔وہ تولید کے لیے بھی جستی کھاتے ہیں اوراس کے علاوہ بھی یہ کام کرتے ہیں،لیکن اس میں بندریا کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔وہ اپنی ترغیب جنسی کو غیر جنسی مقاصد کے لئے بھی استعمال لاتی ہے۔جب کوئی بندر غصے سے لال بھبھوکا،جذبات سے بے قابو مارنے کوٹنے پر اتار آتا ہے تو بندریا بڑی آہستگی سے آگے بڑھتی ہے اوراس کے غصیل چہرے سے ذرا دور اپنا پیچھا اس کے سامنے اٹھا دیتی ہے،کہنیاں زمین پر ٹکا دیتی ہے اور سر ایک طرف موڑ کر زمین پر رکھ دیتی ہے۔پھر اپنی تیزی سے جھپکتی ہوئی آنکھوں سے مسلسل بندر کی طرف دیکھے جاتی ہے اور اپنے اندام نہانی کو عین بندر کی نگاہوں کی شست میں کر دیتی ہے۔غصیل بندر اسی طرح سنجیدگی سے اٹھ کر اس پر سواری کرتا ہے،دخول کرتا ہے اور پھر پیڑوں کے تیرہ چودہ تیز تیز ٹھونسے لگا کر انزال کے بعد اوپر سے اتر آتا ہے۔ مادہ کا اس کے سامنے لیٹنا اور اپنا پیچھا اٹھا کر اس کو پیش کرنا اس کا غصہ فرو کرنے کے لیے اور اس کی انا کی تسکین کے لیے کافی ہوتا ہے۔میں نے دیکھا کہ صرف مادہ ہی ایسا نہیں کرتی بلکہ کمزور نر بھی اپنی جان بچانے کو اور حملہ آور سے مخلصی پانے کو اپنا پیچھا اٹھا کر اس کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور اپنی جان بچاتے ہیں۔کمزور مادائیں بھی شہ زور ماداؤں کے سامنے اپنا پیچھا اٹھا دیتی ہیں اور خراب صورت حال سے اپنی جان بچا لیتی ہیں۔ان جان بچانے والے اور اپنا پیچھا پیش کرنے والے مظلوموں پر ظالم اور جارح سواری نہیں کرتے بلکہ انہیں کافی دیر اپنے سامنے اس ذلت آمیز اور شرم ناک آسن میں کھڑا رکھتے ہیں اور پھر وہاں سے چلے جاتے ہیں۔بھور بن کے گروہ میں ادھیڑ عمر کا ایک بندر ایسا بھی تھا جو اپنے لیڈر لدھے باندر سے آنکھ بچا کر کمزور بندروں کو تنگ کیا کرتا تھا۔اس کی سب سے بڑی راحت دوسرے نر بندروں کے سامنے ذلیل کرتا تھا اور حریفوں کو یہ ذلت اور شرم عطا کرنے کے لیے اس نے ایک انوکھا طریقہ وضع کر رکھا تھا۔وہ اپنا قضیب ایستادہ کر کے اور پوری طرح اکڑا کے کمزور بندر کے سامنے جا کھڑا ہوتا،اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے قضیب سے اس کے سر اور چہرے پر ضربیں لگاتا اور اپنے پیڑو کے ٹھونسے مارتا۔کمزور بندر اپنا چہرہ کبھی دائیں کبھی بائیں موڑتا۔اپنی جان چھڑانے کی کوشش کرتا،اس کی دستبرد سے نکلنے کی سعی کرتا لیکن یہ غنڈا اس کو اس وقت تک نہ چھوڑتا جب تک کہ کمزور بندر کہنیاں ٹکا کر اپنا پیچھا اور نہ اٹھا دیتا۔غنڈا علامتی طور پر اس پر چڑھتا اور پھر فاتحانہ انداز میں چلتا ہوا کسی اور بندر کے سرہانے جا کھڑا ہوتا۔

وہ بڑے عجیب ایام تھے..... فراغت،تنہائی،آزادی،سردی،دھند،ہم جنسوں سے دوری،بندروں کی صحبت،دوربین کے ذریعے جنسی رعل سے قربت جبکہ حقیقت میں دوری،سبز ٹھنڈی گھاس،گاف کورس کے دور دور تک پھیلے ہوئے گرین_____جی چاہتا تھا چھٹیاں جلد ختم ہوں،بندر لوگوں سے ناطہ ٹوٹے اور میں اپنی دنیا میں واپس جاؤں۔تراڑ کھیل کے گنبد سے اپنی آواز کا جادو جگاؤں اور دوربین کا مشغلہ چھوڑوں۔لیکن زندگی پر،اپنے شب و روز پر،اپنے آپ پر اور اپنے گرد و پیش پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ویسے دوسرے سب کاموں میں انسان مختار کل ہے اور اپنی مرضی کے بغیر پتہ بھی نہیں ہلنے دیتا ______ یہی کوئی چار بجے شام کا عمل ہوگا۔میں پیٹ پر گرم چادر تکیئے کی طرح رکھے سگریٹ پی رہا تھا اور چائے کا انتظار کر رہا تھا کہ ترائی میں ایک خوف ناک شور اٹھا۔مجھے اپنے ساتھیوں کی فکر تھی جو مجھ جیسی کمزوریاں رکھتے تھے اور میرے بہت قریب ہو گئے تھے۔میں نے کھڑکی سے سر نکال کر دیکھا۔چھانگلا گلی کا لیڈر اپنے گروہ کے بندروں کو ساتھ لے کر ہمارے گروہ پر حملہ آور ہو گیا تھا اور دونوں لیڈر آمنے سامنے کے درختوں پر چڑھے بڑے خوف ناک طریقے پر خو خیار تھے۔ان کے

ساتھ اپنی اپنی ٹکڑی کے دوسرے بندر بھی شاخوں سے چمٹے ہوئے تھے۔ دونوں لیڈر اور ان کے ساتھی اس خوف ناک طریق پر درختوں کو ہلا رہے تھے۔ کہ تند سے تند آندھی یا جھکڑ بھی ٹہنیوں کو اس طرح جھٹکا یا لچکا نہیں سکتا۔ دونوں طرف سے ایک دوسرے کو شدید بھبکیاں دی جا رہی تھیں۔ ہر بندر اپنے پھیپڑوں کا پورا زور لگا کر خوخیا رہا تھا اور چر چر کی آوازیں نکال رہا تھا۔ بڑے بندروں کی گھرکیاں بھدی، اونچی اور کرخت تھیں اور دونوں لیڈروں کی آوازیں دہشت ناک تھیں۔ دونوں اپنی اپنی ڈال جھولے کی طرح جھلا کر ایک دوسرے کے قریب لاتے اور گالیاں دے کر چلے جاتے ــــــ بندروں کی لڑائی ہمیشہ ابلاغ کی ہوتی ہے۔ وہ جسمانی طور پر ایک دوسرے پر حملہ آور نہیں ہوتے۔ طعنوں، الھنوں گھرکیوں اور آوازوں کے اتار چڑھاؤ سے ایک دوسرے کو خوف زدہ کرتے ہیں۔ ایک دوسرے پر جعلی عکس ڈالتے ہیں، ہرکاتے ہیں، دہشت پیدا کرتے ہیں۔ اس لفظی جنگ میں جس کی قوت برداشت زیادہ ہوتی ہے، وہ جیت جاتا ہے اور دوسرا بھاگ جاتا ہے۔

میرے خدا نے میری عزت رکھ لی۔ شام کے ساڑھے چھ بجے ہمارے گروہ کے لیڈر نے تین زبردست ہلارے شاخ پر لے کر تین مہیب آوازیں نکالیں تو حملہ آور گروہ کے چھکے چھوٹ گئے۔ ان کا لیڈر ایک ہی جست میں درخت سے نیچے کودا اور اپنے چیلے چانٹوں کو لشٹم پشٹم لے کر بھاگا۔ میں نے خوشی کا ایک نعرہ مارا اور میرے اس نعرے میں لدھے باندر کی مہیب آواز گم ہو گئی۔

اب ابراہیم چائے لے آیا تھا اور اندر کی خنکی میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ میں نے کھڑکی بند کر دی اور ابلاغ کی جنگ کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں بھی اسی جنگ کا ایک صوبیدار میجر تھا اور میرا اگلہ بارود ہر وقت میرے پاس میرے ذہن میں اور میری آواز میں محفوظ رہتا تھا۔ بندر کی گروہی زندگی کے تضادات بہت کچھ میری گروہی زندگی سے ملتے تھے۔ بندر لوگ اپنے لیڈر سے بڑا خوف کھاتے ہیں اور اس کی جارحانہ قوت سے دب کر رہتے ہیں۔ جب کبھی خطرہ رونما ہوتا ہے، وہ سب بھاگ کر اپنے لیڈر کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اس سے مدد اور ہدایت کے طالب ہوتے ہیں اور خطرے اور حملے کی صورت میں اس کا دامن نہیں چھوڑتے۔ اپنے تحفظ کی اس جبلت کے پیش نظر ان کی اجتماعی زندگی میں ایک عجیب واقعہ اکثر رونما ہوتا ہے۔ جب کبھی بندروں کا کوئی نوجوان جوڑا اپنے لیڈر کی مرضی کے خلاف لیڈر سے آنکھ بچا کر اختلاط میں مصروف ہوتا ہے، ایک دوسرے کو داد عیش دیتا ہے اور عشرت کے لمحات کپکپی کی صورت میں گزارتا ہے...... اگر نہیں پکڑا جاتا تو دن پشوری کر لیتا ہے اور اگر لیڈر کے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے تو نر کی شامت آ جاتی ہے۔ لیڈر اسے کھلے ہاتھوں سے زدوکوب کرتا ہے اور اس کی پوستین اپنے دانتوں سے ادھیڑتا ہے۔ اس اثنا میں مظلوم و مقہور بندر چیختا ہے، چلاتا ہے، بلبلاتا ہے اور اس خطرے اور جارحانہ حملے سے بچاؤ کے لئے جبلی طور پر اپنے لیڈر کے تحفظ میں آنے کے لئے اس کی طرف بھاگتا ہے۔ اس وقت لیڈر کے دو رول ہوتے ہیں: جارح، ظالم، حملہ آور اور محافظ سرپرست۔ کمزور بندر اس کو صرف محافظ اور سرپرست سمجھتا ہے اور ظالم کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اسی میں گھسا چلا آتا ہے اور یوں اس کی خوب پٹائی ہوتی ہے۔ اگر ایسے موقع پر کمزور اور دست نگر بھاگ جائے تو وہ لیڈر کے عتاب سے بہ آسانی بچ سکتا ہے لیکن کمزور اور زیردست بندر کی یہی نفسیات ہوتی ہے کہ وہ علاقے کے زور آور لدھے بندر (جس نے ظالم کا روپ اختیار کر رکھا ہے) خدمت میں سر جھکائے جاتا ہے، پیچھا اٹھائے جاتا ہے۔

اس واقعے کو کئی سال گزر چکے ہیں کہ میں بندروں کے ساتھ تھا اور اس یاد کو اس سے بھی زیادہ مدت بیت چکی ہے جب شملے کے نمناک کمرے میں زور کا پٹاخہ چلا تھا اور میرا بڑا بھائی بے ہوش ہو کر فرش پر گر گیا تھا۔ ان کے کمرے سے ایک بڑا سا لدھا باندر کھڑکی سے چھلانگ مار کر چھجے پر سے ممٹی کی طرف روانہ ہو گیا تھا، لیکن اب یہ ساری باتیں اور سارے واقعات مجھے کل کا قصہ معلوم ہوتے ہیں۔ میرا چھوٹا بیٹا بیمار ہے اور کمرے کے درمیان قالین پر سویا ہوا ہے۔ وہ چھوٹا بھی ہے، کمزور بھی اور بیمار بھی۔ اس کا چہرہ پہلے سے بہت چھوٹا ہو گیا ہے اور اس کی ناک پہلے سے پتلی ہو گئی ہے۔ جس قالین پر آج سے چند ماہ پہلے بہت سی نوجوان لڑکیاں کندھے جوڑ کر سوئی ہوئی تھیں، وہاں اب ایک چھوٹا سا بیمار لڑکا لیٹا ہے...... ایک چھوٹی سی کمزور سی سرحد پڑی ہے۔ اس سرحد کے نیچے نہ آئل ہے نہ ٹرمائل۔ یہ کمزوری، بے بسی اور ناتوانی کی علامت ہے۔ میں اسے آہستہ آہستہ پنکھا جھل رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ کمزور بندروں کی نفسیات کا مطالعہ بھی کیا دلچسپ مطالعہ بھی ہے۔ لیکن اس مطالعے کے لیے آپ کو پہاڑوں اور وادیوں سے محبت کرنا ضروری ہے، کوہ ہمالیہ اور کوہ ہندوکش کے سلسلوں کو پہچاننے کی ضرورت ہے۔ ہمارے شمال میں جہاں ہندوستان، افغانستان، روس، کشمیر اور چین کی سرحدیں ملتی ہیں، وہاں اسی علاقے کا لدھا باندر لچک دار درختوں پر چڑھ کر اپنی طرح کے دوسرے بڑے بڑے بندر لیڈروں کو ڈرا رہا ہے۔ بھبھکیاں دے رہا ہے، خوخیا رہا ہے۔ ابلاغ کی جنگ لڑ رہا ہے۔ بڑوں کے ساتھ ابلاغ کی جنگ لڑنے والے اس لدھے باندر نے کمزور پاکستان پر حملہ کیا، اس کی ریڑھ کو اپنے جبڑے میں دبا لیا اور ایک ہی جھٹکے سے اس کے دو ٹوٹے کر دیے۔ اب دونوں ٹوٹے اسی جارح، اسی حملہ آور، اسی محافظ اور اسی سرپرست سے امداد اور انصاف کے طالب ہیں۔

ذرا ٹھہریے ____ میرے بچے نے سوتے میں پانی مانگا ہے، میں اس کو پانی پلا لوں!

www.hallagulla.com

ڈھورڈنگر کی واپسی

ذرا دیکھئے انسان کی کایا کلپ کیسے ہوتی ہے: اس کا اصلی اور حقیقی نام تو سلیمان تھا مگر جونہی وہ نائیلہ کی محبت میں مبتلا ہوا تو اس نے اپنا نام سلیمان بتانا شروع کر دیا۔ وہ جو اس کے مضبوط اور کرتی بدن کے ساتھ ساتھ اس کے نام کی وجہ سے دیہاتی پن کا شائبہ تھا تو اس نے اپنی ڈگریوں اور سرٹیفکیٹوں میں سلیمان کے "یو" کو سلیمان کے "اے" کی طرح بلانا شروع کر دیا۔

پرانے دوستو نے کہا" تم تو سلیمان تھے "تو سلیمان نے کہا" ہمارے دیہات میں چونکہ یہی نام کا من ہے اس لئے مجھے بہ امر مجبوری یہی تلفظ استعمال کرنا پڑا ورنہ میں تو سلیمان ہوں۔"

نائیلہ کا تعلق اپر مڈل کلاس سے تھا۔ جب وہ ایف اے میں تھی تو اس کا گھرانہ سمن آباد میں رہتا تھا لیکن جب اس نے آرٹس کالج میں داخلہ لیا تو وہ لوگ لوئر مال کے ایک ایسے گھر میں آ گئے جس کی وضع قطع پرانے انگریزی بنگلے کی سی تھی۔ اس بنگلے کے تین حصے تھے۔ بائیں ہاتھ کا حصہ ان کو الاٹ ہو گیا تھا اور انہوں نے گے رنگ کی ایک فوکسی بھی لے لی تھی۔

لیکن سلیمان نائیلہ سے ان کی فوکسی یا اس کے ایک تہائی بنگلے یا اس کے ستواں حسن سے مرعوب نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کے کھلے ڈلے پن، اس کے بے حجابی، اس کی جرات اور اس کی آسان گیری سے اس قدر متاثر ہو گیا تھا جس قدر اس کے بڑے اپنے اپنے زمانوں میں شہر آ کر کسی ایک گھرانے کی دہلیز پر منہ میں انگلی ڈال کے کھڑے ہو جاتے تھے۔

نائیلہ کمال کی آرٹسٹ تھی۔ اس کو واٹر، پیٹل اور آئل پر ایک سی دسترس حاصل تھی۔ اس کے محبوب موضوع دو تھے: سٹل لائف اور نیوڈ!

پاکستان میں سٹل لائف کا مواد تو کہیں سے بھی حاصل کیا جا سکتا تھا اور کسی وقت بھی کیا جا سکتا تھا لیکن نیوڈ سٹڈی کے لئے ماڈل دستیاب نہ تھے۔ صرف مالی بابے، چوکیدار، فقیر اور ناکام پہلوان مل جاتے تھے جنہیں لنگوٹے بندھوا کر نیوڈ سٹڈیاں کی جا سکتی تھیں۔ لیکن وہ اصل نیوڈ نہیں تھے۔ نیوڈ سٹڈی کے کمزور، بے مزا اور خوش اخلاق سے قائم مقام سہارے تھے جن کو ڈرا کرنے میں کوئی لطف نہیں تھا، بس ایک نیا بتی سی لذت تھی۔ لذت بھی کیا تھی، لذت کی جانشین سی کوئی چیز تھی جس نے نائیلہ کو رنجیدہ اور بے زار کر رکھا تھا۔

سلیمان بڑا دلیر اور جی دار نوجوان تھا۔ اس کو دلیر اور بہادر لوگ پسند تھے۔ نائیلہ کو وہ اس کی فن کاری، خوش نمائی یا دلبری کی وجہ سے

پسند کرتا تھا بلکہ وہ اس کے بے باکی اور دلاوری کا دل دادہ تھا۔ نائیلہ لاہور کے نہایت ہی جدید اور امروزی اشرافیہ کی وہ رنگ ماسٹر تھی جس کے سامنے بحث مباحثے، ڈائیلاگ اور دلیل وجحت کے خون خوار باگھ بھگیرے اپنی نمناک تھوتھنیاں پنجوں پر رکھ کر آرام سے بیٹھ جاتے تھے اور اس وقت تک بیٹھے رہتے تھے جب تک وہ انہیں اپنا سانٹا پٹخ کر اٹھ جانے یا جھومر ڈالنے کا اذن نہیں دیتی تھی۔ نائیلہ ایک لڑکی نہیں تھی، ایک قوت تھی جس نے سارے شہر کت حرکت عطا کر کے کمزور لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا اور ہر محفل ہر لحظہ اسے اپنی شمع بنانے کی آرزومند رہتی تھی۔ اگر آپ کبھی نائیلہ سے ملے ہوتے تو اس وقت یہ افسانہ نہ پڑھ رہے ہوتے بلکہ اس کی طلب میں مختلف پر گھوم کر اس کا نشان پا چکے ہوتے اور اس کی موہنی کے سامنے مسحور بیٹھے ہوتے۔

سلیمان کے اپنے خاندان سے باہر، اپنے علاقے میں اور علاقے کے علاوہ پورے پاکستان میں اور پاکستان سے پرے مغربی مما لک میں ایسے ایسے قریبی تعلقات تھے کہ وہ جہاں چاہتا، آسانی کے ساتھ دل لگا سکتا تھا اور دل لگانے کے بعد شادی کر سکتا تھا اور شادی نہ کرنے کی صورت میں لگایا ہوا دل واپس بھی لے سکتا تھا۔ وہ ایک سیاسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اس کے قبیلے کے لوگ مضبوط سیاسی جماعتوں میں اس طرح سے پھیلے ہوئے تھے کہ ہر آنے والی حکومت میں ان کا طے شدہ حصہ پہلے سے موجود ہوتا تھا۔ اس کی کوئی کمی نہیں تھی!

اتنی آسانیاں ہونے کے باوجود سلیمان کو نائیلہ کی جرات بداخلاقی اس قدر پسند آ گئی تھی کہ اس نے صرف اسی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اپنے بڑوں کو بھی اس فیصلے سے بہت حد تک آگاہ کر دیا تھا۔ اصل میں نائیلہ مذہب کے بارے میں ایسی آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کرتی تھی کہ کسی اور کو بھری محفل میں ایسا کرنے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ اس کے پاس خدا کے نہ ہونے کی سترہ ایسی طاقت ور دلیلیں تو اس نے نطشے، سارتر، مارکس وغیرہ سے مستعار لی تھیں لیکن دو اس کی اپنی ذاتی تھیں۔ وہ ان کو سب سے آخر میں پیش کیا کرتی تھی اور پھر آرام سے سگریٹ سلگا کر جواب کے انتظار میں بیٹھ جاتی تھی۔

سلیمان نے اس کے ساتھ اپنے گہرے روابط انہی طاقت ور دلیلوں کے زور پر قائم کئے تھے۔ وہ ہر دوسرے چوتھے روز کسی ایک دلیل یا چند دلیلوں کے مدلل جواب لے کر اس کے پاس آتا اور منہ کی کھا کر اپنی تھوتھنی نائیلہ کے پنجوں پر رکھ کر بیٹھ جاتا۔ ان دونوں کو اور ان کے ملنے والوں کو ان علمی مباحث میں بڑا لطف آتا تھا اور وہ مباحث کی ایسی ایک منی نشست میں اس قدر سیکھ جاتے تھے کہ کوئی انٹرنیشنل سیمینات انہیں اتنا کچھ عطا نہیں کر سکتا تھا۔

نائیلہ کی ڈرائنگ کا سٹائل گوگیں سے ملتا تھا۔ بھاری لائن، موٹا زمینہ بوجھل حاشیہ، فربہ کردار، بھاری کندھے، بھاری کولہے، موٹی رانیں، بھرکم پنڈلیاں، کالے سیاہ بال، موٹے نقوش، ڈھپو عورتیں، مجرب بچے، جسم بڑھائیں، کپے برتن اور ہٹی کٹی ساٹل لائف۔ ان سب میں طاقت کا اظہار، من مانی کا دعویٰ اور انکار کا اعلان کہ اگر میں نہ ہوں تو یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہے اور اگر میں نہ چاہوں تو ان کا وجود عدم ہے۔ یہ میرا اختیار چیلنج نہیں کیا جا سکتا کہ میں انسان ہوں۔ اور انسان عظیم ہے خدایا۔ اور میں لافنا ہوں کہ میرا فن امر ہے۔ اور فن زندگی ہے، فن حیات ہے، فن شکستی ہے۔ اور اس ساری کائنات کا مدار فن ہے۔ ساری تخلیق فن کی لیلا ہے! اور فن آرٹسٹ کے ہاتھ کا مرہون منت ہے، انسان کے ہاتھ کا دست نگر ہے۔ اور انسان بہت بڑا ہے...... اس پوری کائنات سے بڑا اور اس ہر لحمہ پھیلتی ہوئی

کائنات سے اور بھی بڑا۔

نائیلہ اس قدر پاک صاف، دھلی دھلائی، پاک بدن اور پاک نفس لڑکی تھی کہ نہ اس کو کسی سے محبت تھی اور نہ وہ کسی اور کی محبت تھی۔ وہ نارمیلی کے نقطہ عروج پر زندگی بسر کر رہی تھی جہاں وجود محبت و نفرت، مدح و ذم اور توجہ و بے توجہی سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ محبت کرنے والے اور کروانے والے عام طور پر کمزور، نحیف، ماڑے اور بودے لوگ ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی ایسی کمی اور کجی ہوتی ہے جسے وہ کسی دوسرے کی ذات سے پورا کر کے ہی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ جو بادام صحت منداور مضبوط ہوتا ہے، اس کی ایک ہی بھری بھری گری اندر اپنی نشو و نما میں مصروف ہوتی ہے۔ جو گریاں ٹیڑھی، کمزور اور خمیدہ ہوتی ہیں وہ ہمیشہ ایک دوسری کی کجی میں سر چھپائے جڑنوں صورت میں زندہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نائیلہ کا ایمان تھا کہ جو جنین کمزور، بودا اور ڈرپوک ہوتا ہے وہ اپنے حصے کا خون، اپنے حصے کی جگہ اور اپنی صفتوں کو ترازو کے تول آفر کر کے اپنے ساتھ ایک اور جنین تیار کر لیتا ہے تا کہ اس کا دل لگا رہے اور اندھیرے میں اسے خوف نہ آئے۔ پیدائش کے بعد بھی یہ دونوں توام بچے ایک دوسرے کا سہارا بن کر زندگی گزارتے ہیں اور ان کے وجود کے کیسٹ پر زندگی کا بس ایک ہی فیتہ ہوتا ہے۔ چاہے فارورڈ چلے چاہے ری وائنڈ ہو لیکن ہوتا ایک ہی ہے۔ ایک ہی پگڑی ہوتی ہے جسے دونوں نے بیک وقت پوچ سنوار کے باندھا ہوتا ہے۔

وہ اس قدر انڈی پینڈنٹ، بے نیاز، پاک باز اور مبرا قسم کی لڑکی تھی کہ اس نے کوئی تعصّبات نہیں پالے تھے۔ وہ رندوں کے ساتھ بھی خوش تھی اور قلندروں کے ساتھ بھی مسرور و دلشاد۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک خود بر پا انداز رکھنے والی لڑکی تھی جو ایکسلیریٹر پر اپنا ننگا پاؤں رکھ کر فوکسی جیسی کار سے بھی جتیں لگوا سکتی تھی۔ اگر آپ یہ سمجھنے لگے ہوں کہ نائیلہ ایک متکبر، گھمنڈی اور مغرور لڑکی تھی اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی تو آپ غلطی پر ہیں۔ نائیلہ خود پسند نہیں تھی، خود مختار اور اپنے آپ سے آشنا تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پینٹ کر سکتی تھی۔ دونوں ہاتھ سے سکیچ بنا لیتی تھی۔ دونوں پاؤں پر بیٹھ کر سادھی لگا لیتی تھی۔ دونوں قوتوں سے طاقت حاصل کر لیتی تھی۔ اپوزیشن اور حکومتی حلقوں میں ایک ساتھ جلوہ نما تھی۔ اے سی، ڈی سی دونوں کرنٹ اس کے اپنے تھے لیکن وہ یزداں کے مقابلے میں اہرمن کو زیادہ نمبر دیتی تھی۔ جلال دین کے مقابلے میں گنگا رام کو زیادہ آسانی سے سکیچ کر لیتی تھی۔ اپنے گھر والوں کے مقابل اپنے گھرانے کے مخالفوں کو اچھا سمجھتی تھی۔ ہر گز متعصب نہیں تھی، آزاد خیال تھی اور اپنی آزاد خیالی کے اظہار کے لئے اسے بہ امر مجبوری اپنے اور اپنے پن کے خلاف جھکنا پڑتا تھا۔ زیادہ نہیں جھکتی تھی اور بار بار نہیں جھکتی تھی۔ بس جھکی ہی رہتی تھی۔ اس کے ابا جی اپنی بیٹی کے لبرل آئیڈیاز کو بہت ہی پسند کرتے تھے۔

اب آپ بیچ کی گفت و شنید کو چھوڑیں اور ان لمبی میٹنگوں میں جانے سے احتراز کریں جو نائیلہ اور سلیمان کے درمیان پورے سوا سال تک چلتی رہیں۔ آخر ایک روز بدھ کے دن انہوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا اور جمعرات کو ان کی شادی ہو گئی۔

سلیمان کے اپنے گاؤں میں اور گاؤں سے ملحقہ دوسرے گاؤں میں اور برادری اور سا کا داری کے تیسرے گاؤں میں کوئی مہینہ بھر ان کا ولیمہ چلتا رہا اور نائیلہ ان سب کے ویڈیو خود تیار کرتی رہی۔ جن سرداروں کو کچھ ولیموں میں نہیں بھی شریک ہونا تھا کہ ان کی آپس میں پرانی اڑ پھس تھی، وہ بھی ہر ولیمے میں شریک ہوئے۔ نوجوان قبیلہ سردار سلیمان کی وجہ سے نہیں، نئی سردارنی کی وجہ سے جس کے کپڑے بھی

عجیب ہوتے تھے اور جن کی فٹنگ بھی ٹھیک ٹھیک جگہوں پر ٹھیک ہوتی تھی بلکہ بہت ہی ٹھیک ہوتی تھی!

گاؤں کی عورتیں کیا بڑی بوڑھیاں، کیا جوان لڑکیاں اور کیا نوخیز چھوکریاں سبھی نائیلہ کی عاشق ہوگئی تھیں۔ جن باتوں کا اظہار مردوں کے منہ پر کرنے سے وہ ڈرتی تھیں اور جن باتوں کے ایک مرتبہ کردینے کی حسرت لے کر ان کی مائیں، ماسیاں اور دادی نانیاں قبروں میں چلی گئی تھیں، وہ باتیں نائیلہ پھٹاک دے کے بڑے بزرگوں کے منہ پر دے مارتی تھی اور ارد گرد دور دور تک پھیلی عورتوں کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جاتی تھی۔ ان کے ہردے دیر تک تالیاں بجاتے رہتے تھے اور ان کی کوکھیں ہر ہر جنبش کے ساتھ نعرے مارتی چلتی جاتی تھیں۔

نائیلہ نے اپنے علاقے کی بہت سی عورتوں کو چڑھاوے چڑھانے، درگاہوں پر جانے، پیروں کے پیر دابنے اور خاوندوں کی ہر بات ماننے سے توڑ لیا تھا۔ ان ساری باتوں میں سب اچھی بات ی تھی کہ جب خاوند پیار سے بلائے تو اس کے قریب نہیں جانا، اس کی نیت بدہوتی ہے! عورتوں نے اس مئسلے پر اپنے اپنے تجربات کی اتنی بڑی بڑی گھڑیاں کھولی تھیں کہ حویلی کے بڑے صحن میں دور دور تک یہی چرچے چیتھڑوں کی طرح پھیل گئے تھے۔

ایک مرتبہ جب سلیمان نے نائیلہ کو کوئی **Obscene** لطیفہ سنانے کے لئے دارو، حکمی، نینی، صفریٰ اور شادو کو اٹھا دیا تو نائیلہ نے سخت اعتراض کیا اور لطیفہ سننے سے انکار کردیا۔ جب سلیمان نے اپنے کلچرل پیٹرن کی وجہ سے مجبوری کا اظہار کیا تو نائیلہ نے اسے اور اس کے کلچرل پیٹرن کو مادر...... والی گالی دے کر خاموش کرادیا۔ پھر جب تک صغریٰ، شادو، نینی اور دارو کے سامنے اس لطیفے کو بلاکم و کاست سنوا نہیں دیا، نائیلہ نے اپنا احتجاج جاری رکاھ۔ دراصل وہ گاؤں کی عورتوں کے ذہن سے وہ جالے دور کرنا چاہتی تھی جو فیوڈل نظام اور ملا کے کلام نے متفقہ سازش کے ذریعے ان کے ذہنوں میں تانے تھے۔ وہ شفاف ذہن، شفاف الیکشن اور شفاف سودے کی قائل تھی۔ وہ ایسی غلط ملط غلطیان قسم کی زندگی کے بے حد خلاف تھی جس میں انسان ساری زندگی ٹوٹا تڑپتا ہی رہے اور تڑپ تڑپ کر جان دے دے۔

بل کھاتے چناب سے تھوڑ دور اس گاؤں میں نائیلہ کا ایسا دل لگا تھا کہ وہ اپنے میکے کو بھولتی سی جا رہی تھی۔ شہر میں تو اس کے ابا جی نے اپنی ناطاقتی اور کم دولتی کی وجہ سے اپنی گری ہوئی ساکھ کو ماڈرنزم کے گیسی غباروں سے اٹھایا ہوا تھا اور اپنی لڑکیوں کو **Permissive** بنا کر امیر حلقوں میں داخلہ لے رکھا تھا لیکن یہاں تو سچ مچ کی دولت تھی۔ حویلی کے اندر اور باہر جگہ جگہ فراوانی کے ڈھیر تھے۔ دیواروں سے پرانے تمول کے کھڑ پپڑ اتر رہے تھے اور حویلی کی امارت نے سارے گاؤں کو چندھیا کر رکھ دیا تھا۔ لوگ آنکھوں کے آگے ہاتھ کرکے اور دیواریں پکڑ پکڑ کر چلتے تھے۔ نئی گاڑیوں کا باڑہ حویلی کے عین سامنے تھا اور پرانی موٹروں کا قبرستان نہر پار نیائیوں میں تھا۔ جس مکان میں شکاری کتے رہتے تھے، اسی کے بالاخانے میں باز و، شکروں اور ترمتیوں کے پنجرے تھے۔

نائیلہ صرف ایک لفظ کی ادائی سے اس ساری دولت، ساری عزت، ساری نیک نامی میں برابر کی شریک ہوگئی تھی۔ لفظ کے کھل سم سم مین بھی کیا جادو ہے! صحیح بولا جائے اور بروقت بولا جائے اور سوچ سمجھ کر بولا جائے تو اس میں فائدے ہی فائدے ہیں، بھاگ ہی

بھاگ ہس، لوبھ ہی لوبھ ہے۔ نائیلہ ہیومن رائٹس کی لیڈر ہونے کے باوجود ہمیشہ فائدے کا سودا کرتی تھی..... جان بوجھ کر نہیں، بے ارادہ و بے اختیار۔ تدبیر و تفکر سے نہیں، بھول پنے اور الہڑ پن میں۔

لیکن _______ ایک شام!

ایک شام جب نائیلہ حویلی کے مدھرے پردوں والی چھت پر اپنا ایزل لگا کر ہوکو مصلن کا نیوڈ سکیچ کر رہی تھی تو چار کول اس کے ہاتھ سے ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا۔ ہاکو کے کندھے، اس کا گلا، گلے سے نیچے کا گات، مضبوط کمر، گہری ریڑھ، چلو بھر پیٹ اور سیدھی سطر ٹانگیں _____ نائیلہ شرم سے ڈوب مری کہ مجھے بھی اپنی Figure پر بڑا ناز تھا لیکن اصل Figure تو کسی انجانے مقام سے آتی ہے، ڈائٹنگ کر کے نہیں ملتی۔ اس کا سرچشمہ کہیں اور ہی ہے۔

وہ چوکی پر بیٹھی ہوئی ہاکو کے کالے سیاہ بدن اور کھلے ہوئے گھنیرے بالوں کو دیکھتی دیکھتی ٹرانس میں چلی گئی۔ اس کا سکیچ اچھا بنا تھا لیکن ہاکو کے بدن جیسا نہیں۔ اس کی آؤٹ لائن بڑی زوردار تھی لیکن ہاکو کی جلد جیسی نہیں تھی۔ اس کے چہرے کے سارے خدوخال ہوکو کے تھے اور مشابہت سو فیصد تھی لیکن وہ ہاکو نہیں تھی۔ چوکی پر بیٹھی ہوئی ہوکو اور ایزل پر لٹکی ہوئی ہاکو میں وہی فرق تھا جو لاسٹ سپر پر بیٹھے ہوئے آدمی اور صلیب پر لٹکے ہوئے انسان میں ہوتا ہے۔

ہاکو نے گردن گھما کر پہلے بی بی کو اور پھر اتنے بڑے چوکھٹے میں اپنے آپ کو دیکھا تو اپنے مقابلے میں اس کو بی بی چھوٹی چھوٹی سی لگی۔ اس نے ترس بھرے انداز میں کہا "شہدی اتنی امیر ہو کر بھی ہولی ہولی سی ہے اور اتنے کپڑے پہن کر بھی ننگی بچی لگتی ہے۔ پتہ نہیں اس کے ماپے کماپے کون ہیں اور اس کا تھوہ ٹھکانہ کدھر ہے۔" پھر اس نے نائیلہ کی طرف دیکھ کر کہا" کپڑے پہن لوں بی بی جی؟"

نائیلہ نے اثبات میں سر ہلایا تو پہلے ہاکو نے اپنی کالی سیاہ دھوتی باندھی اور پھر کالی ململ کا کرتہ پہن کر بٹن بند کرنے لگی۔

سارے میں ڈوبتے ہوئے سورج کی خوشبو پھیلنے لگی تھی اور پرندوں کی اپنی گھروں کو واپسی شروع ہو گئی تھی۔ ڈھلتے سورج کی رو پہلی کرنوں میں ہر پرندہ اپنی اپنی کرن کے ساتھ روشن ہوتا تھا۔ اپنی اڑان میں، اپنی بڑھت میں، پھر اتران میں اور آخر میں تیز پرواز کو کھڑے پروں سے روکتے ہوئے ہر پرندہ اپنی اپنی کرن میں، اپنی اپنی سپاٹ لائٹ میں وی وی آئی پی کی طرح لینڈ کر رہا تھا۔ نائیلہ نے سر کے اشارے سے ہاکو کو چلے جانے کے لئے کہا اور وہ اپنے چھتر گھسیٹتی ہوئی کوٹھے سے نیچے اتر گئی۔

نائیلہ نے اس سے پہلے نہ ایسے رنگ کا آسمان دیکھا تھا نہ کبھی ڈوبتے سورج کا نظارہ کیا تھا۔ شہروں میں چڑھتے اترتے سورج کو کوئی نہیں دیکھتا، نصف النہار والے سورج سے سبھی واقف ہوتے ہیں۔ لیکن ٹاپ لائٹ والا سورج کس کام کا! نہ شیڈ نہ سلہوٹ، نہ کیارونہ سکورو!

نائیلہ اپنی دونوں بیٹیاں پردے کی دیوار پر ڈال کر کھڑی ہو گئی اور اس نے اپنی ٹھوڑی ہاتھوں کے روے پر جمالی۔ ٹاہلیوں، شہتوتوں اور دھریکوں کے پیچھے ایک کھلا میدان تھا اور میدان کے پیچھے دور تک پھیلا ہوا ایک سیلا سیلا کنارہ۔ اس کے پیچھے سورج کا ایک تھال اور تھال سے گرے اور براؤن روشنی کا خراج۔ نائیلہ نے دو چار بار آنکھیں جھپکیں، سر کو ایک جھٹکا دیا لیکن وہ رنگ اپنی جگہ اسی طرح

قائم رہے۔ ہم کو تو ڈوبتا ہوا سورج سرخ نارنجی اور پیلا پیلا نظر آتا ہے اور ہم سونے کے اس تھال کو ہمیشہ اسی رنگ میں دیکھتے ہیں، ہم نائیلہ تو نہیں ناں۔ نہ ہم نے کبھی پینٹ کیا، نہ سکیچ کیا، نہ کلرنگ کی۔ ہم کو کیا پتہ رنگ کے خاندانوں میں کیسی کیسی رشتہ داریاں اور کس کس قسم کی دشمنائیاں ہوتی ہیں۔ کون کون چوری چھپے ایک دوسرے کے ساتھ ملتے ہیں اور کس کس قسم کی دشمنائیاں ہوتی ہیں۔ کون کون چوری چھپے ایک دوسرے کے ساتھ ملتے ہیں اور کس کس نے ایک دوسرے کے خلاف خفیہ عرضیاں ڈالی ہوئی ہیں۔ ہم کو تو ہر شیڈ بس ایک بنیادی رنگ ہی نظر آتا ہے ______ ہم سب بنیاد پرست ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے ملکوں کے جھنڈے بنیادی رنگوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ کسی میں کوئی شیڈ، سایہ، رنگ یا پھیکا لون نہیں ہوتا۔

پھر نائیلہ کے دیکھتے دیکھتے سورج کی اس گرے اور براؤن روشنی کے سامنے باریک گرد کا ایک پردہ اٹھا اور دیکھتے دیکھتے فرش سے عرش تک سیپیا ٹون کا ایک شامیانہ سا تن گیا۔ یہ رنگ سورج کی گرے اور براؤن روشنی سے باہر نکل کر اپنے پاؤں پر کھڑا تھا اور اس کی گہرائی اور گیرائی میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہو رہا تھا نائیلہ نے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا لیکن دریائے نیل کے منبع کی طرح اس رنگ کا کوئی سرچشمہ اسے نظر نہ آیا۔ پھر اس نے اپنی ٹھوڑی ہاتھوں کے ردے سے اٹھالی اور پردے کے ساتھ تن کر کھڑی ہو گئی۔ سیپیا ٹون کے اس مہین پردے کے پیچھے کروم اور اوکر کلر کے ملے جلے ذرات استر بن کر کھڑے ہو گئے تھے اور اس ویستاوژن پر مویشیوں کے ہیولے ابھرنے لگے تھے۔ بڑے بڑے بدنوں والی بھینسیں، اونچے اونچے سینگوں والے ناگوری بیل، دھنی کے چتکبرے داند اور بھیڑوں اور بکریوں کے الگ الگ ریوڑ، ان کے پیچھے پانچ اونٹ اور ساتھ جواں سال گائیوں کا ایک بے نیاز گلہ۔

لیکن یہ تو غبار کے پردے پر ان مویشیوں کے تصویر ہے، مویشی کہاں ہیں؟ وہ جانور کدھر ہیں جن کا یہ امیج ہے؟ اصل کہاں ہے جس کی یہ نقل ہے؟ ______ پھر تھوڑی دیر بعد نائیلہ نے گھنٹیوں کی ہلکی ہلکی آواز اور بھیڑوں کے ممیانے کی صدائیں سنیں۔ سورج اور نیچے ہو گیا تھا اور غبار کا سیپیا پردہ الٹرا میرائن رنگ کی جھلک دینے لگا تھا۔ "اف میرے خدا، یہ کس طرح سے ہو سکتا ہے!" نائیلہ نے پردے پر مکا مارتے ہوئے کہا "یہ تو کمپلی منٹی کلر ہیں ہی نہیں، پھر یہ ایک دوسرے کے قریب کس طرح آسکتے ہیں؟" کسی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اچانک اس نے دیکھا کہ بھیڑوں کے تین ریوڑ پیش منظر پر ابھر آئے ہیں اور ان تینوں ٹکٹیوں کے درمیان سات سات آٹھ آٹھ فٹ کا فاصلہ ہے۔ لیکن غبار کی سکرین پر یہ تینوں ریوڑ ایک دوسرے میں مدغم چلے آتے ہیں اور ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں۔ بھیڑیں اپنی چھ چھانچیا رفتار کے ساتھ بڑی مستعدی سے آگے بڑھ رہی تھیں اور سکرین پر نارنجی رنگ کا ایک بہت بڑا فلیش شرقاً غرباً پھیل گیا تھا۔ ان کے پیچھے دو ھیل کالی بھینسیں تھیں جن میں سے بیشتر کے سینگ نیچے کی طرف ڈھلکے ہوئے تھے۔ جو جوان تھیں، ان کے سینگ کنڈل دار تھے اور ان میں دریا کنارے کی چکنی مٹی اور گھاس کے سبز تنکے پھنسے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ دائیں پہلو پر ایک کالا سیاہ چمک دار ارنا بھینسا چلا آرہا تھا جس کا پٹھا کولڈ سٹارٹ ڈیزل انجن کے وجود کی طرح تیل سے سنا ہوا اور اسی طرح کا مضبوط تھا! ان کے پیچھے بیا ہی ہوئی گائیوں اور کنواری بچھیاؤں کا غول تھا جو ییلو اوکر رنگ میں نہایا ہوا تھا اور اب "پرپل کلر" سے گزر کر سبزی مائل سا ہو گیا تھا۔ ان کے

پیچھے بکریاں تھیں...... براؤن، سفید، کالی، چتکبری، سینگوں والی، گھونی، گابھن، سوکھی اور تھنوں کے بوجھ سے بمشکل چلنے والی۔ایسی بھی جس کے کان بہت لمبے تھے اور ایسی بھی جن کے گلے کے نیچے دو نلکیاں سے لٹکی ہوئی تھیں______اونٹوں کے قدم لمبے تھے مگر چال دھیمی تھی۔ان کے گلوں سے بندھے ہوئے لوہے کے ڈھیلے ڈھیلے گجر اندر لٹکی ہوئی لکڑی کی گلیوں سے بج رہے تھے اور ان کی مہاریں ان کی گردنوں کے گرد گلوبندوں کی طرح لپٹ ہوئی تھیں۔

پیچھے تین چرواہے تھے...... دو بڑی عمر کے گڈریے اور ایک نوجوان گلہ بان۔ڈوبتے ہوئے سورج ان تینوں کو جوگیا رنگ میں لپیٹ رکھا تھا اور ان کی دن بھر کی تھکاوٹ اور کھچل نے ان کے سارے وجود کو پاکیزگی کے غسل سے نکھارا ہوا تھا۔

دریا کے اس پار ٹھنڈی میٹھی زمین میں دن چرنے چگنے کے بعد گاؤں کی دولت واپس گاؤں آرہی تھی۔ڈھلا ہوا اور پگھلا ہوا سونا واپس اپنی کانوں میں پہنچ رہا تھا۔سورج اس قیمتی سرمائے کو گاؤں کی راہ دکھا کر آخری ڈبکی مارتے ہوئے کہہ رہا تھا "اے گاؤں کے لوگو! جب شام کو تم اپے مویشی جنگل سے لاتے ہو اور صبح چرانے لے جاتے ہو تو ان سے تمہاری عزت وشان ہے۔میں گواہ ہوں تم عزت وشان والے ہو کہ تم کو ان کی وجہ سے عزت وشان عطا کر دی گئی ہے۔"

گاؤں کا ان پڑھ مولوی نیم پختہ مسجد کی ٹوٹی ہوئی سیڑھیوں کے درمیان کھڑا اپنی بے رس اور خشک آواز میں مغرب کی اذان دے رہا تھا اور نائیلہ چھت پر کھڑی بھیں بھیں رو رہی تھی۔اس نے اپنے منہ پر پورے ہاتھ کا دباؤ دے کر اپنی آواز روکنا چاہی تو اس کی گھگھی بند گئی۔اور پھر تھوڑی دیر بعد اس کا سارا بدن سسکیوں سے ملنے لگا اور اس کی ناک اور حلق سے ایسی آواز آنے لگی جیسے سردیوں کی رات میں غیر محفوظ بھٹ کے اندر بے ماں کا پلا رویا کرتا ہے۔

پھر اچانک نیچے گلی میں آدمیوں کا شور بلند ہوا اور لوگ تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگے۔وہ ایک دوسرے کو آوازیں دے رہے تھے اور نیا بائیسکوپ دیکھنے پر اکسا رہے تھے۔نائیلہ نے پردے اوپر سے آگے کو ہو کر دیکھا تو اماں طالعاں کی تندوری پر پانچ چھ جوان، بوڑھے اور کڑ بڑے مرد جمع تھے اور تالیاں بجا بجا کر اونچے اونچے ہنس رہے تھے۔

سندر میوکی جوان بچھیا تائی خورشید کا گلے سے بچھڑا ہوا لیلا جنگل سے لے کر آرہی تھی اور اسے اپنے بے سینگ گھونے سر کی ڈھڈیں مار مار کر سیدھے راستے پر رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ان دونوں کو مویشیوں کے قافلے سے بچھڑے پہلے ہی بڑی دیر ہو گئی تھی اور یہ احمق اماں طالعاں کی تندوری تک پہنچ کے پھر گڑبڑا گیا تھا۔بچھیا اس کا پیچھے کا راستہ روکے کھڑی تھی اور اسے آگے چلانے کی کوشش کر رہی تھی۔لوگ ہنس رہے تھے اور تالیاں بجا رہے تھے۔

جوان جہان سفید براق بچھیا...... سفید ستواں دم، کالی سیاہ آنکھیں، ماتھے پر شاہی بھنور، تھوتھنی کے اوپر بڑی تتلی جتنا براؤن دھبہ، شام کا وقت، گاؤں کے مرکز سے دور، اکیلی ذات اور بے ہودہ مردوں کی ہنسی........ شرما بھی رہی تھی اور اپنی ذمہ داری کو نبھانا بھی چاہتی تھی۔اور ظلم کی بات یہ کہ اس کی ذمہ داری ایک احمق ترین مخلوق کے روپ میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔

پھر جب بھٹکے ہوئے بدھومیاں کو سامنے میراثیوں کے پرنالے میں پیپل کا پیڑ نظر آیا تو اسے اپنا کھویا ہوا روٹ مل گیا۔اتنی تیزی

سے سے اپنے باڑے کی طرف بھاگا کہ اس کے پیچھے سندر کی بچھیا کا بھاگتے بھاگتے سانس پھول گیا۔

نائیلہ نے سوچا، کیا میں سلیمان سے جا کر یہ نہ کہوں کہ میں بھی تائی خورشید کا بھٹکا ہوا لیلا ہوں اور مجھے بھی اپنے باڑے تک پہنچنا ہے اور مجھ سے بھی میرا راستہ گم ہو گیا ہے۔ کیا تم میرے لئے سندر کی بچھیا بن کر بغیر سینگ مارے باڑے تک پہنچا دو گے؟ لیکن اسے معلوم تھا کہ سلیمان ایسا نہیں کر سکے گا۔ وہ نیچے حویلی میں اپنی رائفلوں، بندوقوں اور پستولوں کو گریس لگا رہا تھا اور اپنا وقت بے ہودہ کاموں میں صرف کرنے کا روادار نہیں تھا۔

پھر وہ حویلی کی لپی ہوئی چھت پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی اور منہ اوپر اٹھا کر بولی " میں تو جو تھی سو تھی، تو نے بھی مجھے یہ نہیں بتایا کہ اس نماز میں کتنی رکاتیں ہوتی ہیں اور کس میں کیا پڑھتے ہیں_____ پر اب میں نے بھی تیرا پیچھا نہیں چھوڑنا۔" پھر اس نے اپنی اپاہج نانی کی طرح سامنے کی دیوار پر دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں ماریں اور کھلے ہاتھوں کو اپنے منہ پر مل لیا...... اس کے آگے کیا کرنا تھا، اسے معلوم نہیں تھا۔ اتنی بڑی مصور دیکھتے دیکھتے اس فریسکو کا حصہ بنتی جا رہی تھی جس میں رنگ برنگی دھول کے پیچھے گاؤں کے مویشی گھر واپس آ رہے تھے!

راز دان

ابھی پانچ بجنے میں پورے پانچ منٹ تھے اور سٹیشن پر چار پانچ آدمی ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ یہ کوئی اتنا بڑا اسٹیشن نہ تھا، لیکن جنکشن ہونے کی وجہ سے بہت بڑا دکھائی دیتا تھا۔ میل اور ایکسپریس دونوں گاڑیاں یہاں سے گزرتی تھیں، لیکن ان کا قیام بہت مختصر ہوتا تھا۔ برانچ لائن کا ایک سرا یہاں تھا تو دوسرا ادھر بارڈر کے پار۔ پہلے اس لائن پر بہت بھیڑ رہتی تھی لیکن جب سے آدھی کٹ کر دوسرے دیس میں رہ گئی تھی، سٹیشن سونا ہو گیا تھا۔ پہلے اخبار رسالوں کا سٹال بند ہوا، پھر چائے والے نے اپنا ڈربہ بند کیا اور شدہ شدہ چھابڑی والے بھی سد ھار گئے۔ صبح ایک گاڑ برانچ لائن پر جاتی اور سورج ڈوبنے سے پہلے لوٹ آتی۔

پانچ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ اس نے عطیہ کا خط پرس میں بند کیا اور ویٹنگ روم سے باہر نکل آئی۔ پلیٹ فارم پر ایک قلی ٹرالی دھکیلتا ہوا جا رہا تھا اور دوسرا اسی ٹرالی کے کنارے بیٹھا اپنی پگڑی باندھ رہا تھا... دور نیم اور شیشم کے درختوں میں گولائی پر گھومتی ہوئی لائن کے پاس سگنل اپنا پنکھ جھکائے کھڑا تھا۔ سرکنڈوں کی اوٹ سے دھوئیں کا بادل بلند ہو رہا تھا اور گاڑی ادھر لپک رہی تھی۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ سفید کوٹ کی جیبوں میں ڈال لئے اور سگنل کی جانب منہ کر کے کھڑی ہو گئی۔ سیاہ چرمی پرس اس کے سفید کوٹ کی آستین اور جیب کے درمیان سفید کلائی پر لٹک رہا تھا اور وہ پلیٹ فارم پر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ گاڑی کی رفتار سست ہوتی جا رہی تھی اور ایک لمحے کے لئے اسے یوں لگا جیسے وہ سگنل کے پاس رکی، سفید دھوئیں کا بادل چھوڑا اور ہولے ہولے پلٹنے لگی۔ وہ پلیٹ فارم پر اپنی سیاہ اونچی ایڑی ٹک ٹک کرتی تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ ٹرالی پر بیٹھا ہوا قلی زور سے چلایا "بیگم صاحب گاڑی آ رہی ہے، ایک طرف ہو جاؤ"....... اور اس نے ایک طرف ہونے سے پہلے دیکھا کہ گاڑی کو بریکیں لگ رہی تھیں اور مسافر اپنا سامان اٹھائے کھلے دروازوں میں کھڑے تھے۔

اونچی ایڑی کو پلیٹ فارم سے جو بھرا و پر اٹھا کر اس نے دیکھا۔ فراز اپنی بانس کی چھڑی کا سہارا لے کر قلی سے سامان اٹھوا رہا تھا۔ ایک بار تو اس کے جی میں آئی کہ گھڑی والے بابا کے ساتھ کبڑی ہو کر سٹیشن سے باہر نکل جائے، لیکن اس سے پلٹا نہ گیا۔ شاید بابا دور نکل گیا تھا!

جیبوں سے دونوں ہاتھ نکال کر اور سیاہ پرس کو درمیانی انگلی کی آخری پور پر لٹکا کر وہ جلدی سے آگے بڑھی اور فراز کے پیچھے جا کر

ہولے سے بولی: "فرزی" اور فراز کا منہ کھلا رہ گیا۔ اس نے اخبار کے گرد لپٹی ہوئی مٹھی اس کے سفید کوٹ سے ڈھکے ہوئے سفید کندھے پر رکھ دی اور شرارت بھرے دیدے گھما کر بولا...... لیکن انجن نے اس زور سے سٹیم چھوڑی کہ کسی کو کسی کی بات سمجھ میں نہ آسکی۔

وہ فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں بیٹھے تھے اور ان کے سامنے شیشم کی قوی ہیکل گول میز پر سٹیشن سے باہر کے نانبائی کی چائے روغنی پیالیوں میں پڑی تھی۔ فراز دونوں ٹانگیں کرسی کے بازو پر سے گزر کر بیٹھا تھا اور اپنے بوٹوں کی نوکوں پر باری باری بانس کی چھڑی مار رہا تھا۔ اس نے سر پیچھے لٹکا کر کہا:

" آپ کو اس علاقے میں میری تعیناتی کا اور خاص طور پر آج کی آمد کا پتہ کیسے چلا؟"

رعنا نے کہا" ہمیں تمہاری کس بات کا علم نہیں ہوتا۔ اظہار نہیں کرتے تو تم سمجھتے ہو کہ ہم بے خبر ہیں۔" پھر اس نے نظریں اٹھا کر فرازی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ گرد سے اٹا ہوا تھا اور جبڑوں پر بڑھتی ہوئی شیو کا سرمگیں غبار چھا رہا تھا۔

رعنا نے چائے کا پیالہ اٹھا کر اپنے خشک ہونٹوں سے لگا لیا اور پیالے کے سبز کنارے پر سے فراز کی سانولی چھب دیکھنے لگی۔ فراز اسی طرح سر گرائے اور پیر جھلاتے ہوئے بولا" آپ کی سہیلی ناراض تو نہیں ہوئی؟"

رعنا نے پیالہ ہونٹوں سے پرے ہٹا لیا اور متعجب ہو کر بولی "ایسی باتیں پوچھنے کی ہمت باقی ہے کیا؟"

" کیوں؟" فراز نے بڑے تحمل سے کہا۔ "اس میں ہمت کی کیا بات ہے؟"

"دل پر ہاتھ رکھ کے کہتے ہو" رعنا نے مسکرا کر پوچھا "یا اوپرے جی سے کہہ رہے ہو؟"

فراز سنبھل کر بیٹھ گیا اور سنجیدہ صورت بنا کر بولا" آپی! ایک بات تو آپ بھی تسلیم کریں گی......." لیکن رعنا نے بات بیچ میں ہی کاٹ دی اور سنجیدہ ہو کر بولی "اب مجھے آپی کیوں کہتے ہو.......... جب عطیہ کا رشتہ ہی بیچ میں نہ رہا تو آپی کیسے رہ گئی؟"

فراز نے کہا" ایک بات تو آپ بھی تسلیم کریں گی رعنی کو عطیہ میں کوئی بات ایسی نہ تھی جس پر بے اختیار پیار آجایا کرتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ مجھے اس سے محبت تھی۔"

"اور اب وہ محبت نہیں رہی؟" رعنا نے سوال کیا۔

" کچھ کہہ نہیں سکتا۔" فراز بولا۔ "جیسے بلاٹنگ پر پلاسٹک کی ہلکی سی تہہ چڑھا دی جائے۔ بلاٹنگ بھی رہے اور واٹر پروف بھی ہو جائے۔"

"اور عطیہ کے وہ سارے خط جو اس نے تمہیں لکھے تھے؟" رعنا کو بلاٹنگ پیپر سے خط یاد آگئے۔

"میرے پاس محفوظ ہیں۔"

"اور اگر انہیں تمہاری بیگم دیکھ لیں.......؟"

"میں نے کہا ناں کہ محفوظ ہیں۔"

"وہ خط بھی جو اس نے تمہیں ایبٹ آباد سے لکھا تھا؟"

" وہ بھی۔لیکن آپ کو کیسے معلوم ہے؟"

"اس نے تمہیں کون سا خط لکھا جو مجھے نہیں دکھایا۔تمہارا کون سا خط تھا جو مجھے نہیں پڑھایا!"

" گویا ہماری محبت میں آپ کا بھی ہاتھ تھا!"

رعنا مسکرانے لگی،لیکن اس کی مسکراہٹ میں وہ بات پیدا نہ ہوسکی جس کی اسے توقع تھی۔فراز کو یوں لگا جیسے اس نے عطیہ سے شادی نہ کرکے بڑی بھول کی ہے۔ایک وہ زمانہ تھا جب وہ ساری ساری رات بیٹھ کر عطیہ کو طول وطویل خط لکھا کرتا تھا اور پھر بھی اس کی تسلی نہ ہوتی تھی۔ایک یہ زمانہ ہے...... لیکن یہ کیسا مانہ ہے!فراز سوچ میں پڑ گیا۔یہ بھی تو اچھا خاصا زمانہ ہے،کوئی ایسی بات نہین جس کے متعلق.......

رعنا نے کہا"جب ہم ایبٹ آباد میں تھے تو رات رات بھر تمہاری باتیں کیا کرتے تھے۔عطیہ مجھے وہ سب کچھ بتایا کرتی تھی جو تم اس سے کہا کرتے تھے۔اس زمانے میں تم نے شعر کہنے بھی تو شروع کردیئے تھے۔"

فراز مسکرایا اور کرسی کی پشت پر سر ڈال کر بالو"ہاں،اس زمانے میں آزاد نظم کا بڑا رواج چل نکلا تھا اور میں بھی دوسروں کی تقلید میں مبہم قسم کی شاعری کیا کرتا تھا۔" پھر وہ مسکرانے لگا اور اپنی ٹانگ ذرا اور زور سے جھلانا شروع کردی۔رعنا نے روغنی پیالے کے کنارے پر انگلی پھیری اور اپنی سرخ سرخ پور کو دیکھتے ہوئے بولی "تم نے لکھا تھا...... جاگ اے جان شبستان تیری تاریکی میں،قافلے منزل جاناں ......"

فراز سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور بولا"میں نے یہ نظم تو کسی کو بھی نہیں دکھائی،پھر تم نے کہاں سے سنی؟"

رعنا کا رنگ ذرا پیلا پڑ گیا اور وہ مسکرا کر بولی"جب تم گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے پنڈی آئے تھے تو یہ نظم لکھ کر ساتھ نہیں لائے تھے......؟"

"لایا تو ضرور تھا"فراز وثوق سے بولا"لیکن میں نے کسی کو سنائی تو نہ تھی۔"

"ضرور سنائی ہوگی۔"رعنا نے کہا۔"ذرا یاد تو کرو جب ہم شہر سے چلتے چلتے چھاؤنی کے راستے پر نکل گئے تھے اور تم ریڑھی والے سے ٹھنڈی ٹھنڈی گنڈیریاں خرید کر لائے تھے۔"

فراز کے ذہن میں اس واقعے کی ہلکی سی تصویر ابھری اور پھر دھندلانے لگی۔وہ تینوں ____ عطیہ،رعنا اور وہ خود شام کی سیر کو نکلے تھے۔مری کی ٹھنڈی ہوا میلوں کی مسافت سے کرکے پنڈی کی شاہراہوں میں داخل ہو رہی تھی اور بڑے بڑے اوورکوٹوں کے اندران کے جسم کانپ رہے تھے۔دور ریلوے سٹیشن کی مدھم بتیوں کے اوپر ایک چمکدار ستارہ جگمگا رہا تھا اور رعنا آنکھوں پر ہاتھ رکھے جی ہی جی میں کوئی دعا مانگ رہی تھی۔پھر اس نے ایک دم ہاتھ چہرے سے اٹھا کر پہلے فراز کو اور پھر عطیہ کو دیکھا تھا اور بڑی آہستہ آواز میں جیسے اپنے آپ سے کہا تھا"خدا کرے تمہارا چہرہ ہمیشہ ہمیشہ میرے ذہن میں یونہی جگمگاتا رہے۔"اس پر فراز کو اپنا ہم جماعت احسن یاد آ گیا تھا،جو ہمیشہ ایسی جذباتی حرکتیں کیا کرتا تھا۔

کوٹھی کے سامنے چھوٹا سالان تھا، جیسا کہ عام طور پر کوٹھیوں کے سامنے ہوا کرتا ہے۔ عام کوٹھیوں کے برعکس اس کا ایک گیٹ تھا۔ سامنے والے برآمدے کے ایک کونے میں گول کمرہ تھا اور دوسرے میں چوکور۔ فراز اسی گول کمرے میں آ کر ٹھہرا تھا اور چوکور کمرے میں عطیہ اور رعنا رہتی تھیں۔ اب کی بار رعنا گرمیوں کی چھٹیوں مین اپنے گھر نہ گئی تھی بلکہ سہیلی کے پاس پنڈی چلی آئی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ ان چھٹیوں میں فراز پنڈی آ رہا ہے اور شاید انہی چھٹیوں میں ان دونوں کی منگنی ہونے والی تھی۔ اس نے عطیہ سے فراز کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا مگر ابھی تک اسے دیکھا نہ تھا۔ فراز نے بھی رعنا کی بہت سی باتیں سنی تھیں مگر اس سے ملا نہ تھا۔ جب خالہ اماں اور عطیہ فراز کو سٹیشن پر لینے گئیں تو ان کے ساتھ رعنا بھی تھی اور یوں پنڈی ریلوے سٹیشن کے بڑے برآمدے میں ان کا تعارف ہوا۔

عطیہ بڑی متلون مزاج اور مغرور قسم کی لڑکی تھی، جیسا کہ عام طور پر خوبصورت لڑکیاں ہوا کرتا ہیں۔ بات بات پر روٹھ جاتی تھی، جیسے نوجوان لڑکیاں چچیرے اور خلیرے بھائیوں سے روٹھا کرتی ہیں۔ اسے فراز اچھا لگتا تھا، بہت ہی اچھا لیکن وہ ہر لمحہ اس معاملے کی جانچ میں لگی رہتی تھی کہ وہ اسے کس قدر چاہتا ہے، کتنا پیار کرتا ہے، کیسے کیسے نخرے برداشت کر سکتا ہے، ایک دن میں کتنی بار منا سکتا ہے۔ رعنا کو اس کا یہ رویہ پسند نہ تھا لیکن وہ اسے کس طرح سمجھاتی اور کیسے کہتی کہ فراز سے یوں نہ روٹھا کرو، وہ تو بہت ہی پیارا بچہ ہے! کیرم کھیلتے، تاش بانٹتے، ریکارڈ بجاتے وہ خواہ مخواہ فراز سے الجھ پڑتی اور پھر منہ سجا کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ فراز اور رعنا گول کمرے میں اکیلے رہ جاتے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور سارا سامان قالین پر چھوڑ کر باہر نکل آتے....... فراز لان میں اور رعنا برآمدے میں سے ہو کر چوکور کمرے میں۔ پھر رعنا کے پاؤں میں ایک چکر آ جاتا...... چوکور کمرے سے لان تک اور لان سے پھر واپس چوکور کمرے تک صلح کی شرائط طے ہوتیں۔ معاہدے کے ضوابط مقرر ہوتے۔ دونوں فریقوں پر دبی زبان میں زور ڈالا جاتا۔ نسوانیت کا خیال رکھا جاتا۔ مردانگی سے اپیل کی جاتی۔ فراز لان سے اٹھ کر چوکور کمرے میں آتا، معافی مانگتا اور پھر عطیہ اسی طرح منہ سجائے مان جاتی....... اس ناراضگی کی مدت میں رعنا کو فراز کے ذرا سا قریب ہونے کا موقعہ ملتا۔ وہ عطیہ کے خلاف جو کچھ کہتا، رعنا کو حقیقت معلوم ہوتی۔ وہ جی ہی جی میں اس کی ہاں سے ہاں ملائے جاتی لیکن فرض کے طور پر اپنی سہلی کی خاطر وہ سب کچھ سہ جاتی اور بس اسی قدر کہہ سکتی "یقین مانو وہ اس قدر بُرا نہیں۔" اور جب اپنی سہیلی کے بگڑے ہوئے تیور دیکھتی تو جھٹ کہتی "اگر ہے بھی تو نہیں رہے گا۔ تم اسے ایک موقع تو اور دو۔" اور جب دونوں کی صلح ہو جاتی تو رعنا کو یوں لگتا جیسے وہ پنڈی میں ہوتے ہوئے بھی واپس اپنے گاؤں پہنچ چکی ہے۔

ایک دن خالہ نے رعنا کو علحیدگی میں بلا کر عطیہ اور فراز کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ وہ فراز کی والدہ کو خط لکھنا چاہتی تھیں، لیکن انہیں ابھی تک عطیہ کے رویے کا ٹھیک سے اندازہ نہ ہوا تھا۔ رعنا کا جی چاہا کہ تعریف و توصیف کے وہ جملے جو اس نے وقتاً فوقتاً کبھی پڑھے تھے، سارے کے سارے فراز کی ذات سے منسوب کر دے۔ مگر وہ اپنی سہیلی کی وکیل تھی اس لئے اس نے خالہ کو یقین دلا دیا کہ عطیہ میں لاکھ خامیاں سہی، فراز کو اس سے اچھا رشتہ نہ مل سکے گا۔ خالہ کا بھی یہی خیال تھا، لیکن وہ کسی اور کے منہ سے اپنی بچی کی تعریف سننا چاہتی تھیں۔ انہوں نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا "ڈاکٹری پاس کر لینے کے بعد فراز کو اچھی سی نوکری تو مل جائے گی ناں؟" رعنا نے مسکرا کر کہا "خالہ جان! یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ ہمارے یہاں ڈاکٹروں کی جس قدر قلت ہے، آپ کے سامنے ہے۔ فراز کو تو امتحان

پاس کئے بغیر اچھی سے اچھی نوکری مل سکتی ہے۔" خالہ جان کو اسی جواب کی امید تھی، لیکن انہوں نے منہ بنا کر کہا" کیا کروں رعنا، کئی چیزیں سوچنا پڑیت ہیں۔ عطیہ کے لئے اتنے رشتے آرہے ہیں کہ فراز کا نمبر بہت دور جا پتا ہے، لیکن اپنے اپنے ہوتے ہیں اور غیر غیر!"

"بے شک!" رعنا نے ہولے سے کہا۔" آپ کو ساری باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس معاملے میں ٹھیک سے کوئی رائے نہیں دے سکتی۔" پھر وہ خاموش ہوگئی اور اس کے سامنے کسی قصبے کا ایک چھوٹا سا سکول ابھر آیا جس کی چار دیواری کچی اینٹوں سے بنی تھی، اندر چنبیلی اور موتیے کے پودے تھے، صحن میں شیشم کے پیڑوں کا چھوٹا سا جھنڈ تھا، پی ڈبلیو ڈی کے تعمیر کردہ چار پانچ کمرے تھے اور ان کے ساتھ ایک چھوٹے سے کوارٹر میں ہو ہیڈ مسٹرس کی زندگی گزار رہی تھی۔ چند مقامی استانیاں تھیں، ایک بوڑھا سا چوکیدار تھا اور دھوپ میں بیٹھی رہنے والی موٹی سی "بلاوی" تھی........ عطیہ اور فراز کسی بڑے شہر کی ایک بڑی سی کوٹھی میں رہتے تھے اور صبح صبح ایک مہذب بیرا چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا ان کے کمرے میں ناشتہ لایا کرتا تھا۔ ان کے یہاں بچہ ہونے والا تھا اور عطیہ نے اپنے خط میں یہ بات بڑے پوشیدہ طریق پر کافی وضاحت سے رعنا کو لکھی تھی۔

"ہاں تو پھر؟" خالہ نے پوچھا اور رعنا اپنے خواب سے چونک اٹھی۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور ہولے سے کہا" آپ بسم اللہ کر کے لکھ ہی دیں خالہ جان!" خالہ اماں نے ہامی بھر لی اور رعنا ان میں آ کر کیرم کا مقابلہ دیکھنے لگی۔

اس سے ایک دن پہلے کی بات ہے..... فراز اور عطیہ کے درمیان بڑا جھگڑا ہوا تھا اور انہوں نے ایک دوسرے سے کبھی نہ بولنے کا عہد کر لیا تھا۔ بات یہ ہوئی کہ وہ تینوں گول کمرے میں بیٹھے ریڈیو پر ڈرامہ سن رہے تھے۔ یہ کسی انگریزی ڈرامے کا ترجمہ تھا۔ فراز اس میں گہری دلچسپی لے رہا تھا اور عطیہ بار بار اسے بند کر دینے کو کہہ رہی تھی۔ رعنا معاملے کو تشویش ناک صورت سے بچانے کے لئے آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی" کوئی بات نہیں، بیس منٹ باقی ہیں۔ ڈرامہ ختم ہو جائے گا۔" لیکن عطیہ اسی بات پر تلی ہوئی تھی کہ ریڈیو ہر حال میں ڈرامہ ختم ہونے سے پہلے بند ہونا چاہیے۔ فراز عطیہ کی باتوں کی پرواہ کئے بغیر مزے سے ریڈیو سنتا رہا اور بیچ بیچ میں مسکراتا بھی رہا۔ عطیہ سے برداشت نہ ہوسکا۔ وہ چپکے سے اٹھی اور برآمدے میں جا کر مین سوئچ آف کر دیا۔ ساری کوٹھی کی بتیاں بجھ گئیں۔ اندر سے خالہ جان کی آواز آئی" یہ بجلی آج پھر چلی گئی۔" فراز نے کمرے سے کوئی جواب دینا چاہا تو رعنا نے اندھیرے میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولی" خالہ جان سے کچھ نہ کہئے گا، وہ خواہ مخواہ پریشان ہوں گی۔ میں باہر جا کر عطیہ کو سمجھاتی ہوں۔" اپنا یہ فقرہ ختم ہونے کے کافی دیر بعد تک بھی رعنا نے وہ ہاتھ یونہی فراز کے منہ پر رہنے دیا اور پھر ٹٹولتی ہوئی باہر برآمدے میں نکل گئی۔

ایک لمحے میں کوٹھی کی بتیاں پھر جگمگا اٹھیں۔ عطیہ جا کر اپنے کمرے میں لیٹ گئی اور رعنا سٹول کھینچ کر اس کے سرہانے بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر تک وہ اسے مناتی سمجھاتی رہی، پھر مایوس ہو کر اٹھی اور فراز کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ اپنا سامان باندھ رہا تھا اور میز کی ساری چیزیں سمیٹ چکا تھا۔ رعنا کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی فولاد سے پنجے کے تیز ناخن اس کے کلیجے میں گھسے جا رہے ہیں اور وہ گوشت چرنے کی آواز سن رہی ہے۔ اس نے کواڑ کے ساتھ لگ کر ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا" یہ کیا کر رہے ہو فرزی؟"

فراز نے سر اوپر اٹھائے بغیر جواب دیا" کچھ نہیں۔ یونہی بس سامان ٹھیک کر رہا ہوں۔"

رعنانے کہا "سامان اس طرح تو ٹھیک نہیں کیا کرتے۔"

فراز نے کہا "ہمارے یہاں ایسے ہی کیا کرتے ہیں۔ جب کسی کو اشاروں ہی اشاروں میں بستر گول کرنے کی تجویزیں ملنے لگیں تو وہ سخت احمق ہوگا اگر........."

"تم غلط سمجھتے ہو۔" رعنا نے بات کاٹ کر کہا "عطیہ کا دل برا نہیں ہے، اس کا یہ مطلب تو نہ تھا۔"

"یہ عجب بات ہے۔" فراز نے مڑ کر کہا۔ "جب بھی کوئی کسی کے ساتھ زیادتی کرتا ہے، اس کے حمایتی مظلوم کو یہی کہنے آجاتے ہیں کہ اس کا دل برا نہیں ہے۔"

رعنانے کہا "میں اس کی حمایتی تو نہیں ہوں فرزی!"

"اور کیا میری ہیں؟" فراز نے چڑ کر کہا اور رعنا خاموش ہوگئی۔

پھر وہ دبے پاؤں عطیہ کے کمرے کی طرف لپکی، لیکن راستے ہی میں رک گئی۔ اس کا دل چاہا کہ برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھ کر رونے لگ جائے اور اس وقت تک روتی رہے جب تک اس کا جسم سیڑھیوں کی طرح سرد نہ ہو جائے۔ اس نے اندر جا کر لیٹی ہوئی عطیہ کا شانہ جھنجھوڑا اور خوف زدہ آواز میں کہا:

"فراز جا رہے ہیں عطیہ!"

عطیہ نے جھنجلا کر شانہ چھڑوالیا اور تنک کر بولی "جانے دو، اس کے بغیر شہر اجڑ جائے گا کیا؟" اور رعنا کو یوں لگا جیسے کسی نے کہا ہو "جانے دو، سورج نہ چڑھے گا تو شہر میں اندھیرا ہو جائے گا کیا!" فراز چلا جائے اور پنڈ کا دیس بستا رہے، یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے بھلا۔ اس نے سماجت بھرے لہجے میں عطیہ سے کہا "اٹھو تو وہی، ایک بار اس کے کمرے تک تو چلو۔"

لیکن عطیہ نے چڑ کر رضائی سے سر ڈھانپ لیا اور نیند بھری آواز میں منمنائی "رہنے دو رعنا۔ آؤ سو جاؤ۔"

تھوڑی دیر تک رعنا چارپائی کے پائے پر پاؤں رکھے کھڑی رہی۔ پھر شال کو کندھوں کے گرد لپیٹ کر گول کمرے کی طرف چلی۔ فراز اپنی چپلیاں اخبار کے کاغذ میں لپیٹ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر رعنا کی طرف دیکھا اور پھر پیکٹ کے گرد رسی لپیٹنے لگا۔

رعنا کونے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی اور دردناک لہجہ میں بولی "تم واقعی جا رہے ہو فراز؟"

فراز نے بڑے روکھے پن سے جواب دیا "جی" اور اپنا اٹیچی کیس کھول کر پیکٹ اس میں ڈال دیا۔

"خالہ جان پوچھیں گی تو کیا جواب دو گے؟" رعنا نے پوچھا۔

"کہہ دوں گا گھر سے تار آگیا ہے، کوئی ضروری کام ہے۔"

"اور اگر انہوں نے کہا تار مجھے دکھاؤ؟"

"تو میں کہوں گا میں نے پھاڑ ڈالا ہے۔"

"اگر وہ نہ مانیں تو؟"

"تو بھی میں چلا جاؤں گا۔"

رعنا نے ہولے سے کہا "عطیہ کا قصور ایسا سنگین تو نہیں کہ معافی ہی نہ دی جا سکے۔"

فراز نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا "یہاں معافی مانگنے ہی کون آیا ہے جو دینے کا سوال پیدا ہوتا۔"

"میں جو مانگنے آئی ہوں اس کی جگہ! "

" کوئی کسی کی جگہ معافی کیوں مانگے رعنی آپ......اور پھر آپ کو کیا ضرورت پڑی ہے؟"

"مجھے ضرورت پڑی ہے ناں۔" رعنا نے رونکھی آواز میں کہا "بس اسے معاف کردو۔وہ بے وقوف ضرور ہے، بری نہیں۔"

فراز سوچ میں پڑ گیا تو رعنا کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس آ کھڑ ہوئی۔اس نے دیکھا فراز کی سیدھی مانگ کافی چوڑی تھی اور اس کے دونوں کناروں پر تین چار سفید بال برقی روشنی میں چمک رہے تھے۔اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی کنگھی جھولی میں ڈالی ہوئی تھی اور وہ بڑ ریزی کے ساتھ کچھ سوچ رہا تھا۔اچانک رعنا اس کے سامنے فرش پر بیٹھ گئی۔فراز نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا تو اس کی آنکھیں دھند کی راتوں میں پنڈ کے سنسان کوچے نظر آئیں۔اسے ابھی اس بات کا احساس نہیں ہے۔"فراز نے بڑی محبت سے رعنا کا کندھا تھپتھپایا اور آہستہ سے کہا" کاش ہمیں بھی زندگی میں ایسا ہی کوئی دوست میسر آتا!"

اگلے دن جب فراز سو کر اٹھا تو اس کی ساری چیزیں بڑی قرینے سے کمرے میں سجی ہوئی تھیں اور آئینے کے پاس اس کی سیاہ نوٹ بک پڑی تھی جس میں وہ آزاد نظمیں لکھا کرتا تھا۔

ویٹنگ روم کے سامنے سے وہی قلی ٹرالی دھکیلتا ہوا گزرا تو فراز اپنے خواب سے چونکا اور اپنے سوال کا جواب نہ پا کر پھر پوچھنے لگا"میں نے وہ نظم تو کسی کو بھی نہ دکھائی تھی، پھر تم نے کہاں سے سنی رعنی؟"

رعنا نے کہا "عطیہ نے تمہاری نوٹ بک سے پڑھ کر مجھے سنائی تھی۔"

"لیکن اس نے مجھ سے تو کبھی اس بات کا تذکرہ نہ کیا کیا۔" فراز نے کہا۔

"تم سے کیسے کرتی" رعنا نے مسکرا کر کہا" چوری کا مال ہر ایک کو تو نہیں دکھایا جاتا ناں۔" پھر اس نے شیشم کے قوی ہیکل میز سے اپنا پرس اٹھا کر گود میں ڈال لیا اور سوالیہ نگاہوں سے بولی "اب تو عطیہ کا کوئی خط نہیں آتا؟"

فراز نے کہا "اس نے پہلے مجھے کتنے خط لکھے تھے جواب آتا۔سنا ہے اس کی شادی ہو رہی ہے؟"

رعنا خاموش رہی۔

فراز نے پھر پوچھا "ہو رہی ہے ناں اس کی شادی؟"

رعنا نے سر جھکا کر کہا" تمہیں کیا، اب وہ چاہے کچھ ہی کرے۔تم مردوں سے تو اتنا بھی نہیں ہوتا کہ شادی کروانے سے پہلے کم از کم اپنے آپ سے ہی پوچھ لیں کہ......."لیکن وہ پھر خاموش ہو گئی اور فراز نے آگے ہو کر پوچھا" کیا؟"

رعنا نے کہا" کچھ نہیں .... کسی کو کسی پر کوئی حق نہیں ہوتا۔لیکن ایک وقت آتا ہے....... نجانے کہاں سے آجاتا ہے وہ وقت

.......جب یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ کسی کا حق چھینا جا رہا ہے۔"

فراز نے کچھ کہنا چاہا لیکن دندناتی ہوئی ایکسپریس کے کھڑ کھڑاتے ڈبے ویٹنگ روم کے سامنے سے گزرے اور چشم زدن میں گاڑی کو چیخیں ماتی بریکیں چمٹنے لگیں۔ فراز ہڑ بڑا کر اٹھا اور کرسی کے ساتھ لگی ہوئی اپنی چھڑی اٹھالی۔ رعنا بھی اٹھی اور اس نے اپنا پرس کلائی پر ڈال کر پھو دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈال لئے۔ وہ دونوں ویٹنگ روم سے نکلے تو قلی فراز کا سامان اٹھائے برآمدے میں کھڑے تھے۔ انہوں نے صاحب کو باہر نکلتے دیکھا تو انجن کی جانب چل دیئے۔ فراز نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کھڑکی سے سر باہر نکال لیا.......اور پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی رعنا سے کہا" کبھی کراچی آیئے۔"

رعنا دکھ بھرے انداز میں مسکرائی اور اپنے سینڈل کو سگریٹ مسلنے کے طریق پر رگڑتے ہوئے بولی" اگر عطیہ ہوتی تو شاید..... لیکن میرا خیال ہے...... "پھر وہ چپ ہوگئی۔

فراز کھڑکی سے اور آگے جھک آیا اور بولا" لیکن آپ کا کیا خیال ہے؟ اگر عطیہ ہوتی تو پھر بھی نہ آتیں؟"

رعنا کا سر اور جھک آیا اور بولا" لیکن آپ کا کیا خیال ہے؟ اگر عطیہ ہوتی تو پھر بھی نہ آتیں؟"

رعنا کا سر اور جھک گیا۔ اس نے دیکھا فرش پر ایک مکوڑا دن بھر دانے دنکے کی ناکام تلاش کے بعد گھر واپس جا رہا تھا۔ فراز نے اپنی دونوں کہنیاں کھڑکی میں جما کر قدرے زور سے کہا۔" رعنی......."

لیکن نہ گھنٹی بجی نہ سیٹی کی آواز سنائی دی اور گاڑی کھڑانک سے اپنے پہیوں پر یوں آگے لپکی جیسے پیچھے کسی دیوانے انجن نے زور کی ٹکر دے ماری ہو۔

رعنا نے سر اٹھا کر دیکھا۔ فراز کا ڈبہ کئی گز آگے نکل چکا تھا۔ پھر اور ڈبے آئے، اور ڈبے گزرے اور سٹیشن یوں خالی ہوگی جیسے لڑائی کے بعد کچی بارکیں!

پل صراط اور پاسپورٹ

محمد صدیق میٹرک کرنے کے بعد جب پہلی مرتبہ لاہور آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لاہور میں سبھی لوگ ہر روز نہیں نہاتے، ایک دوسرے کے قریب سے گزرتے ہوئے "السلام علیکم" نہیں کہتے اور بائیں ہاتھ سے گلاس اٹھا کر پانی پی لیتے ہیں۔کوئی مہینہ بھر تک وہ ان کو اسی طرح دیکھتا رہا اور پھر اس کو فوڈ کے محکمے میں کلرکی مل گئی۔

جس روز صدیق کو نوکری ملی ہے،اس روز اس کی عمر ٹھیک چوبیس سال دو مہینے اور پندرہ دن کی تھی اور ہونوکری کے شوق میں صبح سویرے مسواک کئے اور نہائے بغیر دفتر پہنچ گیا تھا۔صدیق اس دفتر کے اندرونی اور بیرونی جغرافئے سے اچھی طرح واقف تھا اور محکمے کے تقریباً سبھی لوگوں کو جانتا تھا کہ اول روز سے اس کا سفارشی خط اسی محکمے کے لئے تھا۔آج تو خیر اس کا اس دفتر میں با قاعدہ پہلا دن تھا،لیکن وہ اس سے پہلے بھی یہاں کام کرتا رہا تھا۔کبھی ایک گھنٹہ ایک میز پر،کبھی Despatcher کے ساتھ،کبھی دفتری کے ساتھ اور کبھی چپراسی کی غیر حاضری میں صاحب کے دروازے پر!

جب وہ اپنی نوکری کے پہلے دن دفتر سے گھر واپس آرہا تھا تو بس میں بھیڑ کی وجہ سے اسے پائیدان پر کھڑے ہونا پڑا۔دو سٹاپوں بعد اسے اندر جگہ مل گئی۔ایک مانوس چہرنے نے اپنا بدن سکیڑ کر اسے بیٹھنے کی تھوڑی سی جگہ فراہم کر دی۔دونوں طرف سے بھنچنے کی وجہ سے اس نے پہلو والی جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر سامنے والی جیب میں ڈال لیا اور نچنت ہو کر بیٹھ گیا۔جس آدمی نے اس کو بیٹھنے کی تھوڑی سی جگہ فراہم کی تھی،اس کا نام منور تھا اور وہ سبزی منڈی میں غلام احمد آڑھتی کی دوکان کا روکیا تھا۔دونوں میں تھوڑی دیر رسمی سی باتیں ہوئیں اور منور اگلے سٹاپ پر اتر گیا۔

منور کی جگہ لال ڈاڑھی والا ایک بھاری بھرکم آدمی سو سوکرتا آکر بھیٹ گیا اور صدیق کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا" آپ کا اسم شریف؟"صدیق نے اپنا اسم شریف بتایا تو اس بھاری بھرکم آدمی نے خوش ہو کر کہا" میرے چھوٹے بھائی کا نام بھی محمد صدیق ہے،لیکن اس کا قد تم سے ڈیوڑھا ہے۔" پھر اس نے خوش ہر کر کہا" لوگ اسے لمبے قد کی وجہ سے میرا بڑا بھائی سمجھتے ہیں۔"صدیق نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور پانچ روپے والی جیب پر ہاتھ رکھ کر باہر دیکھنے لگا۔

جب بس قرطبہ چوک پر رکی اور صدیق اترنے کے لئے اٹھا تو اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا پانچ کا نوٹ ٹٹولا اور ساتھ ہی ایک دلدوز چیخ ماری۔ کسی نے بلیڈ پھر کر اس کی جیب تراش لی تھی اور صدیق کی انگلیاں جیب کے پیندے سے باہر جھانک رہی تھیں۔ اس نے ڈرائیور کی طرف منہ کر کے بلبلا کر کہا "بس روک لو جی، میں سب کی تلاشی لوں گا۔ کوئی سواری بس سے نیچے نہ اترے ______ میری جیب کٹ گئی ہے"۔

ڈرائیور نے آواز دے کر کہا "سب بھائی صاح اسی طرح بیٹھے رہیں اور اپنی جگہ سے ہلیں نہیں۔" پھر وہ کلیز کا نام لے کر پکارا "بوبے دروازہ بند کر دے، کوئی نیچے نہ اترے"۔

بھاری بھر کم آدمی نے جھک کر کٹی ہوئی جیب دیکھ کر کہا" کیا کچھ جاتا رہا ہے صدیق صاح؟" تو صدیق نے دھاڑ مار کر کہا" میرا ایمان چوری ہو گیا ہے۔ میں تو آپ کے ساتھ باتیں کرتا رہا اور کوئی میری ایمان بک پر ہاتھ صاف کر گیا"۔ اس نے ایک مرتبہ پھر کٹ ہوئی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ روپے کا نوٹ باہر نکال کر بولا" یہ پانچ کا نوٹ تو سی طرح کٹی ہوئی میں جیب میں پڑا ہے، لیکن میرا ایمان غائب ہو گیا ہے"۔

ایک لمبے سے لفنگے لڑکے نے کھڑے کھڑے اپنی جیب میں پھونک ماری اور سر ہلا کر کہا" اپنا ایمان تو موجود ہے بھائی صاحب اللہ کے فضل سے"۔

اس لفنگے لڑکے کی بات سن کر سب اپنی اپنی جیبیں ٹٹولنے لگے اور جب سن کو یقین ہو گیا کہ ان کا ایمان اپنی اپنی جگہ موجود ہے تو وہ سب مطمئن ہو کر صدیق سے ہمدردی کرنے لگے۔

صدیق کہہ رہا تھا کہ "میں آج صبح کپڑے بدل کر اور ضروری کاغذات کی فائل لے کر پہلے دن نوکری پر گیا ہوں، چلتے وقت میں نے احتیاط کے ساتھ اپنی ایمان بک اس جیب میں ڈالی ہے"۔

"بس یہی تو غلطی کی صدیق بھائی" لال ڈاڑھی والے بھاری بھر کم آدمی نے کہا" ایمان کبھی بھی باہر کی جیب میں نہیں رکھتے، ہمیشہ اندر کی جیب میں رکھتے ہیں ______ شلوکے کی جیب میں یا بنیان کے ساتھ سپیشل جیب بنوا کر، دل کے پاس"۔

"یہ تو آپ ٹھیک کہرتے ہیں بزرگو!" ایک ریٹائرڈ آدمی گردن گھما کر بولا" لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایمان کو باہر لانا ہی نہیں چاہئے، ہمیشہ اندر رکھنا چاہئے تالے چابی میں ______ باہر اس کا کیا کام!"

عورتوں کے خانے سے ایک مڈل کلاس تعلیم یافتہ بی بی اپنی چوڑیوں والی بانہہ کھجا کر بولی" ہم نے تو اپنے اپنے ایمان لاکر میں رکھے ہوئے ہیں۔ گھر ہی بینک ہے۔ جب ضرورت پڑتی ہے، جا کر لے آتے ہیں"۔

ڈرائیور نے بھی قدرے غصے سے جھلا کر کہا" او بھائی صاحب! ایسی قیمتی چیز کو کوئی جیبوں میں ڈال کر پھرا کرتے ہیں۔ ٹرنک صندوق میں رکھنے کی چیز، آپ لے کر بازار میں آ گئے"۔

" کبھی ضرورت پڑ جاتی ہے" صدیق نے شرمندگی سے کہا" تو پھر ہر بار گھر تو نہیں جایا جاتا ناں"۔

"ضرورت!" کالی عینگ والے ایک شخص نے سر جھکائے ہوئے کہا" کیا ضرورت پڑ جاتی ہے؟ کہاں ضرورت پڑ جاتی ہے؟ کیوں ضرورت پڑ جاتی ہے؟ ایمان کوئی مخول بازی ہے کہ اس کی قدم قدم پر ضرورت پڑنے لگے۔ یہ تو ایک پاکیزہ اور مطہر چیز ہے ______ ارفع اور اعلیٰ شے، لطیف و منزہ ملکیت۔ ______ اسے ناپاک جگہوں پر استعمال نہیں کیا جا سکتا بھائی صاحب!"

صدیق نے ڈرتے ڈرتے کہا" اپنے گاؤں میں تو ہم اسے ہر وقت ساتھ ہی رکھتے ہیں"۔

"اسی لئے تو آپ گاؤں والے پینڈو کہلاتے ہیں"۔ ایک صاحب چڑ کر بولے "اور اسی وجہ سے ہمارا ملک ترقی نہیں کر رہا کہ سارے کا سارا پینڈو سوچ بھر گیا ہے"۔

ڈرائیور نے آواز دے کر پوچھا کہ اگر سب کی تسلی ہو گئی ہو تو وہ بس آگے چلائے، لیکن کچھ لوگوں نے پہلے تھانے جانے کی اور چند ایک نے بس آگے بڑھانے کی رائے دی۔ اس پر محمد صدیق نے جھلا کر اونچی آواز میں کہا" میرا ایمار چوری ہو گیا ہے اور آپ لوگ بس آگے چلانے کی بات کر رہے ہیں۔ میں ایک مرتبہ سب کو جامہ تلاشی کے لئے تھانے لے کر جاؤں گا۔ اس کے بعد آپ جو چاہیں، کریں"

۔

ڈرائیور نے غصے میں آ کر بس تھانے کی طرف موڑی اور سب کو لے کر چوکی لٹن روڈ پر آ گیا۔

حوالدار صاحب نے دو سپاہیوں کی مدد سے بس کے اندر سب کی جامہ تلاشی لی لیکن کسی سے فریاد کنندہ کا ایمان دستیاب نہ ہوا۔ ساری بس میں کسی کے پاس اپنا ایمان بھی نہیں تھا سوائے ایک بابا ماشکی کے، جس کی ایمان بک ساری عبارت مع بابا ماشکی کے نام اور اس کی علدیت کے دھل چکی تھی۔ بس ایک مہر باقی رہ گئی تھی جو اپنی پوری آب و تاب سے قائم تھی اور جس کا ایک ایک لفظ صاف پڑھا جاتا تھا۔

بس رخصت کرنے کے بعد تھانیدار صاحب نے محمد صدیق کا تحریری بیان لے کر اس کی کٹی ہوئی جیب کا نشقہ بیان کے دائیں طرف اتارا اور سواریوں کی گواہیاں بائیں طرف ڈالیں۔ پھر انہوں نے محمد صدیق کو سامنے بٹھا کر کہا" برخوردار ہم تمہاری ایماب بک تلاش کرنے کی پوری کوشش کریں گے، لیکن اس بات کی گارنٹی نہیں دیتے کہ وہ مل بھی جائے گی یا نہیں۔"

محمد صدیق تھانیدار صاحب کی یہ بات سن کر بھونچکا سا رہ گیا۔ بولنے کے لئے الفاظ تلاش کر ہی رہا تھا کہ تھانیدار صاحب نے پھر کہا" دیکھو میاں صاح زاوے! اول تو تم کو ایمان اپنے گاؤں چھوڑ کر آنا چاہیئے تھا، اپنے کسی بڑے بزرگ کی تحویل میں دے کر اور اگر غلطی سے شہر لے ہی آئے تھے تو اسے ایسی محفوظ جگہ پر رکھنا چاہیئے تھا جہاں کسی کی نظر نہ پڑ سکے، لیکن تم تو سامنے کی جیب میں ڈال کر اس کی نمائش کرتے پھر رہے تھے"۔

"بالکل نہیں جناب!" صدیق نے تھانیدار صاحب کی تفصیح کرتے ہوئے کہا" میں نے اپنا ایمان اپنی جیب کے اندر کر کے رکھا اور اس پر اپنا رومال ٹھونسا ہوا تھا۔ نہ تو اس کے باہر نکل کر گرنے کا خطرہ تھا اور نہ ہی اس کی نمائش مقصود تھی۔ اور پھر میری جیب اوپر سے نہیں، نیچے سے کٹی ہے۔ پانچ روپے کا نوٹ محفوظ ہے اور ایمان نکل گیا ہے"۔

تھانیدار نے پوچھا" تمہاری ایمان بک اصل صورت میں تھی یا تم نے اس میں کوئی ترمیم کی تھی؟"

"میں نے خود اس کی جلد باندھی تھی جناب عالی!" صدیق نے کٹی ہوئی جیب پر ہاتھ پھیر کر کہا" جرمن مقوے پر سبز ابری چڑھا کر جلد تیار کی تھی اور اس پر ربڑ کا چھلا ڈال رکھا تھا کہ بک خواہی نخواہی کھلی نہ رہے..... اور گرمیوں میں تو جناب میں اسے پلاسٹک کے لفافے میں ڈال کر جیب میں رکھتا تھا کہ پسینے سے اور گرد و غبار سے خراب نہ ہو"۔

"ہمیں دو باتوں کی فکر ہوتی ہے"۔ تھانیدار صاحب نے بات کاٹ کر کہا، "ایک تو مظلوموں کا ہاتھ پکڑ کر ان کی دادرسی کرنا اور دوسرے لوگوں کے ایمان کی حفاظت کرنا۔ غلطی سے اگر کسی کا ایمان کھو جائے، یا آپ کی طرح سے کوئی جیب کتروا بیٹھے تو ہر حالت میں اس کو اس کا ایمان تلاش کر کے دینا اور اسے آئندہ کے لئے محفوظ رکھنے کے گر بتلانا ہمارا اولین فرض ہے۔ اصل میں یہ ایسی کتاب ہے کہ اگر ایک مرتبہ گم ہو جائے تو دوبارہ اشوع نہیں ہو سکتی!"

محمد صدیق نے دردمند اور زبوں حالی مسافر کی طرح تھکے ہوئے لہجے میں پوچھا" اب اس کے بغیر میں آسانی سے گھوم پھر سکتا ہوں کہ نہیں؟"

تھانیدار صاحب نے کہا" گھوم پھر تو سکتے ہو، لیکن آسانی کے ساتھ نہیں۔ کبھی بھی تمہاری پڑتال ہو سکتی ہے اور کوئی بھی کر سکتا ہے۔"

محمد صدیق پڑتال کا لفظ سن کر گھبرا گیا اور بے بس ہرنی کی طرح منہ اٹھا کے کھڑا ہو گیا۔ تھانیدار صاحب نے کہا" منشی سے کہہ کر ایک عارضی پرمٹ لے لو۔ اس سے تمہاری پوچھ گچھ نہیں ہو گی۔ ایمان کھو جانے کی صورت میں تھانے کی کلیئرنس ہر وقت ساتھ ہونی چاہیے پھر کوئی فکر کی بات نہیں"۔

تھانیدار صاحب نے اونچی آواز میں پکار کر کہا" منشی جی اسے ایک کلیئرنس جاری کر دیں، اپنا ایمان گنوا بیٹھا ہے۔ کسی نے جیب کاٹ لی ہے"۔ پھر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے منشی کے چھپر کی طرف اشارہ کیا اور صدیق سے کہا" جاؤ جا کر منشی سے راہداری بنوا لو لیکن اسے سنبھال کر رکھنا، اگر یہ بھی گم ہو گئی تو جان کے لالے پڑ جائیں گے"۔

صدیق، تھانیدار صاحبؑ کا شکریہ ادا کر کے چھپر کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ منشی جی جی روزنامچہ لکھ رہے تھے، اس لئے انہوں نے صدیق کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

رات کو سوتے وقت جب اس نے آیت الکرسی پڑھ کر اپنے سینے پر پھونک ماری تو اس کے منہ سے بے اختیار ایک بھبھ نکل گئی اور وہ زار و قطار رونے لگا۔ نوکری کا پہلا دن ـــــــ امنگوں بھری زندگی کی ابتدا ـــــــ گاؤں سے دور ------ بے یار و مددگار ـــــــ یکہ و تنہا اور اس پر یہ مصیبت کہ چوبیس برس پرانی ایمان بک دیکھتے دیکھتے بائیں جیب سے غائب ہو گئی۔ اسے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی جیب بس میں نہ کٹی ہوں بلکہ اس سے پہلے کٹ گئی ہو ـــــــ جب وہ بس سٹینڈ پر کھڑا تھا، یا دفتر سے نکل کر بس سٹینڈ کی طرف آ رہا تھا، یا راستے میں کھڑے ہو کر عید کارڈ دیکھنے لگا تھا...... یا پھر.......

محمد صدیق کو اچانک یوں لگا جیسے اس کی جیب دفتر میں ہی کٹ گئی ہو۔ سب لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے کام کر رہے ہوں۔ سائل

کھڑکیوں میں کھڑے ہوں۔ چپراسی اندر باہر آجا رہے ہوں اور اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اس کی جیب کٹ گئی ہو۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ کمرے کے اندر، اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے، اپنے کاغذوں پر جھکے جھکے، اپنی پنسل سے لکھتے لکھتے کسی کی جیب کٹ جائے!

اسے یاد آیا کہ درمیان میں وہ ایک مرتبہ اٹھ کر پیشاب کرنے بھی گیا تھا۔ غسل خانے میں داخل ہوکر جب اس نے قمیض کے دامن کو تھوڑی تلے دبا کر ازار بند کھولا تھا، تو اس کا ایمان جیب کے اندر موجود تھا اور اس نے تھوڑی کے نیچے ایمان بک کے دباؤ محسوس کیا تھا۔ اس کے بعد پتہ نہیں کب اس کی جیب کٹی اور کب کوئی اس پر ہاتھ صاف کر گیا۔

محمد صدیق کو اس پگڑ والے کی شکل صاف دکھائی دے رہی تھی، جس کی عینک کا ایک شیشہ تڑخا ہوا تھا اور چہرے پر بھلی سے مسکراہٹ تھی۔ اس کو ایک من چینی کا پرمٹ چاہیئے تھا کہ اس کے گھر میں مولود کی محفل ہونے والی تھی۔ عرضی کے ساتھ اس نے پانچ روپے کا نوٹ بھی لگایا ہوا تھا____ کسی پن سے یا کلپ سے یا سکاچ ٹیپ سے نہیں بس ایسے ہی لگایا ہوا تھا۔ اپنے ہاتھ کی بناوٹ اور انگوٹھے کی گھماوٹ سے عرضی کے ساتھ نوٹ لگایا ہوا تھا۔

اس نے دو مرتبہ عرضی کو غور سے پڑھا۔ چند ہندسوں اور تاریخوں کے اندراج کیئے۔ عرضی والے سے مولود شریف کی تاریخ پوچھ کر لال قلم سے عرضی پر درج کی اور اٹھ کر الماری سے پرمٹ بک لینے چلا گیا۔ الماری کی طرف جاتے جاتے اس نے پانچ کا نوٹ اسی جیب میں ڈالا جہاں سالہا سال سے اس کا ایمان پڑا تھا۔ نوٹ نیچے کرنے کے لئے اس نے باہر سے ایمان بک کی جلد پر دو تین ٹھوکے بھی مارے اور پھونک مار کر جیب کے اندر بھی دیکھا، لیکن اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا؟ اور کیوں ہوا؟ کہ اس کی جیب کا پینداکٹ گیا، ایمان نکل گیا اور پانچ کا نوٹ ویسے کا ویسا جیب کے اندر چمٹا رہ گیا۔

اسے اپنے معاشرے کی بے ایمانیوں، بدنیتوں، بے اخلاقیوں اور بدنمائیوں پر رونا آ رہا تھا۔ اس نے دردانگیز آواز میں "اللہ جی" کہہ کر خدا کو پکارا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے ابل پڑے۔ صدیق بلک بلک کر رو دیا، روتے روتے سسکیوں میں اترا اور سسکیاں بھرتے بھرتے گہری نیند سو گیا۔

چوبیس برس کی عمر میں محمد صدیق محکمہ فوڈ میں ملازم ہوا تھا اور چون برس کی عمر میں بوسٹن سے واپس وطن لوٹا۔ یہ سارا عرصہ اس نے دوبئی، قاہرہ، گلاسگو، نیویارک اور بوسٹن میں گزارا۔ نیویارک میں ایک فلنگ سٹیشن کے پاس اس کا چھوٹا سا کھوکھا تھا جس میں چاکلیٹ، کوکیز، چیونگ گم، فلمیں اور آڈیو کیسٹ ملتے تھے، لیکن بوسٹن میں اس کا ایک بہت بڑا اسٹور تھا جس میں دو ہندوستانی، ایک سری لنکن اور تین پاکستانی لڑکیاں کام کرتی تھیں۔ خود صدیق کی بیوی جو پہلے سردارنی تھی اور پھر امریکی نام اختیار کرنے کے بعد بھی سردارنی ہی تھی، کیش رجسٹر پر بیٹھتی تھی۔ صدیق کے دونوں لڑکے اور ایک لڑکی دل چاہتا تو سٹور پر آ کر ماں کا ہاتھ بٹا جاتے ورنہ اپنے نیگرو یاروں میں گھوم کر ہلا گلا کرتے یا پھر پیلی بلیوں کے پیچھے بھاگ کر انہیں ہراساں کرتے تھے۔ تینوں بچے بڑے طاقت ور، بے حد شریر اور بلا کے منہ زور تھے۔ مقامی پولیس کے بڑے افسر بھی ان کو جانتے تھے اور چھوٹے اہلکار بھی ان کی مجلسوں میں شریک رہتے تھے۔ مافیا چیف کبھی ان کے ملے گلے میں شریک تو نہیں ہوا تھا البتہ اپنی کار سے ہاتھ نکال کر ان کو وِیو ضرور کر کے جاتا تھا۔ چیف کے ساتھ ان کا ایک خصوصی فوٹو بھی تھا جو انہوں

نے سٹوڈیو میں پوز بنا کر اتروایا تھا۔

تیس برز بعد موسیو محمد صدیق "ٹائی کون" جب واپس وطن آیا تو سب سے پہلے سیدھا داتا صاحب سلام کرنے گیا۔ داتا دربار حاضری دینے سے پہلے اس نے جوتیاں اتار کر جب سنگ مرمر کے صحن پر پہلا قدم رکھا تو اسے فرش بے حد ٹھنڈا محسوس ہوا۔ دوسرے پیر سے بھنڈارے کے چند چاول اور چنے کا ایک دانہ چمٹ گیا۔ اس نے واپس ڈیوڑھی میں آ کر جراب سے اپنے پاؤں پونچھے اور جوتے پہن کر بازار میں آ گیا۔

تیس برس پہلے جب وہ نوکری کی تلاش میں یہاں آیا تاھ تو ہر روز داتا صاحؒ حاضری دے کر اپنی ملازمت کے لئے دعا مانگا کرتا تھا۔ اس وقت صدیق کے تلوؤں سے اگر بھنڈارے کے چاول چمٹ جاتے تھے تو وہ انہیں اتار کر منہ میں ڈال لیا کرتا تھا اور بغیر چبائے نگل جاتا تھا۔ اب اس کے تلوؤں کی چپچپاہٹ اس کے ذہن میں منتقل ہو گئی تھی اور وہ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا بھی اندر ہی اندر چپچار ہا تھا۔

انٹرکان کے کمرہ نمبر 513 میں سونے سے پہلے جب بیرے نے لانڈری سے اس کے کپڑے، کاؤنٹر سے ڈاک اور بک شاپ سے اس کے رنگین رسالے لا کر دیئے تو اس نے اپنے بٹوے سے دو ڈالر نکال کر زبیر خان کو دیتے ہوئے کہا "ان کو بھنوا بھی لیتے ہو کہ نہیں "؟

زبیر خان نے نوٹ پتلون کی ہپ پاکٹ میں ڈالتے ہوئے کہا "ڈالروں کو میں بھنواتا نہیں، جمع کرتا رہتا ہوں۔ میری بیٹی کی شادی قریب ہے اور اسد اللہ صاحب نے مجھے ڈیوٹی فری شاپ سے بہت سی چیزیں لے کر دینے کا وعدہ کیا ہے۔"۔

"اس کے جہیز کے لئے؟" صدیق نے پوچھا۔ زبیر خان نے سنجیدگی سے کہا "یس سر، اس کے جہیز کے لئے بھی اور سم تھنگ فار ہر برائڈ گرام ٹو۔ وہ اتنا اچھا لڑکا ہے کہ اس نے میری بیٹی کو نمبر ٹو کر دیا ہے اور خود نمبر ون ہو کر ہمارے گھرانے پر قبضہ کر لیا ہے۔ ہی از ویری سوئیٹ سر"۔

"وہ تو سوئیٹ ہے، ٹھیک ہے!" صدیق نے کا "اور ہماری دعا ہے کہ خدا اسے عمر بھر سوئیٹ ہی رکھے، لیکن کچھ اپنے لئے بھی تو چاہئے ـــــــ اپنے بڑھاپے کے لئے، اولڈ ایج کے لئے....."

"اپنے لئے تو سر ایمان چاہئے اور ایمان کی سلامتی چاہئے"۔ زبیر خان نے پورے یقین کے ساتھ کہا "جاتے ہوئے اور تو کسی چیز نے ساتھ جانا نہیں، بس ایک ایمان ہی ہو گا وہ بھی اگر ہوا تو! اسی ایمان نے بابے بڈھے کی انگلی پکڑ کر پل صراط سے گزارنا ہے، لیکن اگر ساتھ ہوا تو!"

اس کے بعد بھی زبیر خان کچھ بولتا رہا، لیکن صدیق کے کانوں کے دروازے اور کھڑکیاں اور ادراک کا بڑا پھاٹک ایک ساتھ بند ہو گئے۔ رات گئے تک صدیق بستر پر لیٹا سوچتا رہا کہ اسی شہر میں کسی نے جیب کاٹ کر اس کا ایمان چرا لیا تھا اور بھری بس میں عین دل کے اوپر والی جیب پر بلیڈ پھیر دیا تھا، لیکن ایمان کی بازیابی میں کسی نے اس کی مدد نہیں کی تھی۔ جب اسے لیٹے لیٹے یہ خیال آیا کہ پورے تیس سال وہ دیارِ غیر میں اپنے ایمان کے بغیر ہی زندگی بسر کرتا رہا ہے تو صدیق کو ایک جھن جھنی سی آئی اور اس کا سارا بدن پسینے میں ڈوب گیا۔

صبح سویرے اٹھ کر صدیق لٹن روڈ چوکی کی طرف گیا کہ جا کر پوچھ سکے کہ وہ جو تیس سال پہلے اس نے ایف آئی آر درج کرائی تھی، اس کے جواب میں اس کا کھویا ہوا ایمان ملا یا نہیں؟ لیکن تھانے جانے کے بجائے وہ قریب ہی ایک چھوٹی سے مسجد کے سامنے رک کر مسجد کی خوبصورتی کا نظارہ کرنے لگا۔

مولوی صاحب باہر دھوپ میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ کچھ تہہ شدہ اخبار بند پڑے تھے۔ چند ایک رسالے تھے اور ساتھ ایک کتاب تھی۔ صدیق، مولوی صاحب کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور ہاتھ بڑھا کر بولا "میرا نام محمد صدیق ہے اور میں امریکہ میں رہتا ہوں"۔ مولوصاحب تپک کر اپنی کرسی سے اٹھے، ہاتھ ملایا اور ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ صدیق اسی طرح کھڑا رہا اور تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا" آج سے تیس برس پہلے اسی جگہ پر، چوک قرطبہ سے ذرا پرے، کسی نے میری جیب کاٹ کر میرا ایکمان چرا لیا تھا اور اس وقت سے اب تک میں ویسے ہی زندگی گزار رہا ہوں...... خالی خالی، بہکی بہکی، اجڑی اجڑی۔ میرے اندر کا اور میرے ارد گرد کا خلا بڑھتا جا رہا ہے اور اب میں زیادہ ہی پریشان رہنے لگا ہوں"۔

مولوی صاحب نے تشفی آمیز لہجے میں پوچھا" آپ کے پاس شناختی کارڈ ہے؟"

"جی ہے!" صدیق نے وثوق کے ساتھ کہا۔

"پاسپورٹ ہے؟" مولوی صاحب نے کہا۔

"وہ بھی ہے!"

" گرین کارڈ ہے؟"

"وہ بھی ہے!"

"تو پھر اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے"۔ مولوی صاحب نے صدیق کے کندھے پر محبت بھرا دھپا مار کر کہا" ان تینوں چیزوں کی موجودگی میں ایمان کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہ جاتی، سب خیر ہے"۔

وکھو وکھو

میں اس کو پورے انتالیس سال گیارہ مہینے آٹھ دن اور پانچ گھنٹے کے بعد ملا تھا اور اس کی شکل وصورت بالکل ویوی تھی جیسی اس کی پچھلی سالگرہ کے روز تھی جب اس نے اٹھارہ موم بتیاں بجھا کر اپنا چہرہ سرخ اور ماتھا عرق آلود کرلیا تھا۔ میرا چھوٹا بھائی اس کی تین سوا تین سیر کی گت تھام کر کھڑا تھا جو موم بتی کو پھونک مارتے وقت اس کی پیٹھ اور کندھے سے پھسل کر میز کے کنارے سے ٹکراتی تھی اور اپنے بھار اور اپنی جھلار سے اس کی ٹھوڑی اوپر کو اٹھا دیتی تھی۔ ہم ہر موم بتی بجھنے پر تالیاں بجاتے تھے۔

میں اپنے پوتے کے ولیمے کے لئے دو قصائیوں سے گیارہ بکرے کٹوا رہا تھا اور نا اہلی کے اس کھنڈ پر بیٹھا تھا جو پچھلے دو سال سے لان کنارے پڑا تھا اور اب اس کے ساتھ دو چھولداریوں کے رسے بندھے تھے۔ بہت سارا گوشت بن چکا تھا اور ابھی بہت سا باقی تھا۔ میں قصائیوں سے محبت بھری گفتگو کرتے ہوئے انہیں ولایت کے قصے سنا رہا تھا۔ وہ محبت سے میری گفتگو سنتے ہوئے اچھی طرح سے سمجھ رہے تھے کہ میری نظر ان کے کام پر بھی اور ان کے ارادوں پر بھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے ناخوش اور بے راز ہنسی خوشی اپنا اپنا کام کر رہے تھے اور ایک ہی قطعہ زمین پر ایک ہی چھولداری کے اندر محبت بھرے انداز میں بیٹھے ایک دوسرے کو دل میں کوس رہے تھے۔

جب ریحانہ چھولداری میں داخل ہوئی تو **Beta blocker** اور انجائنا کی گولیاں پابندی سے جذب کرنے والا میرا دل پہلے تین چار مرتبہ زور سے دھڑکا، پھر بالکل ساکت ہوگیا۔ جب اس نے میرے بالکل سامنے آکر "ہیلو" کہا تو میرے گردے کے اندر کی ساری پتھریاں ایک دم کڑکڑائیں اور میں نے بلبلا کر اپنی کمر پر ہاتھ رکھ لیا۔ پھر وہ جس تیزی کے ساتھ اندر چھولداری میں آئی تئی، اسی تیزی کے ساتھ باہر نکل گئی۔

اس نے اپنی بھاری بھر کم گت کٹوا دی تھی اور اب اس کے کٹے ہوئے بال کانوں سے ذرا نیچے تھے۔ شلوار قمیص چھوڑ کر اس نے ساڑھی پہننا شروع کردی تھی اور اپنے بدن کو ڈائٹنگ کے زور پر بے حد سمارٹ بنا لیا تھا۔ بڑے قصائی نے گوشت بنانا چھوڑ دیا اور غور سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں محبت اور شفقت کی نمی تھی۔ اس کے چہرے پر آگہی کی روشنی اور زبان حال کر گرمائی تھی۔ بہت ممکن ہے اس نے بھی اپنی جوانی میں کسی خوب صورت اور نوجوان لڑکی سے علاقائی زبان میں محبت کی ہو اور وہ دونوں بڑے **Native** انداز میں ایک دوسرے سے چھپیاں بھی ڈالتے رہے ہوں اور پھر شاید شریکوں نے اس کی محبوبہ کو اونٹ سے نیچے گرا کر اس کے باپ کی نگا

ہوں کے سامنے ذبح کر دیا ہو اور بے چارے قصائی نے خوف زدہ ہو کر کسی بے محبوبہ سے شادی کر لی ہو۔ ہوسکتا ہے ____ سب کچھ ہوسکتا ہے---- ہو کیوں نہیں سکتا بھلا!

ریحانہ ٹینٹ سروس والوں کی نواڑ کی ایک کرسی گھسیٹتی ہوئی چھولداری میں داخل ہو رہی تھی اور اس کی ساڑھی کے پھول کے مقابلے میں زیادہ کاسنی اور زیادہ بڑے ہو گئے تھے۔ اس نے کرسی لا کر میرے سامنے رکھی اور کہنے لگی "ٹھنٹھ پر نہ بیٹھو، کرسی پر بیٹھو۔"

میں نے کہا "مہربانی! تم نے خواہ مخواہ اتنی زحمت کی۔ مجھے کھنڈوں پر بیٹھنے کی عادت ہوگئی ہے۔ اس کرسی پر تم بیٹھو"۔ وہ اسی طرح کھڑی رہی اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی "پتہ نہیں ہم کتنے سالوں بعد آج ملے ہیں۔ مجھے تو صدیاں ہی لگتی ہیں۔" میں نے کہا "صدیاں نہیں ریحانہ، ہم پورے انتالیس سال گیارہ مہینے آٹھ دن اور پانچ گھنٹے بعد ایک دوسرے سے ملے ہیں"۔ ریحانہ ہنسی تو اس کے گالوں کے دونوں ڈمپل بننے سے رہ گئے۔ کہنے لگی "تم نے ایسا پورا پورا حساب کیسے لگا لیا؟" میں نے جیب سے کیلکو لیٹر نکال کر کہا "اس پر حساب لگا کر صحیح جواب نکالا ہے۔ اور اگر اس میں تمہارے مائیوں بیٹھنے کے بعد کی اندھی اور اندھیاری یک منٹی ملاقات بھی شامل کر لی جائے تو پھر نو گھنٹے اور کم ہو جاتے ہیں"۔ ریحانہ نے بڑے قصائی کی طرف بے پروائی سے دیکھا اور پھر کہنے لگی "اس ساری مدت میں تم نے کیا کای؟ "

میں نے کہا" کرنا کیا تھا، بس عمر بڑھائی ہے۔ ایک مکان بنایا ہے۔ دو بچوں کی شادیاں کی ہیں۔ پنشن لی ہے۔ بلڈ پریشر بڑھایا ہے۔ وہ ہارٹ اٹیک لیے ہیں۔ تھوڑی سی ڈائیابیٹس کرائی ہے ____ ذرا سا موتیا اتروایا ہے، اگلے سال بہار میں آپریشن کراؤں گا ____ اور تو کوئی خاص کام نہیں کیا۔"

ریحانہ ہنس کر کہنے لگی" تم نے تو پھر بھی چھوٹی سی زندگی میں بڑے کام نپٹا لیے، ہم تو وہیں رہ گئے بے قوف کے بے قوف۔ کچھ ہوا ہی نہیں۔ زندگی آگے نکل گئی اور ہم سٹیشن پر ویسے ہی کھڑے رہ گئے۔ کچھ ہو ہی نہیں سکا۔"

قصائی نے کہا" اندر سے ٹب منگوائیں صاحب جی"۔

میں نے کہا " یہیں صف پر ڈھیر کرتے جاؤ، نائی خود آ کر بندوبست کر لیں گے "۔ اس نے بہت ہی مری سی اور ڈری سی آواز میں کہا" گوشت زیادہ ہے اور صف چھوٹ ہے۔ آگے آپ کی مرضی"۔ تو میں نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔

جب میں نے ریحانہ سے کہا کہ مجھے اجازت دو کہ میں پھر کھنڈ پر بیٹھ جاؤں اور اپنے آپ کو اجازت دو کہ وہ کرسی پر بیٹھ جائے تو اس نے بڑی سنجیدگی سے شکریہ کہہ کر کرسی پر بیٹھنا منظور کر لیا۔

جب ریحانہ لوگوں سے ہماری ملاقات ہوئی تو وہ نویں میں پڑھتی تھی اور میں سیکنڈ ائیر کا طالب علم تھا۔ جب وہ کالج میں داخل ہوئی تو میں بی اے کا سٹوڈنٹ تھا۔ جب وہ " چاٹی ریس" میں اول انعام لے کر گھر آئی تو میں اپنا پہلا مشاعرہ پڑھنے ٹاؤن ہال گیا ہوا تھا۔ جب اگلی صبح اس نے اپنا کپ مجھے دکھایا تو میں نے اسکے ماتھے سے لے کر اس کی ناک کی ٹپ تک اپنی انگلی سے سیدھی لکیر کھینچتے ہوئے کہا" یہ چاٹی ریس، یہ کھیل کھلنڈیاں، یہ جسمانی ورزشیں ____ یہ سب ہلکی چیزیں ہیں۔ ذہنی سربلندیوں کے مقابلے میں بے معنی اور لایعنی

مظاہرے ہیں ـــــــ یہ بے حقیقت باتیں ہیں، گھاٹے کے سودے ہیں ــــــ میں نے کل ٹاؤن ہال میں غزل پڑھی ہے اور پوچھ لو جا کر کسی سے......"

اس نے اپنا کپ میرے قدموں میں رکھ دیا اور شرمندگی سے سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔ کہنے لگی "بھیا نے گھر آ کر بتایا تھا کہ آپ نے تو مشاعرہ لوٹ لیا۔ بڑے سوز سے ترنم کیا"۔

میں نے کہا" بے وقوف لڑکی! وہ خالی ترنم اور خالی سوز ہی نہیں تھا ــــــ اس میں فکر بھی تھی اور دانش بھی، راہنمائی بھی اور نشان دہی بھی"۔ ریحانہ اپنی ذات میں خجالت سے پگھل سی گئی اور میری آغوش میں اس طرح سے آ گئی جیسے پجاری مٹھی بند ہو کر بھگوان کے آگے سیس نوا دیتا ہے ــــــــ

ریحانہ جس قدر خوب صورت تھی، اسی قدر سادہ لوح اور احمق بھی تھی۔ وہ ہنر مندی سے اور عقل مندی سے زندگی بسر کرنے کی اہل نہیں تھی۔ وہ زندگی کو اپنے اوپر سے ایسے گزرنے دے رہی تھی جیسے زندگی دانش سے یا علم سے یا عقل سے کوئی برتر اور فزوں تر چیز ہو اور اپنی مرضی سے گزرنے کے لئے بنی ہو! ریحانہ کے ساتھ میں، اس کی بات میں، اس کے انداز میں، اس کے بدن میں کوئی ہنر نہ تھا۔ دین سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی، دنیا کی اسے کوئی سمجھ نہیں تھی اور وہ بڑے یقین سے نہایت بے توفی کے ساتھ بے یقین اور بے اعتبار زندگی بسر کر رہی تھی۔

جب ہم نئے نئے ریحانہ لوگوں سے واقف ہوئے تو وہ نویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ کندھے پر وہ دو بھاری بھرکم گانٹھیں اٹھا کر جاپانی کپڑا بیچنے والا جب ان کی ڈیوڑھی میں اترا تو ریحانہ کی ڈیوٹی لگی کہ وہ تھان ڈیوڑھی سے لے کر اندر امی اور خالہ کو دکھائے اور ترتیب وار بھاؤ بتائے۔ تین چار چکر کاٹنے کے بعد جب امی نے رنگ دار ساٹن کی قیمت پچھوائی تو ریحانہ نے ڈیوڑھی میں آ کر پھیری والے سے کہا" بھائی آٹھ آنے گز قیمت زیادہ بتلانا، امی ضرور قیمت کم کریں گی۔ مجھے بار بار چکر لگانے پڑیں گے۔ تمہارا بھی نقصان ہوگا" پھیری والا ہنس پڑا اور اس نے خوش ہو کر یہ بات ہم سب کو سنائی۔ میں نے حق اور سچ کی خاطر یہ بات اس کی امی اور ابو کو بتائی اور ان سے درخواست کی کہ وہ ریحانہ کو صحیح، صاف اور حقیقت سے بھرپور زندگی بسر کرنے کے رموز سمجھائیں ورنہ اس کی ساری عمر مظلومیت اور بے چارگی میں گزرے گی اور اس سے ارتقائے انسانی کا قافلہ آگے نہیں چل سکے گا۔

اس روز ہم سب اپنی حویلی کے پچھواڑے چھوٹے باغ میں کھیل رہے تھے اور ہم کوئی چھوٹے بچے نہیں تھے۔ میں تیرہ غزلیں لکھ چکا تھا اور ریحانہ چاٹی ریس میں اول انعام حاصل کر چکی تھی۔ اچانک زور کی سیاہ آندھی اٹھی اور سارے میں رات کا سماں ہو گیا۔ آندھی کے ایڈوانس جھونکے پتوں کو بجانے اور حویلی کے دروازے کو ہولے ہولے کھڑکانے لگے۔ ہم سب خوف زدہ سے ہو گئے تو ہماری نوکرانی بیبو نے کہا کہ "اگر کوئی پہلوٹھی کی لڑکی اپنی پشت برہنہ کر کے اڈتی آندھی کو دکھا دے تو آندھی رک جاتی ہے اور اس کا رخ مڑ جاتا ہے"۔ ہم سب تو بیبو کی بات اچھی طرح سے سمجھ گئے لیکن ریحانہ الو کی طرح کھڑی ہمارا منہ تکتی رہی۔ اس نے دو تین مرتبہ بیبو سے وضاحت کے ساتھ پوچھا تو بیبو کے سارے بیان سے "ڈھوئی" کا لفظ نہ سمجھ سکی۔ جب میں نے بیبو کی بات کا ترجمہ کر کے اسے سمجھایا تو وہ شرما گئی اور گھبرا کر بو

لی" اس گروہ میں پہلوٹھی کی لڑکی تو صرف میں ہوں، لیکن میں یہ کام سب کے سامنے نہیں کروں گی"۔ میری چھوٹی بہن نے کہا" ہائے ریحانہ باجی خدا نہ کرے، سب کے سامنے کیوں! وہ سامنے بابے نورے کا کوٹھا ہے، اس پر چڑھ کر آندھی کو روک دیں۔ سب کے سر سے بلا ٹل جائے گی۔"

بابا نورا مالی بھی تھا، سائیس بھی۔ لنگر بھی پکا لیتا تھا اور گاؤں گاؤں گھوم کر خالص شہد اور گھی بھی جمع کر لیتا تھا۔ اس کے کوٹھے اور کبوتروں کا ڈربہ تھا اور اوپر ہی اس نے تنور لگایا ہوا تھا جس میں وہ کبھی کبھار سجی تیار کر کے ذیلدار کے مہمانوں کو کھلایا کرتا تھا۔

ریحانہ ازار بند ہاتھ میں پکڑے کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی اور ساتھ ساتھ کہے جا رہی تھی" ہائے اللہ! خدا کی قسم---- میں نے نہیں جانا---- اس طرح سے آندھیاں رکی ہیں کبھی------- میں نے واپس اتر آنا ہے آدھی سیڑھیوں سے"۔ اور ہم نیچے سے چلائے" نہ نہ۔ اللہ کے واسطے نیچے نہ اترنا------- بڑی زبردست کالی آندھی ہے--------- سخت نقصان کر کے جائے گی------- جاؤ شاباش -------- جاؤ"۔

میری چھوٹی بہن شرارت سے اونچی آواز میں کہہ رہی تھی" بس باجی آپ کو جانا ہے اور آنا ہے---- کوئی دیر تو نہیں لگانی زیادہ"۔

ریحانہ" نہیں نہیں _____ ناں ناں" کہتی سیڑھیاں چڑھتی جا رہی تھی اور ہم نیچے اچھل اچھل کر تالیاں بجا رہے تھے، جیسے عقل مند لوگ احمقوں کو الو بناتے وقت دل ہی دل میں اچھل کر تالیاں بجایا کرتے ہیں۔

اس وقت میں ٹاہلی کے پرانے کھنڈ پر بیٹھا قصائیوں سے گوشت بنوا رہا تھا اور ریحانہ میرے سامنے ٹینٹ والوں کی دو رنگی نواڑ والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کی ناک کے دائیں نتھنے پر اب بھی بھورے رنگ کا ستارے جیسا تل تھا جسے اب اصولاً مسہ بن جانا چاہئے تھا لیکن وہ نہیں بنا۔ دور سے اب بھی اس کی ناک میں براؤنش گولڈ کلر کا کوکہ نظر آ رہا تھا حالانکہ اس نے ناک بندھوائی ہی تھیں تھی۔

جب اسے مائیوں بیٹھے دوسرا دن تھا تو میں رات کے وقت اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس کے بدن سے ہلدی، تیل، چنبیلی، حنا اور نافے کی خوشبو آ رہی تھی۔ ماتھے اور مانگ میں سیب، چندن، کتھے اور بٹھور کی ملی جلی مہک تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو بڑی زور سے چوما اور پھر رک گئے۔ میں اس کے سامنے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا تھا اور اس نے میری دونوں کلائیاں بڑی مضبوطی سے تھام رکھی تھیں۔ اس کی امی اندھیرے میں دیا سلائی جلاتی اچانک نمودار ہوئیں اور مجھے اس طرح کھڑے دیکھ کر بولیں" اب کیا فائدہ _____ اب کیا حاصل!" میں گھبرا سا گیا، لیکن ریحانہ نے میری کلائیاں اس وقت بھی نہ چھوڑیں _____ پھر میں اس کی امی کو ماچس دکھاتے دکھاتے کوٹھڑی سے باہر آ گیا۔

رخصتی کے وقت دولہا کار کو خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ سیاہ رنگ کی آسٹن گاڑی تھی جس کے بونٹ پر انگریزی کا" اے" کھڑا تھا اور اس کے ساتھ اسی دھات کے پر بنے تھے جو" اے" کو اڑائے لے جاتے تھے۔ گاڑی کے پورچ سے نکلنے سے پہلے ریحانہ نے اپنی امی سے میرا نام لے کر کہا کہ وہ نظر نہیں آئے۔ اس کی امی نے اونچی اونچی آوازیں دے کر مجھے بلایا اور میں ڈرا ڈرا، سہما سہما گاڑی کی کھڑکی کے

پاس آ کر بزرگوں کی طرح کہنے لگا "اچھا بھئی ریحانہ خداحافظ اور اللہ کے حوالے ----- خوش رہنا------ اور اپنا خیال رکھنا------"

اس کے شوہر نے بیک ویو مرر گھما کر میرا چہرہ اس میں فوکس کیا اور پھر کہا "اب اجازت دیں۔ دیر ہو رہی ہے ______ بڑا لمبا سفر درپیش ہے"۔ اس کے ساتھ بیٹھے اس کے والد نے بھی یہی کہا کہ "لمبا سفر درپیش ہے، زنانہ ساتھ ہے۔ اب اجازت دیجئے"۔

ریحانہ نے اسی طرح سر جھکائے جھکائے آہستہ سے کہا "ایک تو لوگوں کو ہر وقت جلدی پڑ رہتی ہے۔ پتہ نہیں کس بات کی!" پھر وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی جیسے دلہنیں رویا کرتی تھیں ______

میں چھولداری کے اندر پرانے کھنڈ پر بیٹھا ہوا قصائیوں سے گوشت بنوا رہا تھا اور ریحانہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے اپنی، ریشمی ساڑھی کا پلو تیزی سے اپنی کمر کے ساتھ لپیٹا تو اس میں سے بہت سی فرانسیسی پرفیوموں کی خوشبو ایک ساتھ اٹھ کر لہر کی طرح پھیلی۔ چھوٹے قصائی نے سر اوپر اٹھایا اور پھر پٹھ کی گنڈیریاں کاٹنے میں مصروف ہو گیا۔

ریحانہ کی شادی ہوئی تو ایک فارن سروس کے نوجوان سے تھی لیکن وہ اپنی بے پناہ خداداد قابلیت سے چند سال کے اندر ہی ایمبیسڈر بن گیا۔ پھر ریحانہ کی خبر ضرور آتی رہی لیکن وہ خود نظر نہیں آئی۔ بڑے سال گزر گئے، بڑے زمانے بیتے اور بڑے ملک نکل گئے! پورے انتالیس سال گیارہ مہینے آٹھ دن اور پانچ گھنٹے کے وقفے بعد وہ میرے سامنے ٹینٹ والوں کی نواڑی کرسی پر بیٹھی تھی اور میرے دل کے اندر اس کی محبت ڈسٹل واٹر بننے والے بخارات کی طرح قطرہ قطرہ بن کر اتر رہی تھی۔ روح کی ہر نالی سے ٹھنڈے مقطر مصفا قطرے میرے دل پر جھپک جھپک کر اسے دھو رہے تھے اور قلب کے نیچے ہلکے جامنی رنگ کی ایک تلتلی سی جاری تھی۔ میں خوش تھا اور شکر کر رہا تھا کہ ہم دونوں کی شادی نہیں ہو سکی۔

میرے ساتھ رہ کر اس نے بھی ہنرمند، عقل مند اور میری طرح سے زمانہ شناس اور رمز آشنا ہو جانا تھا۔ ہم لکھنے پڑھنے والے ادیب اور شاعر لوگ جس طرح ہر بات کی تہہ کو ر وار پہنچ جاتے ہیں، اس نے بھیی یہ فن سیکھ لینا تھا۔ ہم کو بھی جس طرح ہر اعلان، ہر بیان اور ہر گفتگو کے پیچھے اس کے اصل محرکات کا علم ہو جاتا ہے اور اصل صورت حال سے واقفیت ہو جاتی ہے، اس کو بھی میرے ساتھ اور میرے ساتھیوں کے ساتھ رہ کر اس علم سے آشنائی ہو جانی تھی۔

اس نے بھی میری انسانیت سے تو محبت شروع کر دینی تھی لیکن لوگوں کو ایک ایک کر کے نکتہ چینی اور غیبت کی ٹکٹکی پر کس کر کوڑے برسانے تھے ______ لفظ "انسان" سے بے پناہ الفت کرنی تھی اور قریب سے گزرتے ہوئے سچ مچ کے بندے کا دل جلانا اور اس پر گند اچھالنا تھا ______ میرے ساتھ رہ کر اس نے جس حویلی کے لان میں بیٹھنا تھا، وہاں کالی سیاہ آندھی کو جھلا کر خود ہی ہر ایک کو ننگا کر دینا تھا ______ خدا کا کتنا بڑا کرم ہوا ______ کیسی مہربانی ہوئی ______

اگر ہم ساتھ ساتھ اور ایک ساتھ رہتے تو ہم کو گھر بیٹھے North Carolina ساؤتھ کوریا، ایسٹرن یورپ اور ویسٹ اور جینیا کی اندرونی خرابیوں کا علم ہوتا------ ہم پورٹو ریکسن کانگرس کے پس پردہ عوامل سے واقف ہوتے------ مٹسوبیشی کے آئندہ سال کے بجٹ سے آشنا ہوتے لیکن ہمیں ایک دوسرے کے یکم کے چاند کو الگ الگ دیکھنے سے آگاہی نہ ہو سکتی۔ اس نے------ اس ریحانہ نے جو

میرے سامنے بیٹھی ہے----- میری جراتوں سے بے پناہ فائدہ اٹھا کر میری طرح سے جری ہو جاتا تھا۔ میں نے حق گوئی اور بے باکی کا ساتھ نہیں چھوڑ تا تھا۔ کڑوی بات منہ پر کہتی تھی۔ منافقت کے خلاف جہاد کرتا تھا اور اس نے بھی میرے اس وتیرے کو اپنا کیش کرتا تھا۔ ڈائمنڈ اور سِس لیٹر خرید نے تھے، کارنر پلاٹ لینے تھے۔ غیر ملکی سفر اختیار کرنے تھے۔ پھر اس نے ویسی نہیں رہنا تھا جن کی گاڑیاں سٹیشن پر کھڑے چھوٹ جاتی ہیں۔ اس نے زندگی سے بھی آگے نکل جانا تھا، اتنا آگے کہ وہاں زندگی کی Gravity بھی ختم ہو جانی تھی۔ پھر اس کے وینٹی باکس میں نقب زنی کا سب سے کارگر اور مہلک اوزار انفارمیشن data Scaling اور Media Dossier ہر وقت موجود ہونا تھا اور اس نے "بنیادی انسانی حقوق" یا "پرامن بقائے باہمی" کے نام پر ہم سب کو چھیل کے، ادھیڑ کے، کاٹ کے، ہلا کے رکھ دینا تھا----- جیسے آب خورے میں جامن ڈال کر کھڑکاتے ہیں، ویسے کھڑکا دینا تھا۔

اگر میری ریحانہ سے شادی ہو جاتی تو اس کے ماتھے اور مانگ سے چندن، کتھے، سیب اور بٹھور کی خوشبو نہیں آنی تھی نہ ہی اس کی ناک کے دائیں نتھنے پر براؤنش گولڈ کلر کا یہ تل رہنا تھا، لونگ اور ستارے کے کٹاؤ والا ______ اس نے بڑھ کر سیاہ مہہ بن جانا تھا اور اس کے سفید نتھنے سے کالے بیٹل کی طرح چمٹ جانا تھا۔ اچھا ہی ہوا، بلکہ بہت ہی اچھا ہوا۔

اللہ کے کرم اور اس کی مہربانیوں کے انداز نرالے ہیں۔ وہ جس کو انا اور خود پسندی، خود غرضی اور خود فروشی اور خود رائی کے چکر سے بچانا چاہے، صاف بچا کر لے جاتا ہے۔ ایسے لوگ باغ ہستی میں پھول کی طرح کھلتے ہیں۔ دائیں بائیں جھولتے جھومتے ہر ایک کو "ہیلو ہیلو" کہتے کہتے ایک دن خوشبو کی طرح فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں------ بڑی شرافت اور خود فراموشی کے ساتھ، ہنسی خوشی، جھومتے جھامتے، گاتے بجاتے۔

میں اتنے سال کی Self-pity اور خواہ مخواہ کی خود ساختہ قربان گاہ سے باہر نکل کر پہلی مرتبہ ریحانہ کی محبت کے نشے میں چور ہو گیا تھا۔ وہ میرے سامنے بیٹھی تھی اور میں اس کی محبت کے افشردہ سے عقیدت کے چھوٹے چھوٹے تنکے اور سوکھی پتیوں کے دست بستہ بھورے چورے نکال کر اسے زندگی کے حضور پیش کر رہا تھا۔

پھر میرا دل چاہا کہ میں اس کے ساتھ ایک لمبی بات کروں، لمبی اور نہ ختم ہونے والی بات ______ اتنی لمبی کہ ختم ہو جانے کے بعد بھی اسی طرح جاری رہے۔ زیادہ نہیں تو کم از کم ولیمے کے شروع ہونے تک، ایک رات اور آدھا دن، ہم اسی طرح اس مقام پر بیٹھے رہیں اور باتیں کرتے رہیں ______ میں نے کہا "ریحانہ تمہاری منجھلی بیٹی کی بڑی دھوم ہے۔ وہ آج کل کہاں ہے؟"

ریحانہ نے قدرے لاتعلقی سے کہا "پہلے اس نے انگلستان سے ٹرائی پوس کیا تھا، پھر "برین ڈائز" یونیورسٹی میں چلی گئی۔ آج کل "برکلے" میں کچھ کر رہی ہے۔ مشکل مشکل سے کام ہیں۔ مجھے تو ان کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کچھ کر رہی ہے "۔

میں نے کہا "بھئی وہ تو ہمارے ملک کی ایک عظیم Mathematician بن کر ابھر رہی ہے اور تم اس سے اتنی بے خبر ہو"۔ اس پر وہ زور زور سے ہنسنے لگی، اتنی زور سے کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ہنستے ہنستے بولی "تم کو جو ماسٹر بھودیال حساب پڑھانے آیا کرتے تھے، وہ اپنی سائیکل کے اگلے پہئے پر پیر رکھ کر بریک لگایا کرتے تھے اور ہر مرتبہ بریک لگاتے وقت ان کی جوتی اتر جایا کرتی تھی

------" وہ پھر ہنسنے لگی تو میں بھی اس کے ساتھ اس کی ہنسی میں شریک ہو گیا۔ہم دونوں کو اپنے اپنے اینگل سے ماسٹر بھودیال سائیکل پر بیٹھنے مائنس کی عینک لگائے پاؤں سے پہیئے کو بریک لگاتے نظر آئے۔آگے سے چنن کمہار کے گدھے آ گئے۔ادھر ماسٹر بھودیال کے پاؤں سے جوتی نکلی،ادھر وہ سندر سنگھ کی بھوری بھینس پر گرے۔بھینس خوف زدہ ہو کر ایک دم اٹھی ______ میں اور ریحانہ چوبارے کی کھڑکی میں کھڑے اتنا ہنسے کہ ہنستے ہنستے ایک دوسرے سے چمٹ گئے اور ہم نے اپنی آنکھیں ایک دوسرے کے کندھوں سے پونچھ پونچھ کر خشک کیں ۔

ہم دونوں کو اس طرح ہنستے دیکھ کر قصائیوں نے گوشت بنانا چھوڑ دیا اور اپنے اپنے بغدے بوریوں پر رکھ کر ہمیں دیکھنے لگے۔

اتنے میں ریحانہ کے شوہر ہز ایکسیلنسی شہباز نصیر دونوں ہاتھوں سے جلدی جلدی تالی بجاتے فیلڈ میں داخل ہوئے اور اپنے کولھوں پر ہاتھ رکھ کر بولے " بھئی تم یہاں ہو ریحانہ اور میں سارے گھر میں تم کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر عاجز آ گیا ہوں۔چلو اٹھو۔جلدی کرو، ورنہ دوکانیں بند ہو جائیں گی "۔ریحانہ نے خوشامدانہ لہجے میں کہا " آپ خود نہیں چلے جاتے شہباز!"

" کمال ہے بھئی۔حد ہو گئی " شہباز نے طوطے کی طرح سر گھما کر کہا " کام آپ کا اور جاؤں میں! مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔چلئے اٹھئے جلدی کیجئے----- فورا"۔ریحانہ نے اٹھتے ہوئے کہا " ایک تو لوگوں کو ہر وقت جلدی پڑی رہتی ہے، پتہ نہیں کس بات کی "۔جونہی وہ دونوں فیلڈ سے آؤٹ ہوئے تو بڑے قصائی نے کہا " صاحب جی اب تو ٹب منگوا دیجئے۔بوٹی بوٹی الگ ہو گئی ہے ______ وکھو وکھ۔"

قصہ شاہ مراد اور ایک احمق چڑیا کا

اچھا خاصا رنگا رنگ جلوس تھا جس میں بھانت بھانت کے لوگ شامل تھے۔ باقاعدہ باجہ تو نہیں تھا البتہ الغوزے، بانسریاں، گالڑ اور دائیں بائیں دو بڑے ڈھول تھے جن میں سے ایک کی آواز تو خاصی دور تک جاتی تھی۔

اب گاؤں میں تو اتنا بڑا جلوس ہی ہو سکتا ہے کہ لڑکے بالے، مرد عورتیں، گدھے کتورے ملا کر ڈھائی تین سو جاندار اپنی پوری جی داری اور شدھ توجہ کے ساتھ لپکے چلے آتے تھے اور آپس میں گفتگو بھی نہیں کر رہے تھے۔ پھر بھی ماسٹر بعدالودود خوش نہیں تھا اور اس کا چہرہ پھیکے خربوزے کی طرح اندر سے شرمندہ ہو رہا تھا۔ اس نے چہرہ گھما کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ اس کا بیٹا تھا تو جلوس میں لیکن نہیں تھا!

ماسٹر عبدودود کی تین کنال، گیارہ مرلے اور چھ سرساہی زمین تھی جو شاملات سے گز بھر ہٹ کر کھجوروالی بستی کا ایک حصہ تھی۔ یہ زمین اس کے دادا کے زمانے سے اسی طرح چلی آ رہی تھی جس میں ماسٹر عبدالودود کے ابا کو ایک چھوٹا سا پکا گھر بنانا تھا۔ جب ابا سے گھر نہ بن سکا تو اس نے یہ زمین اپنے بیٹے ودود کے نام چھوڑ دی جس کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ اس پر تین مرلے کا گھر بنا کر باقی صحن پرندوں کے لیے چھوڑ دے اور ہو سکے تو ٹاہلی میں کجے اور آبخورے کا باندھ کر طوطوں اور شارکوں کے مسکن بنا دے۔ ماسٹر عبدالودود کے خانوادے کو گھر بنانے کا اتنا شوق تھا کہ تین پیڑھی سے یہ زمین اسی طرح خالی چلی آ رہی تھی اور اب ماسٹر عبدالودود نے اپنے بیٹے شاہ مراد کو کہہ دیا تھا کہ وہ بڑا ہو کر اور پڑھ لکھ کر اس موروثی زمین پر ایک گھر ضرور بنائے اور کسی کمرے میں پانی کی بڑ بوتل لڑکا کر اس میں منی پلانٹ بھی ضرور لگائے کیونکہ منی پلانٹ لگنے سے متوسط طبقے کا گھر بھی کلیان ٹھاٹھ کا گھر ہو جاتا ہے اور لوگ اپنے دل کی خوشی سے اس گھرانے کی عزت کرنے لگ جاتے ہیں۔

جب ماسٹر عبدالودود گاؤں کے پرائمری سکول سے ہیڈ مدرس کے طور پر ریٹائر ہوا تو اس نے اپنی کمیوٹ کی ہوئی پنشن سے خاندانی زمین کے گرداگرد گز بھر اونچی دیوار اٹھوا لی اور خود قلندروں کے ڈیرے پر جا کر نیم کا ڈالا پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ جس روز اس نے ڈیرے پر بھنگ کا پہلا پیالہ پیا عین اسی دن دوپہر کے وقت ماسٹر عبدالودود کی بیوی نے اپنے بیٹے شاہ مراد کو سکول لے جا کر کچی جماعت میں داخل کرایا۔

اور جس روز قلندر حاتم شاہ نے ماسٹر عبدالودود کو مراقبہ موت کرایا، ماسٹر ودود ڈیرا چھوڑ کر مسجد میں داخل ہو گیا اور مولوی صاحب کی غیر موجو

دگی میں جماعت بھی کرانے لگا۔

ماسٹر عبدالودود ازل سے ایک آزاد منش انسان تھا اور آزادی سے بڑی محبت کرتا تھا۔ دراصل آزادی کی الرجی اس کے خاندان میں گردش کرتی تھی اور اس کے ددھیال کے سارے بزرگ اسی آزادی کے ہاتھوں فوت ہوئے تھے۔ ان کو پرندوں سے اور ہواؤں سے اور گھٹاؤں سے بڑا پیار تھا اور وہ ہر وقت منہ اٹھائے انہی کا نظارہ کیا کرتے تھے۔ وہ زندگی اور موت دونوں مجبوریوں کے درمیان آزاد رہنے کی کوشش میں اپنا آپ ہلکان کر کے فوت ہوتے تھے اور خوش رہتے تھے کہ ان پڑھ اور جاہل ہونے کے باوصف انہوں نے اپنی ساری زندگی آزادی کے ساتھ گزاری اور آزاد رہنے کے باوجود کبھی بے باک نہیں ہوئے۔

ماسٹر صاحب کے ساتھ اچانک ایک ایسا حادثہ گزرا کہ انہوں نے باقاعدگی کے ساتھ مسجد جانا چھوڑ دیا اور کچہری جانا شروع کر دیا۔ چودھری غضنفر نے ماسٹر عبدالودود کی تین کنال، گیارہ مرلے چھ سرساری زمین مع ڈھائی کنال زمین شاملات دیہہ ہذا کے اپنے قبضے میں کر لی اور اس پر اپنے جانوروں کے لیے کچا طویلہ تعمیر کر لیا۔ چودھری صاحب کی مخالف پارٹی نورے بگے گجر نے ماسٹر عبدالودود سے چودھری غضنفر پر مقدمہ کروا دیا اور کورٹ فیس اور محنتانہ وکیل اپنے پلے سے ادا کر کے مقدمہ مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر دیا۔

ماسٹر عبدالودود ہفتہ میں ایک دن تو اپنے وکیل کے ساتھ کچہری میں گزارتے تھے اور ایک دن مختلف درگاہوں پر منت کے دھاگے باندھ کر اور یہ کہہ کر بتاتے تھے کہ اگر مقدمہ جیت گیا اور زمین مجھے واپس مل گئی تو آدھی زمین درگاہ کے نام وقف کر دوں گا ____ چودھری غضنفر کے آدمیوں نے ڈانگ سونا کھڑکا کے ماسٹر صاحب کو ڈرانے کی کوشش کی تو وہ اور مضبوط ہو گئے اور اپنے ایک پرانے شاگرد کی مدد سے جو اب نائب تحصیل دار ہو گیا تھا، پستول کا پکا لائسنس بنوا کر لے آئے۔ چودھری غضنفر نے اپنے آدمیوں کو خبردار کر دیا کہ ماسٹر ودو کے سامنے سے آئے تو کنی کاٹ جایا کرو۔ اس کے پاس بھرا ہوا پستول ہوتا ہے، کوئی حرج مرج ہو گیا تو میں ذمہ دار نہیں ہوگا۔

اور پھر ہوا یوں کہ ڈیڑھ برس کچی پکی تاریخیں بھگتنے کے بعد ماسٹر عبدالودود مقدمہ ہار گیا اور چودھری غضنفر نے ڈنکے پر چوٹ لگوا کر شام کو بھنگڑا نچوایا ____ ماسٹر عبدالودود اینڈ پارٹی نے دوسرا وکیل کر کے سیشن کورٹ میں اپیل کر دی اور نئے وکیل نے پہلی ہی پیشی پر چودھری غضنفر کے وکیل کے چھکے چھڑوا دیئے۔

جب دو سال گیارہ مہینے کیس سیشن میں پھنسا رہا تو ماسٹر عبدالودود زچ ہو گیا اور اس نے اخباروں میں ایڈیٹر کے نام خط لکھنے شروع کر دیئے۔ کورٹ کی غلامی، وکیلوں کی اردل اور ریڈروں کی چاکری نے ماسٹر صاحب کے گرد دیواریں چننا شروع کر دیں۔ پھر آئے دن کے سفر، ایڈیٹر کے نام مراسلے، کاغذات کی نقلیں، فوٹو سٹیٹ کی مجبوری، ٹکٹ چلبانے کی چاکری، کچہری میں کھڑے رہنے کی ذلت، بیٹھنے کی پابندی، رکشا والوں کی خوشامد، سپاہیوں کی سیٹیاں، ناقابل عبور چوڑی سڑکیں، روکنے والی سرخ بتیاں، پابندیاں ہی پابندیاں، رکاوٹیں ہی رکاوٹیں، مجبوریاں ہی مجبوریاں، بے اختیاریاں، بے بسیاں ____ ماسٹر ودو نے سامنے کچہری کے نلکے کو دیکھا جس کی ٹونٹی پر چڑیا آکر بیٹھی، پانی تین چار قطرے اندکھینچ کر پھر سے اڑی اور سامنے اوتھ کمشنر کے چھپر پر جا بیٹھی۔ وہاں سے اڑی تو منڈیر اور وہاں سے ابھری تو سیشن جج کے کمرے کی مٹی پر، حالانکہ اندر جج صاحب مقدمے کی سماعت کر رہے تھے اور دونوں وکیل "جی جناب عالی" "جی جناب عالی

" کی درت لے میں بندھے دست بستہ سے کھڑے تھے۔ چڑیا نے سوچا چلو کہیں اور چلتے ہیں تو وہ سیشن جج کی ممٹی سے اڑکر ایک پرانی ٹوٹی ہوئی اینٹ پر جاکر بیٹھی جو گندی نالی کے پاس پڑتھی۔ ماسٹر عبدالودود نے خوش ہوکر کہا" واہ بھئی چڑیا، واہ! مزا آیا ناں تیری آزاد پروازی کا "۔

ایک پیشی پر جب ماسٹر عبدالودود کے وکیل نے سیشن جج کو قائل کر لیا کہ اس کا موکل تین کنال، گیارہ مرلے اور چھ سرساہی کا بلا شرکت غیر مالک ہے اور وہ اس کے رکھنے، فروخت کرنے، ہبہ کرنے، تعمیر کرنے، گفٹ کرنے، دان کرنے، کھودنے، ٹیلہ یا تالاب بنانے کا پورا پورا حق رکھتا ہے اور کسی کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ میرے موکل کے ذاتی پیدائشی حق میں کسی قسم کا بھی دخل دے تو عدالت نے وکیل کے سارے دلائل جوں کے توں کلہم تسلیم کر لیے اور انگریزی سٹینو اور اردو منشی کو دونوں زبانوں میں لکھا دیئے۔ جب عدالت نے فیصلے کی اگلی اور آخری تاریخ دینے کے لیے ماسٹر عبدالودود سے پوچھا تو وہ ٹرانس میں چلا گیا اور سیشن جج کے عین اوپر ممٹی پر جا بیٹھا۔ نائب کورٹ نے اسے اپنی کرخت آواز سے جھنجھوڑا تو ماسٹر ودود نے ہکلا کر کہا" جناب میں اس زمین سے دست بردار ہوتا ہوں اور بھری عدالت میں حلفیہ بیان دیتا ہوں کہ میرا اس نام نہاد موروثی زمین سے کوئی تعلق نہیں۔ میں تحریری طور پر عدالت کی خدمت اقدس میں عرض کرتا ہوں کہ یہ زمین چودھری غضنفر صاحب کی ہے اور اگر اب تک ان کی نہیں تھی تو اب ہوئی، ہمیشہ کے لئے ہوئی اور ان کے خاندان کی جائیداد کا ایک جائز حصہ ٹھری۔ مبارک ہو!"

عدالت میں کوئی ساڑھے سات سیکنڈ تک سناٹا رہا کیونکہ اتنے معمولی انسان کے ایسی مختصر سی زمین چھوڑنے پر زیادہ سے زیادہ اس قدر سناٹا ہو سکتا ہے۔ پھر عدالت نے مسکرا کر ماسٹر صاحب کے وکیل کی طرف دیکھا اور وکیل مخالف سے کہا" آپ ماسٹر صاحؑ سے مل کر فیصلہ کر لیں"۔ وکیل مخالف "یس سر" کرتا ماسٹر عبدالودود کی طرف پکا اور ان کو جپھی ڈال کر اپنے چھپر تلے لے گیا۔

کل تین دستخطوں یعنی ایک پورے اور دو "انی شلوں" میں سارا معاملہ نمٹ گیا۔ چودھری غضنفر نے ہاتھ آگے بڑھا کر کہا" ماسٹر جی ہم انشاءاللہ تعالیٰ کبھی آپ کے کام آئیں گے"۔

ماسٹر ودود نے کہا" میں نے تو اپنے دل کی خوشی سے یہ سودا کیا ہے، اپنی آزادی کی خاطر ۔۔۔۔ آپ میرے کام کس طرح سے آئیں گے؟"

چودھری غضنفر نے کھسیانی مونچھوں کے نیچے سے شرمندہ سا جملہ باہر کو کھینچ کر کہا" او جی انسان انسان جو ہوا۔ آخر بھائی کے کام آتا ہی ہے ناں۔"

ماسٹر جی نے کہا" چودھری صاحب میں نے نہ تو یہ کام انسانیت کے لیے کیا ہے اور نہ ہی بھائی چارے کی نیت سے۔ میں نے تو اپنی آزادی کے لیے یہ سب کچھ کیا ہے۔ یہ تو میری آزادی کا اعلان ہے۔ یہ آپ پر یا کسی اور پر کوئی احسان نہیں ہے۔ میں آزاد زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں اور اپنی مرضی کے فیصلے کرنا چاہتا ہوں۔"

چودھری غضنفر کے وکیل نے چودھری صاحب کو آنکھ مار کر اگلا فقرہ بولنے سے روک دیا اور ماسٹر صاحب سے پوچھنے لگا" ماسٹر

صاحب اس مرتبہ آپ کی پنشن بھی بڑھی یا نہیں؟"

ماسٹر صاحب کی آنکھیں فخر سے چمک اٹھیں اور انہوں نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا" کیوں نہیں جناب، گیارہ سے تیرہ روپے تک بڑھی ہیں۔ سرکار نے اعلان کر دیا ہے اخباروں میں۔"

اس پیشی سے واپسی پر چودھری غضنفر کی مخالف جماعت نورے بگے گجر پارٹی نے ماسٹر عبدالودود کو گوؤں سے تین میل پہلے ہی اچک لیا اور اس کو پرانی تھیمہ والی ڈاٹ کے کوٹھے میں لے گئے۔ پہلے تو انہوں نے ماسٹر کو ہوروں اور مکوں سے دھنکا۔ پھر ڈھیلا چماٹا مار کے اس کو بڑے پتھر پر بٹھا کر پوچھنے لگے "اوئے کتے آمنشیا۔ ماں بھین بکیا۔ تیرے منہ میں ہاتھی کا برج نوٹ! اوئے تجھے کیا ضرورت پڑی تھی بھری عدالت میں بکواس کرنے کی۔" منشی عبدالودود نے حیران ہو کر اپنی کہنی کو دیکھا، پھر اسے اپنی ران پر شلوار سے رگڑ کر پونچھا اور کہنے لگا" بھا جی! میں نے زمین کو بھی آزاد کر دیا اور چودھری غضنفر کو بھی ______ بڑا بوجھ تھا ان دونوں کا میرے اوپر۔ اور پھر میں خود بھی آزاد ہو گیا۔"

"اوئے جھڈوا" بورییئے نے اس کے سر پر ٹھاپ مار کر کہا" وہ تیرا حق تھا----- پیدائشی، موروثی حق----- خاندانی حق----اس کو کیوں چھوڑ دیا؟"

ماسٹر ودود نے خوش ہو کر کہا" اور عدالت نے میرا موروثی حق تسلیم کر لیا تھا۔"

"اگلی پیشی پر فیصلہ ہو جانا تھا تیرے حق میں بل بتو رئیا۔ سٹینو نے تو ٹائپ بھی کر لیا تھا فیصلہ۔"

"اگلی پر کیوں" ماسٹر ودود نے چہک کر کہا" عدالت نے اسی تاریخ پر اقرار کر لیا تھا کہ یہ زمین میرا حق ہے اور جب تک یہ زمین باقی ہے، یہ میرا ہی حق ہے ______ میری ہی جائیداد ہے۔"

"پھیر" نورے بگے نے اس کے بازو پر ڈانگ مار کر کہا" پھر تجھے کیا موت پڑ گئی تھی اپنا حق چھوڑنے کی۔"

ڈانگ کی چوٹ سے زیادہ اس ذلت اور اہانت پر ماسٹر صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انہون نے دل کڑا کر کے کہا" میرا حق میرا اپنا ہے۔ میں اس کو جس طرح چاہوں استعمال کروں۔ جس کو چاہوں ٹرانسفر کروں۔ جس کو چاہوں دے دوں۔ جب چاہوں دے دوں۔ اس معاملے میں بھی آزاد ہوں۔ یہ میرا فیصلہ ہے اور کوئی مجھے نہیں کر سکتا۔"

بورییئے نے ماسٹر کے سر پر ایک اور ٹھاپ ماری۔

ماسٹر صاحب نے بلبلا کر کہا" اپنے حق کے معاملے میں پورا آزاد ہوں۔ میں چاہوں تو اپنا حق لوں۔ چاہوں تو چھوڑ دوں۔ کوئی مجھے مجبور نہیں کر سکتا۔ میں ایک آزاد انسان ہوں۔ میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔ میں صاحب اختیار ہوں۔ تم مجھے مجبور کرنے والے کون ہو!"

جب بورییئے نے اپنا کھچہ پھر ایک بار اوپر اٹھایا تو نورے بگے نے اسے روک کر بڑی محبت سے کہا" دیکھ ماسٹر تو سیانا آدمی ہے اور سکول بڑھا چکا ہے۔ حق ہمیشہ مانگنے کے لئے اور منوانے کے لئے ہوتا ہے، چھوڑنے کے لئے نہیں ہوتا۔" ماسٹر نے نفی میں سر ہلایا تو

بورے بگے نے پچکار کر کہا" تونے آج تک دنیا کے کسی شخص کو، کسی قوم کو، کسی ملک کو اپنا حق چھوڑتے ہوئے دیکھا ہے------اپنی مرضی ہے؟"

ماسٹر ودود نے کہا" میں دنیا کو نہیں جانتا اور نہ ہی مجھے ذلتوں کے مارے مجبور لوگوں کی زندگی پسند ہے۔ میں آزاد ہوں اور اپنے حق پر کسی اور کا قبضہ دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ میرا حق میرا ہے۔ میں اسے رکھوں، چھوڑ دوں، ہبہ کر دوں، گفٹ کر دوں، خیرات کر دوں--- کسی کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ نہ میں کسی کا حق مارتا ہوں نہ کسی اور کو اجازت دیتا ہوں کہ وہ آکر میرا حق مارے------ سارے کا سارا، آدھا پچادھا، توڑ توڑ کر یا ایک ہی بار۔ میرا حق میرا ہے، میں اسے جس طرح چاہوں استعمال کروں۔"

نورے بہت ہی طاقت ور انسان ہوں جو اپنے حق کو اپنی مرضی سے استعمال کر رہا ہوں، لوگوں کے کہنے یا ان کے مجبور کرنے کے مطابق نہیں۔" ماسٹر ودود نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا" میں اتنا آزاد ہوں کہ اپنا حق رکھنا چاہوں تو رکھ سکتا ہوں، چھوڑنا چاہوں تو چھوڑ سکتا ہوں۔ تم لوگ کتنے مجبور، کس قدر بے بس اور اپنے اپنے حقوق کے کیسے کیسے غلام ہو کہ اپنی مرضی سے کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ تم سے زیادہ تو تمہارے حق طاقت ور ہیں جنہوں نے تم کو غلام بنا رکھا ہے اور جو قدم قدم پر تمہاری گردنیں مروڑ کر تمہارا احرام مغز توڑ سکتے ہیں۔ تم وہ مردود مقہور لوگ ہو جنہیں حق کے پیر نے اپنے شکنجے میں جکڑ کر رسہ گیری پر لگا رکھا ہے۔ تم لوگ آزاد نہیں ہو ______ حق کے خرکار ہو، حق کے مٹی ڈھوئیے ہو۔ تم اپنے آپ کو بڑے چودھری سمجھتے ہو لیکن تم دولے شہ کی پہیاں ہو جن کو حق کے قلندر نے درگاہوں پر بھیک مانگنے کے لئے پال رکھا ہے۔" ماسٹر ودود نے ان کے چہروں کو غور سے دیکھا اور پھر کہا_____" خدا کی قسم میں نے تم سے زیادہ کمزور، دبیل اور ڈرپوک انسان اپنی ساری زندگی میں نہیں دیکھے۔ تمہارے حقوق تمہیں ہر وقت خواہش کی ٹکٹکی پر باندھ کر ضرب شلاق کرتے ہیں اور تم ان کے آگے چوں نہیں کرتے، سی نہیں کرتے۔ میں ایک آزاد انسان ہوں، ہوا کا جھونکا ہوں، بادل کا ٹکڑا ہوں۔ میں پھیل بھی سکتا ہوں، سکڑ بھی سکتا ہوں۔ چاہوں تو بھورا شیر بن جاؤں اور چاہوں تو شفق رنگ غزال بن جاؤں۔ جھپٹ بھی سکتا ہوں، خالی دے کر نکل بھی سکتا ہوں۔ میں بادل ہوں۔ چاہوں تو برسوں، نہ چاہوں تو ایسے ہی گزر جاؤں۔ میں آزاد ہوں۔ کوئی مجھے مجبور نہیں کر سکتا۔"

دلبر شاہ، ریٹائرڈ آرٹی فشل انسیمی نیٹر جواب تک خاموش بیٹھا تھا، آہستگی سے اٹھا اور ماسٹر عبدالودود کے پاس اس کے قدموں میں جا بیٹھا۔ اس نے چہرہ اوپر اٹھا کر کہا" ماسٹر جی آپ سمجھ دار آدمی ہیں اور ہم سے بہت زیادہ جانتے ہیں اور آپ کے سامنے بات کرنا لقمان حکیم سے بات کرنا ہے لیکن میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حقوق اللہ تعالیٰ نے بنائے ہی اس لئے ہیں کہ انہیں مضبوطی سے تھام کر رکھا جائے اور کسی کو ان کے نزدیک نہ آنے دیا جائے ______ اس قادر مطلق اور صانع عظیم نے حقوق اسی لئے وضع فرمائے ہیں کہ اپنی زندگی میں ان میں اضافہ کیا جائے اور کسی حق کے ساقط ہونے یا کمزور پڑنے سے پہلے ہی اس کی طلب کے لئے جدوجہد شروع کر دی جائے۔ آپ تو صاحب علم اور صاحب درس و تدریس ہیں اور ہم جاہلوں سے بہتر ہیں کہ رائٹس مانگنے کے لئے ہوتے ہیں، چھوڑنے کے لئے نہیں۔"

ماسٹر عبدالودود نے کہا" دلبر شاہ صاحب! مجھے! اچھی طرح سے معلوم ہے کہ بے شک رائٹس مانگنے کے لیے ہوتے ہیں اور ہر شخص

کو رائٹس مانگنے کا پورا پورا حق ہے لیکن اگر کوئی اپنا حق چھوڑنا چاہے تو اس کو اتنی آزادی تو ہونی چاہئے کہ وہ اسے چھوڑ سکے اور بلا جبر و اکراہ چھوڑ سکے۔ اس پر یہ پابندی تو نہیں ہونی چاہئے-----"

لیکن ماسٹر صاحب کا فقرہ پورا ہونے سے پہلے دلبر شاہ ریٹائرڈ آرٹی فشل انسیمی نیٹر اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے پرانے محکمے کی کارکردگی والی ایک بڑی سے گالی دے کر ماسٹر صاحب کا فقرہ کاٹ گیا۔

پھر انہوں نے ماسٹر عبدالودود کے سامنے اس کے جائز حقوق واپس دلانے اور اس کی حماقت کا ازالہ کرنے کے لیے ایک سٹامپ پیپر رکھا لیکن ماسٹر صاحب نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

اچھا خاصا رنگا رنگ جلوس تھا جس میں بھانت بھانت کے لوگ شامل تھے---- لڑکے بالے، مرد عورتیں، گدھے کتورے ملا کر ڈھائی تین سو جاندار ہوں گے پھر بھی ماسٹر عبدالودود خوش نہیں تھا----- اس نے اپنا کالک لگا ہوا چہرہ گھما کر اپنے بیٹے شاہ مراد کی طرف دیکھا جو تیسری جماعت میں پڑھتا تھا اور اس جلوس کے ساتھ ساتھ کنارے کنارے چل رہا تھا۔ شاہ مراد تھا تو جلوس میں لیکن نہیں تھا۔

ماسٹر عبدالودود اپنے بیٹے کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس میں اس کا اپنا کوئی قصور نہیں۔ یہ سب کچھ ایک احمق چڑیا کی بدولت ہوا جو پہلے تو اپنی مرضی سے نلکے کی ٹونٹی سے لٹک کر پانی کے منکے نگلتی رہی۔ پھر اوتھ کمشنر کے چھپر پر جا بیٹھی۔ وہاں سے اڑ کر عدالت کی ممٹی پر پہنچ گئی۔ اور پھر وہاں سے ڈائیو لگا کر گندی اینٹ پر بیٹھ کر موری کے کیڑوں کو دیکھنے لگی____ لیکن بگے نورے پارٹی کے لوگ منہ کے کالے والے ماسٹر ودود کو گدھے سے اترنے نہیں دیتے تھے اور چھوٹے شاہ مراد کو جلوس سے بھاگنے نہیں دیتے تھے کہ اس کو بھی عبرت ہو اور وہ بھی اپنے باپ کی طرح اپنی مرضی سے اپنا جائز اور پیدائشی حق چھوڑنے والا نہ بن جائے۔ گدھے پر بیٹھا ہوا ماسٹر عبدالودود اپنے بے بس اور مجبور بیٹے کو بار بار گردن گھما کر اس لئے نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اس کی گردن میں پرانے کھوسڑوں اور سوکھے لتڑوں کے کئی ہار تھے جن میں اس کی ٹھوڑی ڈوبی ہوئی تھی۔

کہتے ہیں جب تک جلوس چلتا رہا، شاہ مراد روتا ہی رہا۔ ماؤں کو اپنے بیٹوں سے پیار ہوتا ہے اور بیٹوں کو ہمیشہ اپنے ابے پیارے ہوتے ہیں۔ شاہ مراد آدھی رات کو سسکیاں بھرتا ہوا چپ چاپ گاؤں سے نکل گیا۔

ماسٹر عبدالودود نے سارے اردو اخباروں میں مع شاہ مراد کی تصویر کے اشتہار دیا لیکن اس کا کوئی اثر آثار نہ ملا______ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شاہ مراد کو خرکاروں نے پکڑ لیا ہے۔ چند ایک کو یقین ہے کہ وہ دولے شاہ کی پہیوں کے ساتھ درگاہوں پر بھیک مانگتا ہو گا۔ کئی پرانے کسان سمجھتے ہیں کہ وہ کسی بڑے جاگیردار کے ڈیرے پر ہیڈ رسہ گیر ہو گا_____ لیکن اب جبکہ اس واقعے کو اکتین سال گزر چکے ہیں، میں سوچتا ہوں کہ شاہ مراد خوش ہو گا یا اب بھی رو رہا ہو گا کہ اس کے باپ نے آزادی فکر کا اظہار عملی میں کیوں کیا اور اگر کیا تو اس طرح سے کیوں کیا!

مہمان عزیز

شفقت صاحب کو ہمارے گھر رہتے پچاس سال سے اوپر کا عرصہ گزر گیا ہے لیکن ہم نے آج تک ان سے اپنا گھر چھوڑنے کو نہیں کہا، نہ اشارتاً نہ کنایتاً۔ اندر سے ہم سب ان کی حرکتوں سے اور ان کی موجودگی سے نالاں ہیں لیکن ان کے منہ پر اس کا اظہار نہیں کر سکے۔ ہم میں سے کسی کی یہ جرات نہیں کہ ان سے اتنا پوچھ سکیں کہ ابھی وہ اور کب تک ہماری زندگیوں پر سوار رہیں گے! اول اول میری بیوی نے حوصلہ کر کے چند استفہامیہ فقرے ان کے سامنے بولے تھے مگر بعد میں وہ بھی صبر شکر کر کے ہم لوگوں کے ساتھ شامل ہو گئیں ____ اب وہ کہتی ہیں کہ شفقت صاحب ہمارے جزو زندگی نہیں رہے بلکہ جزو بدن ہو گئے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کو گھر سے نکالنا گویا اپنے کسی عضو رئیں کو خود کاٹ کر اپنے بدن سے علحیدہ کرنا ہوگا۔ اس لئے یہی مناسب ہے کہ وہ رہتے جائیں اور ہم سہتے جائیں۔

ہمارے گھر والوں کا خیال ہے کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد شفقت صاحب کو اس گھر سے نکالنے میں جان کا خطرہ بھی ہے اور ایمان کا بھی، ساتھ ساتھ معاشی اور معاشرتی الجھنوں کے بڑھ جانے کا اندیشہ بھی ہے۔ پھر اتنے لوگوں نے اتنے سال سے شفقت صاحؒ کو ہمارے گھر رہتے دیکھ لیا ہے کہ وہ انہیں ہمارے گھر کا ایک اہم فرد سمجھنے لگے ہیں۔ بہت سے لوگ تو یہ خیال کرتے ہیں کہ اصل میں یہ گھر ان کا گھر ہے اور ہم لوگ اس میں طفیلی مہمانوں کے طور پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

شفقت صاحب کو ہمارے گھر پر مسلط کرنے کا کام میرے اباجی نے کیا۔ انہی کا حکم تھا کہ شفقت کو اپنے گھر پر رکھو، اب بھی اور میرے بعد بھی۔ اس کے ساتھ وہی سلوک کرو جو تم اپنوں کے ساتھ روا رکھتے ہو، اپنوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ وہ سلوک جو تم اپنی ذات کے ساتھ کرتے ہو۔ جس طرح سے اپنی ذات کو نیست کر رکھتے ہو، اسی طرح سے شفقت کو سنبھال کے رکھو ____ ریشم کے کوئے میں، روئی کے پھوے میں!

اگلے زمانے کے بزرگ بعض اوقات ایسے بے ہودہ فیصلے کر جاتے تھے کہ بعد کو آنے والی نسلیں ساری عمر ان کا خمیازہ بھگتی رہتی تھیں اور فیصلوں کی ٹیڑھ سیدھی نہیں ہو پاتی تھی۔ میرے اباجی نے پتہ نہیں کس کمزور لمحے میں یہ جذباتی فیصلہ کر دیا کہ شفقت ہمشہ کے لئے ہمارے گھر میں رہے گا اور اس کی دیکھ ریکھ کی ساری ذمہ داری ہماری ہوگی اور میں نے بھی پتہ نہیں کیوں سر جھکا کر اباجی کے اس عاقبت نا

اندیش حکم کو مان لیا کہ اگر کہیں آج میرا بس چلے------ تو میں------- ایک مرتبہ---- لیکن میرا بس کیوں چلے اور کس طرح چلے اور کس پر چلے ----- کہ میں تو ایک معمولی حیثیت کا بندھا ہوا بندہ ہوں اور میرے سامنے کے سارے راستے مسدود ہو گئے میں اور وقت بہت زیادہ گزر گیا ہے!

شفقت میں خدانخواستہ کوئی ایسی خرابی نہیں جس کو چمٹی سے پکڑ کر خردبین کے نیچے رکھا جا سکے اور اس میں خوف ناک بیکٹیریا کی علامتیں ڈھونڈی جا سکیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بات صرف اتنی ہے--- اور وہ بھی سیدھی سی بات کہ اس کا مزاج اور اس کی شخصیت اور اس کی ساری نفسیات ہم سے مختلف ہے اور روزمرہ زندگی میں اس کی سوچ ہماری سوچ سے نہیں ملتی۔ اس کو بتایا جا سکتا ہے، سمجھایا جا سکتا ہے، ٹو کا جا سکتا ہے، روکا جا سکتا ہے لیکن اس کو اس کے ذاتی راستے سے ہٹا کر اپنی راہ پر نہیں لگایا جا سکتا۔

گرمیوں کی ایک سہ پہر شفقت صاحب برف توڑنے کا سوا لے کر باہر نکلے اور آدھے گھنٹے کے اندر اندر بتیس گاڑیوں کے ٹائر پنکچر کر کے واپس گھر آ کر سو گئے۔ شام کے وقت کھانے کے لئے اٹھے۔ صبح کا باسی اخبار دوبارہ پڑھا۔ اپنی پسند کی سیاسی پارٹی کو تین چار گندی گندی گالیاں دیں اور پھر سو گئے۔ میری بیوی نے سوئے کی تلاش میں جب گھر کا کونہ کونہ چھان مارا اور سوا شفقت صاح کی رائٹنگ ٹیبل پر پڑی ہوئی کتابوں کے اندر سے برآمد ہوا تو انہوں نے سارا راز طشت از بام کر دیا کہ میں تو اپنی چٹھی پوسٹ کرنے ڈاک خانے پیدل جاتا ہوں اور لوگوں کے پاس بڑی بڑی گاڑیاں ہیں۔ مجھے لوگوں کا بلامقصد گاڑیوں پر گھومتے پھرنا اچھا نہیں لگتا تھا اس لئے میں نے ان کے ٹائروں میں سوا بھونک دیا۔ دراصل شفقت صاحب یہ سوا ان کے دلوں میں بھونکنا چاہتے تھے مگر وہ اپنی گاڑیوں میں موجود نہیں تھے۔ صرف گاڑیاں سڑک کنارے کھڑی تھیں اور اپنی حفاظت کرنے کے ناقابل تھیں۔

کچھ لوگوں کو شفقت صاحب کی اس حرکت کا علم ہو گیا تو وہ شکایت لے کر میرے پاس آئے۔ گھر کے دروازے پر ایک بلوے کی سی صورت پیدا ہو گئی۔ میں نے لوگوں کو رام کرنے کی کوشش کی تو شفقت صاحب اندر سے باہر آ گئے اور سینہ تان کر بولے کہ ہاں میں نے کیا ہے یہ سب کچھ۔ کیا بھی سوچ سمجھ کر ہے۔ اب کر لو کیا کرنا ہے اور بگاڑ لو جو بگاڑنا ہے ______ اس پر جو میرے ساتھ گزری ہو گی اس کا اندازہ آپ عقلی طور پر تو لگا سکتے ہیں، مالی اور بدنی طور پر نہیں۔

میری بیوی کا رویہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔ وہ شفقت صاحب سے ناراض بھی رہتی ہے اور گھلی ملی بھی۔ چاہتی ہے کہ شفقت صاحب اس گھر سے چلے جائیں اور ہم کو آزاد چھوڑ دیں لیکن خواہش یہ بھی رکھتی ہے کہ شفقت صاحب کا سائبان ہمیشہ اس کے سر پر تنا رہے اور وہ ان کے سایہ عاطفت میں زندگی کو طویل تر کرتی جائے۔

شفقت صاحب نے میری اجازت کے بغیر ہمارے محکمے کے ایک ٹھیکیدار سے آٹھ ہزار روپے تحفتاً لے کر میری بیوی کے لئے ایک سیٹ بندے خرید لئے۔ شام کو گھر لا کر اپنے ہاتھ سے اس کے کانوں میں پہنائے اور دور کھڑے ہو کر کہا " بھئی میں نے آج تک رضیہ کے لئے کوئی تحفہ ہی نہیں خریدا اور ساری عمر یونہی بتا دی۔ آج ابتدا ہو گئی ہے، اس کے بعد یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔" رضیہ، جو آج تک ہر پہلی کی پہلی مجھ سے حاصل کر کے ہوئی ہے۔ محکمے کے لوگوں میں میری بابت یہ بات مشہور ہونے لگی ہے کہ میں نے بھی رشوت لینا شروع

کردی ہے اور بڑے طریقے کے ساتھ اس کا ڈول ڈال دیا ہے۔

چاروں طرف کی چہ میگوئیوں میں گھرنے کے باوصف میں شفقت صاحب کو کھڑے کھڑے گھر سے نہیں نکال سکا، صرف ان کے ساتھ بول چال بند کردی ہے۔ جب وہ اپنے کمرے سے برآمد ہوتے ہیں تو میں گھر سے باہر نکل جاتا ہوں۔

جب ماموں سراج پنجاب اسمبلی کی سیٹ کے لئے کھڑے ہوئے تو ہم نے ان کی کمپین کے لئے دن رات ایک کردیا۔ آخری مہینے میں میں نے اپنے دفتر سے ایک ماہ کی چھٹ لے لی۔ شفقت صاحب نے بھی اپنے محکمے سے ایک مہینے کی چھٹی کرلی اور میرے ساتھ مل کر دن رات ایک جیسا کام کیا۔ ہم دونوں نے پوری پوری رات جاگ کر ووٹروں کو گشتی مراسلے روانہ کئے۔ سراج ماموں کی تقریروں کے مسودے تیار کئے۔ ان کے لئے موقع ومحل تاڑ کے تقریر کارنر ڈھونڈے اور وہاں چھوداریاں نصب کروائیں۔ انتخابی لسٹوں میں ووٹروں کے نام اور نمبر ڈھونڈ کر ان کی پرچیاں بنائیں اور جب ووٹ ڈالنے کا دن آیا تو شفقت صاحب مخالف امیدوار کو ووٹ ڈال کر گھر آ گئے۔

شام کے وقت جب ووٹوں کی گنتی ہوئی اور ماموں سراج بری طرح سے ہار گئے تو پتہ چلا کہ شفقت صاحب نے نہ صرف اپنا ووٹ مخالف امیدوار کے حق میں دیا تھا بلکہ متعلقہ حلقے کی ایک پوری برادری ماموں سراج کے مخالف بھگتا دی تھی۔ رضیہ کو ان کے اس فعل پر جہاں سخت حیرانی ہوئی وہاں اسے ہنسی بھی آئی اور بار بار آئی۔ اس نے ہر مرتبہ کسی حیلے بہانے میری بات کاٹ کر شفقت صاحب کے اس حیران کن رویے کی بابت پوچھا تو میں بھنا کر الٹا رضیہ کو طعنے دینے شروع کر دیئے۔ میرا خیال تھا، اور میں سمجھتا ہوں کہ میرا خیال بالکل ٹھیک تھا، کہ رضیہ میرے مقابلے میں ان سے زیادہ قریب ہے اور وہ اپنے دل کی بات رضیہ کو بلا کم و کاست بتا دیتے ہیں۔

آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ شفقت صاحب ہمارے گھر میں رہتے ہیں، ہمارا دیا کھاتے ہیں، ہماری عطا کردہ آسائشوں سے فیض یاب ہوتے ہیں، ہمارے گھرانے کی نیک نامی سے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ انہوں نے ہم سے الگ ایک خفیہ بینک اکاؤنٹ بھی کھول رکھا ہے اور اس کے کاغذات وہ گھر کے پتہ پر نہیں منگواتے۔ جب ضرورت پڑتی ہے، بینک جا کر ٹیلر سے معلومات حاصل کرلیتے ہیں۔ مجھ پر ان کی اس خفیہ کاروائی کا بھید ان کے بینک منیجر کی معرفت کھلا اور ساتھ ہی یہ پتہ بھی چلا کہ حضرت کافی حد تک دل پھینک واقع ہوئے ہیں اور اپنی یہ خفیہ رقم ان محبوباؤں پر صرف کرتے ہیں جن کے نام بھی کسی کو معلوم نہیں۔

بینک منیجر نے مجھے ان کے لیجروں میں بار بار ابھرنے والی ارشاد نامی ایک خاتون کا پتہ دیا جن کے نام سب سے زیادہ چیک کاٹے گئے تھے۔ ان میں چھوٹی چھوٹی رقموں کے چیک بھی تھے اور بڑی مالیت کے پے ڈرافٹ بھی۔ کچھ ایسی Instructions بھی تھیں جن میں ایک خط کے ذریعے ارشاد کے اکاؤنٹ میں رقم منتقل کرنے کے احکام تھے۔

یہ ارشاد وہی لڑکی ہے جو تین سال تک اپنے خاوند کے ساتھ رہنے کے بعد اب اس سے الگ ہوگئی ہے۔ رضیہ کے ننھیالی خاندان میں اس کی رشتے کی کزن ہے اور بڑے خوبصورت جسم کی حامل ہے۔ رنگ تو ہلکا گندمی ہے لیکن آنکھوں میں بے حیائی اور چہرے پر معصوم بد معاشی کے اثرات بہت ہی بھلے دکھائی دیتے ہیں۔ سیدھی چلتی ہوئی بھی سائیڈ ویز کو ہلتی جاتی ہے ____ جان بوجھ کر نہیں، اس کے چلنے کا قدرتی انداز ہی ایسا ہے۔ وہ رضیہ سے چینی کھانوں کی ترکیبیں پوچھنے آتی ہے اور دیر تک شفقت صاحب سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ دونوں

کوسیاست میں ایک جیسی دلچسپی ہے، لیکن دونوں کی پسندیدہ پارٹیاں ایک دوسرے کی مخالف ہیں۔اس سے بحث گرم کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔جب شفقت صاحب اس کی پارٹی پر جھلاتے ہیں تو ساتھ ساتھ ہاتھ کا کفچہ ہلاتے ہوئے یہ بھی کہے جاتے ہیں کہ تو مجھے گرم کر رہی ہے ارشاد، گرم کر رہی ہے ___ میں تجھے اور تیری پارٹی کو جلا کے رکھ دوں گا۔وہ بھی ترکی جواب دیتی ہے کہ آپ بھی تو مجھے سلگا رہے ہیں، بھڑکا رہے ہیں، میں بھی آپ کو اور آپ کی پارٹی کو بھسم کر کے رکھ دوں گی۔اپنی پارٹی کے خلاف ایسا سخت جملہ سن کر شفقت صاحب اپنی جگہ سے اٹھتے ہیں اور اپنے گرم گرم ہاتھوں میں ارشاد کا گلا سہلاتے ہوئے کہتے ہیں "میں چاہوں تو تم کو ختم بھی کر سکتا ہوں اور مجھ پر کوئی مقدمہ بھی نہیں بن سکتا لیکن میں ایسے کروں گا نہیں۔"

ارشاد ان کی دونوں کلائیوں کو اپنی مٹھی میں پکڑ کر گلا نہ چھڑانے کی غرض سے منہ اٹھا کر کہتی ہے "میں اپنی پارٹی کے لئے ہر وقت شہید ہونے کو تیار ہوں اور ہر گھڑی مرنے کے لئے سینہ سپر ہوں"۔

"اوئے رہنے دو" شفقت صاحب سر جھٹک کر کہتے "میں نے دیکھا ہوا ہے سینہ! اس کے لئے حوصلہ کی ضرورت ہوتی ہے، سینہ سپر ہونے کے لئے ___ اور تمہاری پارٹی حوصلہ ہی مفقود ہے۔"

اور جب رضیہ گردن گھما کر یہ کہتی کہ "دیکھو ارشاد اس ڈش میں نمک پہلے نہیں ڈالنا، پھینٹا ہوا انڈا حل کرنے کے بعد ڈالنا ہے" تو شفقت صاحب ارشاد کی گردن چھوڑ کر واپس اپنی کرسی پر بیٹھ جاتے۔

رضیہ کا چہرہ اس بات کی غماضی تو کرتا ہے کہ شفقت صاحب میں دلچسپی لیتے ہیں اور ارشاد بھی ان کو اپنے آپ پر لہلوٹ کراتی ہے لیکن اس بات کا اس کو بالکل علم نہیں ہے کہ ارشاد کے اللے تللے کا باقاعدہ ایک کھاتہ کھلا ہے اور اس میں سے وہ اپنی خواہش کے مطابق رقمیں لیتی رہتی ہے۔

میری بڑی آپا کے پاس دولو ٹیلے میں چار ایکڑ کا جو رقبہ تھا، وہ شہر پھیلنے پر شہری آبادی میں آ گیا۔جو بھاؤ ایک ایکڑ کا تھا، وہ ایک کنال کا ہوا۔اس طرف کو آبادی کا زور بڑھا تو ایک مرلے کی وہی قیمت ہو گئی جو ایک کنال کی تھی۔شفقت صاحبؒ نے بڑی آپا کو شیشے میں اتار کر اور ان کی مدد کا وعدہ کر کے ان سے چار ایکڑ کا رقبہ پرانی قیمت پر خرید لیا اور رجسٹری اپنے نام کرا لی۔تیس ہزار روپے فی ایکڑ کے حساب سے ایک ساتھ ایک لاکھ بیس ہزار کی رقم پا کر بڑی آپا پھولی نہ سمائیں اور شکریہ ادا کرنے ہمارے گھر آ گئیں۔اس وقت نہ میں گھر پر تھا نہ شفقت صاحب، رضیہ کو انہوں نے بڑی دعائیں دیں اور شفقت صاحب کی بڑی تعریف کی کہ اس نے مجھ بیوہ کو اپنی سگی بہن سے بڑھ کر جانا اور میری پرانی کلر زدہ سسرال زمین کو ایسے مہنگے بھاؤ خرید لیا۔رضیہ نے کہا "آپا! آخر وہ اس گھر میں رہتے ہیں اور ہمارے ان پر اتنے احسان ہیں، اگر انہوں نے اتنی مہربانی کر دی تو کون سی بڑی بات کی۔ہم تم جانو اور شفقت میاں جانیں لیکن میں نے تو کچھ نہیں کیا اور اس بات کا شکریہ مجھ پر واجب ہے جو میں ادا کرنے آئی ہوں۔اور آتے ہوئے جو میں تمہارے لئے مٹھائی کا ڈبہ نہیں لا سکتی تو یہ ایک ہزار روپیہ یہاں تمہارے ڈائننگ ٹیبل پر رکھے جاتی ہوں۔تم اور تمہارا میاں اور شفقت سبھی مل کر منہ میٹھا کر لینا۔"

آپا یہ کہہ کر بجلی کی تیزی سے وہاں سے پلٹیں اور سیدھی دروازے سے نکل گئیں۔رضیہ ہزار روپے کے نوٹ پکڑے "نہیں آپا"

کہتی ان کے پیچھے بھاگی۔مالی کو آوازیں دیں کہ پھاٹک بھیڑ دے مگر آپا کھٹ سے موٹر میں بیٹھیں اور جھٹ سے پٹ بھیڑ لیا۔ڈرائیور آہٹ پاتے ہی "ژوں" کر کے گیٹ سے نکلا اور رضیہ پانچ پانچ سو کے دو نوٹ ہاتھ میں پکڑے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

رات کو جب رضیہ چہرے پر کریم مل کر بستر میں لیٹی تو اس نے بڑے آپا کی آمد کا سارا قصہ تفصیل سے سنانے کے بعد مجھ سے پوچھا کہ آپا کی چار ایکڑ زمین کی قیمت کیا ہو گی تو میں نے بے خیالی سے کہا کہ فی الحال تو اسی نوے لاکھ کی ہو گی لیکن دو مہینے بعد یہ قیمت بڑھ جائے گی اور اتنی بڑھ جائے گی کہ اب اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔یہ سن کر رضیہ نے ایک خوف ناک چیخ ماری اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔اور جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ آپا کی ساری زمین شفقت نے اپنے نام منتقل کروالی ہے تو اس میں بولنے کی سکت بھی باقی نہ رہی۔

اگلے چند روز رضیہ دبی دبی زبان میں اس بات کا اظہار ضرور کرتی رہی کہ شفقت صاحب کو ایسا کرنا نہیں چاہیے تھا اور بڑی آپا کو ان کی سادگی کی اتنی زیادہ سزا نہیں دینی چاہیے تھی لیکن پھر وہ آہستہ آہستہ اس حقیقت کے ساتھ مصالحت کر گئی کہ اس دنیا میں ایسے ہوتا ہی رہتا ہے، ہوتا ہی آیا ہے اور شاید ہوتا ہی رہے گا۔

جوں جوں عمر بڑھ رہی تھی، شفقت صاحب کے مزاج میں حرص، غصہ، خست، بداعمالی، منافقت اور اخلاقی کج روی میں اضافہ ہو رہا تھا۔وہ ہر وقت کچھ چھپائے چھپائے سے پھرتے تھے اور غرائے غرائے رہتے تھے۔ان کے اندر سے ہوس کے چھوٹے چھوٹے چشمے پھوٹنے لگے تھے اور ان کی شکل قرمزی رنگ کے باراں زدہ پینٹ کی طرح ہو گئی تھی اور ان کی رفتار میں ایک ٹیڑھ سی آ گئی تھی۔ایسی صورت میں اور اس عمر میں مرد کا جبڑا ڈھیلا ہو جاتا ہے اور اس سے جنس کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔شفقت صاحب گو ہر وقت منہ کے آگے رومال رکھتے تھے مگر تھوڑی دیر میں وہ رومال چپچی رال سے لتھڑ جاتا تھا۔

ایک روز ہم لوگ گھر پر نہیں تھے۔میں حسب معمول دفتر میں تھا، رضیہ شاہدہ کے یہاں مولود پر گئی ہوئی تھی۔خانساماں ذرا سا زیادہ وقت لگا کر شام کا کھانا بھی ابھی سے تیار کر رہا تھا کہ اسے شام کو اپنے گاؤں جانا تھا۔ماریا دونوں کمرے خانسامے کے ہوتے ہوئے صاف کر کے جا رہی تھی کیونکہ باقی کمرے رضیہ بند کر گئی تھی۔ایک غسل خانہ کھلا تھا اور ساتھ پورچ میں بھی جھاڑو دینا تھا۔دس بجے پانی کی مشین ٹھیک کرنے والا مستری آ کر نئی بوکی ڈال رہا تھا اور دوپہر کو چپاتی بنانے سے پہلے خانساماں کو دھوبی کے یہاں سے اپنا جوڑا لینے جانا تھا۔

میں نے دفتر بیٹھے بیٹھے سوچا کہ ہمارے تینوں کمرے بند ہونے کی وجہ سے ماریا انہیں ویسے ہی چھوڑ کر چلی جائے گی۔اگلے دن اس کا ناغہ تھا اور دو دو دن وہ ویسے ہی نہیں آتی۔کیوں نہ ہمت کروں اور امور خانہ داری میں تھوڑی سی دلچسپی لوں۔

جب میں گھر پہنچا تو خانساماں باورچی خانے میں مصروف تھا۔مستری مشین کو بوکی ڈال کر جا چکا تھا۔جو کمرے رضیہ بند کر گئی تھی، وہ کھلے تھے اور ماریا میری بیوی کے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی تھی۔اس کے پاس شفقت صاحب یوں کھڑے تھے کہ ان کی ران ماریا کے کندھے کو چھو رہی تھی۔دونوں آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر خوش ہو رہے تھے اور تھوڑی دیر بعد گردنیں ایک دوسرے کی طرف گھما کر اپنے اپنے عکس کی داد لے رہے تھے۔

ماریا نے کانوں میں رضیہ کے "لاپس" والے بندے پہنے ہوئے تھے اور چہرے پر بلش آن کا میک اپ کیا ہوا تھا۔شفقت

صاحب اپنے ہاتھ میں رضیہ کی لال سوہی لپ سٹک لئے ماریا کے بچ اپ پر مصر تھے اور ماریا گردن مروڑ مروڑ کر اور تھوڑی سینے میں گھسا گھسا کر لپ سٹک لگوانے سے انکار کر رہی تھی۔ شفقت صاحب اسے چمکار رہے تھے، مٹھار رہے تھے اور کندھا تھپک تھپک کر لپ سٹک لگوانے پر مائل کر رہے تھے۔

ماریا جب کسی صورت بھی نہ مانی تو شفقت صاحب نے زور سے اس کا جوڑا پکڑ کر اس کا منہ اوپر اٹھالیا اور اس کے چہرے پر زور سے پھونک مار کر اس کی آنکھیں بند کر دیں۔ ماریا آمادگی سے مسکرانے لگی اور ساتھ ہی جوڑے پر کھینچ پڑنے کی وجہ سے جھوٹ موٹ سی سی کرنے لگی۔

جس وقت شفقت صاحب ماریا کے ہونٹوں پر لپ سٹک کی دوہری تہہ اور دبیز کر رہے تھے عین اس وقت رضیہ کمرے میں داخل ہوئی اور ماریا کا اپنے ڈریسنگ ٹیبل سٹول پر بیٹھے دیکھ کر بھیں بھیں رونے لگی۔ ماریا سٹول سے اچھلی اور پاس پڑا ہوا جھاڑ و اٹھا کر قالین پر پھیرنے لگی۔ شفقت صاحب شرمندگی سے مسکراتے ہوئے لپ سٹک کا خول بند کرنے لگے اور رضیہ اسی طرح اپنا پرس جھلاتی ہوئی سسکیاں بھرتی گھر سے باہر نکل گئی۔

اپنے میکے پہنچ کر اس نے مجھے فون کیا کہ اگر شفقت صاحب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے گھر سے نکالتے ہو تو میں واپس آتی ہوں ورنہ تم بستے بھلے اور ہم پردیس بھلے!

میں سے ہر روز فون کرتا ہوں اور واسطے دیتا ہوں لیکن وہ اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہے۔ میں نے اس کو لاکھ سمجھایا ہے کہ اس میں میرا اپنا کوئی قصور نہیں، سب میرے اباجی کا کیا دھرا ہے جو اس منحوس کو میرے گلے کا ہار بنا گئے ہیں لیکن وہ میری ایک نہیں سنتی اور میری کوئی دلیل نہیں مانتی ـــــــ لیکن میں بھی کیا کروں اور کس دیوار سے ٹکر ماروں کہ شفقت میرا اپنا تخلص ہے!

بیک گراؤنڈ

عابد کی پوتی بشریٰ کی مہندی تھی اور لڑکے والے مہندی لے کر آ رہے تھے۔اندر شیشوں والے ہال میں ہماری طرف کے لڑکے اور لڑکیاں ہائی فائی میوزک کے ساتھ ہلا گلا کر رہے تھے اور ناچ کی نئی نئی قسموں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی بھنسیریاں ڈالتے ہوئے بڑے بڑے قہ ٹو کے مار رہے تھے۔کچھ لڑکے لڑکیاں زمین پر اور کچھ صوفوں پر پھسکڑا مار کر ایک دوسرے کو خفیہ قسم کے لطیفے سنا رہے تھے اور دوسروں کے منہ سے بوتلیں کھینچ کھینچ کر لمبے لمبے گھونٹ بھر رہے تھے۔سارا ہال دھوئیں سے بھرا ہوا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد یہ خبریں آ رہی تھیں کہ لڑکے والے تیار ہو رہے ہیں۔ان کے ڈھولی پگڑیاں باندھ رہے ہیں۔لڑکیاں لڈی کی آخری ریہرسل کر رہی ہیں۔مہندی سج گئی ہے۔موٹریں قطاروں میں کھڑی ہو گئی ہیں۔صرف لڑکے کے والد ای سی جی کرانے کلینک گئے ہوئے ہیں،جونہی واپس آئے تو قافلہ روانہ ہو جائے گا۔

میں اسی شور وغل سے گھبرا کر،اوپر چڑھتی گول سیڑھیوں والے زاویے میں جا کر بیٹھ گیا جہاں پرانی وضع کے کچھ لوگ سیاست کی جدید صورت پر روشنی ڈال رہے تھے۔مجھے اپنے علاقے میں تشریف لاتے دیکھ کر کچھ مرد اپنی نشستوں سے اٹھے اور ہاتھ ہلا کر اپنے قریب آنے کی دعوت دی۔میں سر درد اور اختلاج قلب کا بہانہ کر کے ان سے دور بیٹھ گیا۔دراصل یہ محض بہانہ ہی نہیں تھا،کچھ حقیقت بھی تھی کیونکہ ابھی میں نے اپنی سبز ڈبیہ سے ایک گولی نکال کر زبان کے نیچے رکھی تھی۔عابد کی بڑی بیٹی نے ادھر سے گزرتے ہوئے ایک چھوٹا تکیہ اٹھا کر میری گردن کے نیچے ڈالا اور پائی کھینچ کر میرے پاؤں کے قریب کر دی۔میں جب آنکھیں بند کرتا ہوں تو میرے دل کی دھڑکن کچھ زیادہ ہی اونچی ہو جاتی ہے اس لئے ایسے موقع پر میں اپنے آنکھیں کھلی رکھتا ہوں لیکن نگاہیں روک لیتا ہوں۔نظر تو سب کچھ آتا ہے لیکن دکھائی کچھ نہیں دیتا۔

تھوڑی دیر بعد ایک نوجوان سی،خوبصورت،بھری بھری اور چمک دار لڑکی آ کر میرے پاس کھڑی ہو گئی۔اس کے ہاتھ میں بھورے بھالو کی کھال کا پرس تھا اور وہ ذرا گھبرائی ہوئی سی تی۔ہائی فائی میوزک کے شور میں اس نے اپنی آواز اونچی کر کے اور سر نیچا کر کے مجھ سے پوچھا"انکل میں آپ کے پاس بیٹھ جاؤں؟"

سارا صوفہ خالی پڑا تھا لیکن میں نے ذرا سا سرک کر اسے بیٹھنے کی اجازت دی تو میرے ساتھ بیٹھ کر بولی "میرا نام سوزی ہے اور میں یہاں مجرا کرنے کے لئے آئی ہوں۔"

ہمارے زمانے میں ذرا بڑی عمر کی عورتیں مجرا کرنے کے لئے آیا کرتی تھیں۔ان کے ساتھ ایک دو نوچیاں بھی ہوتیں لیکن وہ سازندوں کے ساتھ بیٹھ کر مجرا دیکھا کرتیں، خود نہیں ناچتی تھیں۔ میں نے کہا "تم اکیلی آئی ہو؟" تو اس نے سر ہلا کر کہا "نہیں جی، سازندے بھی ساتھ ہیں اور وہ باہر دیگوں والے کے پاس بیٹھے ہیں۔"

میں نے کہا "تمہارا نام بڑا ماڈرن ہے سوزی، یہ تم نے خود رکھا ہے؟"

کہنے لگی "رکھا تو ممی نے تھا لیکن یہ نام مجھے پسند نہیں۔ میرا اصل نام درشہوار ہے اور میں الماس کی بیٹی ہوں۔"

میں نے کہا "تم نگینہ کی نواسی ہو؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بے تکلفی سے بولی "انکل ہمارے گھر آپ کی ایک تصویر ہے، نانی کے ساتھ!"

میں نے کہا " اچھا! وہ ریڈیو کے زمانے کی ہوگی۔"

کہنے لگی "ہے تو ریڈیو کے زمانے کی لیکن ہے ہمارے کوٹھے کی۔اس میں آپ اور نانی اور بھائی چھیلا ایک ساتھ کھڑے ہیں اور پنگوڑے کے اندر میں ہوں لیکن میں نظر نہیں آتی، صرف پنگوڑا ہی نظر آتا ہے۔"

میں نے کہا " بھئی پھر تو تم اپنی ہو۔تمہارے گھر والوں کے ساتھ تو ہمارے پرانے تعلقات تھے۔میری بیوی بھی ایک مرتبہ میرے ساتھ تمہارے گھر آئی تھی۔"

" مجھے پتہ ہے انکل ! "اس نے وثوق سے کہا اور پھر ذرا سا رک کر بولی " آپا جی نہیں آئیں؟"

میں نے کہا "ہو ایسی محفلوں میں اب کم ہی جاتی ہیں۔ڈاکٹروں نے منع کر رکھا ہے۔نیند میں کمی ہو جائے تو اس کا بلڈ کاؤنٹ نیچے گر جاتا ہے۔"

سوزی نے کہا "جب ہم نے اخبار میں ان کی بیماری کی خبر پڑھی تھی تو ممی نے داتا صاحب جا کر ایک دیگ دی تھی اور بی بیاں صاحب جا کر دھاگا باندھا تھا۔"

میں نے کہا "یہ سب تم جیسے لوگوں کی دعاؤں کا اثر ہے کہ تمہاری آپا زندہ بچ گئیں ورنہ ڈاکٹروں نے تو جواب دے دیا تھا۔" پھر میں نے بات پلٹانے کی غرض سے پوچھا "سوزی کچھ پڑھائی وڑھائی بھی کی کہ اپنی ممی کی طرح مدرسہ چھوڑ دیا؟"

" کی پڑھائی انکل اور بڑی اچھی کی۔ایف سی تک پہنچی لیکن پھر کالج میں کسی نے شکایت کر دی کہ یہ گانے بجانے والوں کی لڑکی ہے، اسے یہاں سے نکالا جائے ورنہ ہماری لڑکیوں کا اخلاق خراب ہو جائے گا۔کالج والوں نے مجھے نکال دیا اور میں گھر آ گئی حالانکہ میرے امتحان میں ایک مہینہ اور اکیس دن رہ گئے تھے۔"

"اور اب کہاں ہوتی ہو؟"

" گھر پر انکل"

" بھئی گھر پر تو انسان ہوتا ہی ہے ____ اور اسے گھر پر ہی رہنا چاہئے ------ لیکن میرا مطلب ہے کہ ----- گھر کہاں ہے؟ "

" گھر وہیں ہے انکل جہاں آپ آئے تھے۔"

" تم ابھی تک شاہی محلے میں ہی ہو؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

" تو اور میں کہاں جا سکتی ہوں!" اس نے ہنس کر کہا " میری بیک گراؤنڈ ہی وہاں کی ہے۔"

" وہ تو ٹھیک ہے" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا " لیکن اب تو وہاں کی بہت سی بی بیاں دوسرے علاقوں میں چلی گئیں۔"

" ہاں جی چلی تو گئیں لیکن ممی کے بعد میرا کوئی اور آسرا نہیں تھا اس لئے مجھے مجبوراً وہیں ٹھرنا پڑا ____ یہ بات تو اگر ممی اپنے زمانے میں کر جاتیں پھر آسان تھا، اب مشکل ہے۔"

میں نے کہا " مشکل کیوں ہے، وہ گھر بیچ کر کوئی کوٹھی ادھر لے لو۔"

کہنے لگی " اس گھر کی قیمت اتنی نہیں پڑے گی کہ اس سے ایک کوٹھی خریدی جا سکے گزارے موافق۔"

میں نے کہا " حد کرتی ہو سوزی، تمہارے پیشے میں تو اتنی کمائی ہے کہ تم دس کوٹھیاں خرید سکتی ہو۔"

میری یہ بات سن کر اس کا چہرہ اتر سا گیا اور وہ خاموش ہو گئی۔ پھر سر نیچے کر کے کہنے لگی " اب کوٹھوں پر ویسی کمائی نہیں رہی انکل جیسی پہلے ہوتی تھی"

" کیوں اب کیا ہوا؟"

" اب ٹائم چینج ہو گیا ہے انکل!" سوزی نے سر اٹھا کر کہا " اب گھروں میں ہی اتنی رونقیں ہو گئی ہیں کہ لوگوں کو ہمارے پاس آنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اگلے زمانے میں جس چیز کی تلاش میں لوگ ہمارے پاس آیا کرتے تھے، وہ اب گھروں میں ہی مل جاتی ہے، کسی کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ خواہ مخواہ وقت ضائع کرتا پھرے۔"

سوزی کی یہ بات سن کر میں خاموش ہو گیا اور بڑی دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اتنے میں ارمی اور ڈوڈو وہاں سے گزریں تو میرے سامنے رک کر بولیں " بھئی یہ کیا بوریت ہے انکل، ادھر ہمارے پاس چل کر بیٹھیں۔ آصف اور صائمہ میں جوکس کا مقابلہ ہو رہا ہے اور آصف سک جوکس سن رہا ہے۔ ذرا اس کی حالت تو دیکھیں آ کر۔"

میں نے کہا " تم چلو بیٹا، میں ابھی آتا ہوں۔"

پھر انہوں نے بڑی شفقت کے ساتھ سوزی سے کہا " بھئی آپ بھی ادھر آئیں ناں اور آ کر صائمہ کا مقابلہ کریں۔"

سوزی نے ہولے سے " اچھا جی" کہا اور اسی طرح بیٹھی رہی۔ لڑکیوں کے چلے جانے کے بعد سوزی کہنے لگی " انکل میں انگریزی رسالے پڑھ تو لیتی ہوں لیکن مجھے ان کی زیادہ سمجھ نہیں آتی۔"

میں نے کہا" کوئی بات نہیں! پریکٹس کرتی رہو، آہستہ آہستہ خود ہی سمجھ آنے لگے گی۔"

"سمجھ بھی آجاتی ہے پر وہ محاورہ نہیں ہوتا جو شرفا کی بیٹیوں کو خود بخود ہو جاتا ہے۔ اصل میں میری بیک گراؤنڈ خراب ہے۔"

"نہیں نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔" میں نے بالکل جھوٹے لہجے میں تسلی دیتے ہوئے کہا" محاورہ دراصل اس طرح کی زندگی گزارنے سے آتا ہے، سو تم کو آجاتے گا۔"

اس نے کہا" میں نے انگریزی کے اک پروفیسر کی ٹیوشن بھی رکھی تھی اور وہ تھا بھی بہت لائق لیکن اس کی نیت میں کھوٹ تھا۔"

" کھوٹ کیسا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"اس نے انکل پہلے تو مجھے آلیور ٹوسٹ پڑھایا، پھر آنا کرینا شروع کرادیا۔ میں انگریزی تو سمجھنے لگ گئی پر مجھے ایسی انگریزی نہیں آئی جیسی ان لڑکیوں کو آتی ہے۔ اس انگریزی میں تنکار بھی ہے اور بھید بھاؤ بھی، لہرا بھی ہے اور جھالا بھی۔ یہ تو انگریزی کو گہنے کی طرح پہنتی ہیں، وہ مجھے نہیں آتا۔"

"اوہ کم آن سوزی" میں نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا" ان میں سے کسی نے بھی یہ دونوں ناول نہیں پڑھے ہوں گے۔"

"اصل میں اس پروفیسر بیچارے کا بھی کوئی قصور نہیں تھا انکل" سوزی اسی لہر میں بہہ کر کہنے لگی" وہ خوشاب کا رہنے والا تھا اور ایک کمہار کا بیٹا تھا۔ اس کی بیک گرائنڈ بھی بہت کمزور تھی۔"

میں نے کہا" تم اس معمولی سی بات کے لئے اتنی پریشان کیوں ہو!"

"یہ معمولی بات نہیں ناں انکل" اس نے سنجیدگی سے کہا" یہ زندگی کا راز ہے۔"

میں نے اس کی حوصلہ افزائی کے لئے بات کا رخ بالکل دوسری طرف موڑ دیا اور پوچھا" چلو شہری لوگ تو نہ سہی، یہ بتاؤ کہ اب گاؤں کے وڈیرے اور سردار اور ان کی اولاد بھی گانا سننے نہیں آتی؟"

"وہ لوگ بھی گاؤں چھوڑ کر شہروں میں آگئے ہیں اور ان کی زندگیاں بھی شہر والوں جیسی ہوگئی ہیں۔ بڑے بزرگ تو سیاست میں چلے گئے ہیں اور ان کی اولادوں نے شہری لڑکے لڑکیوں کے ساتھ مل کر اپنے میوزیکل گروپس بنا لئے ہیں۔ اب وہ گانا سننے نہیں آتے، گانے بجانے آتے ہیں۔ یہ گروپ جو اس وقت اکمپنی منٹ دے رہا ہے، ایک رات کے گیارہ ہزار لیتا ہے____ وہ بھی بڑی خوشامدوں اور سفارشوں کے ساتھ۔"

میں نے کہا" اگر زمانہ بدل رہا ہے اور جیسا کہ تم نے خود کہا ہے کہ ٹائم چینج ہو رہا ہے تو پھر ٹیلی ویژن کے ساتھ رشتہ استوار کرو۔ اس کی معرفت تم کو بہت اچھے موقعے مل سکتے ہیں۔"

اس نے کہا" ٹیلی ویژن والوں کی ایک پالیسی ہے، وہ بازار سے کوئی لڑکی نہین لیتے۔"

"لیکن ریڈیو والے تو لیتے ہیں!"

"ان کی فیس بہت کم ہے اور سفارشیں زیادہ مانگتے ہیں۔ جاذبہ لیلیٰ جیسی لڑکی سہ ماہی میں ایک مرتبہ بک ہوتی ہے۔"

"جاذبہ لیلیٰ تمہارے وہاں کی لڑکی ہے؟"

"جی انکل"اس نے یاددلاتے ہوئے کہا"بے بے بکھو نہیں تھی بھیرے والی،اس کی نواسی ہے۔آپ نے تو بے بے کو دیکھا ہوگا؟
"

میں نے بے بے بکھو کو دیکھا تو تھا لیکن اس کے ساتھ کام نہیں کیا تھا۔صوفی صاحب اس کی بہت تعریف کرتے تھے۔عابد صاحب نے ایک مرتبہ "روپ متی اور باز بہادر " کے پیچھے بے بے بکھو سے تلنگ گوایا تھا جس نے ڈرامے کو چار چاند لگا دیئے تھے۔نظامی صاحب کہا کرتے تھے بکھو بھیرے والی راگ ودیا کی ڈکشنری ہے لیکن ڈی لکس ایڈیشن نہ ہونے کی وجہ سے ہر کوئی اس میں منہ مارتا ہے اور مروڑ تروڑ کر کباڑیئے کے یہاں بیچ جاتا ہے۔

میں نے سوزی کو بتایا کہ "بے بے کو میں اکثر ستارے کے پاس بیٹھے دیکھتا تھا لیکن اس سے میری کوئی خاص ملاقات نہیں تھی، صرف علیک سلیک تھی۔"

سوزی نے مجھے چھوٹے بچے کی طرح ہمک کر بتایا کہ اس نے ہمارا پرانا ریڈیو سٹیشن بھی دیکھا تھا اور وہ تین مرتبہ بچوں کے پروگرام میں آئی تھی۔آپا شمیم نے اسے بلا کر اپنے پاس بٹھایا تھا اور اس سے اس کا نام پوچھا تھا۔

جب صائمہ،شفورا،نیلسن اور پنی ادھر سے گزرے تو انہوں نے مجھے گھور کے دیکھا اور صفورا نے اپنی کھلی ہتھیلی پر تین چار مکے مار کر مجھے سینت ماری اور رمزیہ کہا"تیرے ساتھ سمجھوں گی بابیا،تو سیدھا ہو جا۔"

سامنے کولن اور ڈوڈو دھاگے سے لٹکتے سیب کو کھانے کی کوشش کر رہے تھے اور سیب کر بڑے بڑے گول چکروں میں جھلائے جا رہے تھے۔دونوں میں سے جونہیں کوئی سیب کو چک مارنے کی کوشش کرتا،سیب اس کے دانتوں اور ہونٹوں پر سکواش کی گیند کی طرح بڑھکتا اور اوپر اٹھ کر پھر چکر کاٹنے لگ جاتا۔اس تماشے میں تین مرتبہ کولن اور ڈوڈو کے ناک،ہونٹ اور ٹھوڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرائیں،جدا ہوئیں،پھر ٹکرائیں اور پھر جدا ہو گئیں۔لیکن سیب ایسا بدذات تھا کہ جڑی ہوئی ناک والے دونوں سروں کے گرد چھوٹے چھوٹے دائرے بنا کران کا منہ چڑاتا رہا۔بچہ لوگ خوشی سے تالیاں بجا رہے تھے اور دور صوفوں پر بیٹھی ہوئی شادی شدہ عورتیں اپنی باتیں بھول کر اس کھیل میں غرق ہو گئی تھیں۔ریٹائرڈ بریگیڈیئر ماما ذوالفقار بالکل سیدھے کھڑے کاشن دے رہے تھے"اوئے کولن پورا منہ کھول کے چک واڈھو، فل منہ کھول کر۔شرماؤ نہیں جوان۔ڈونٹ فائٹ شائی ــــــ پورا منہ کھول کر چارج کرو۔"

لیکن اب کولن اور ڈوڈو دونوں تھک چکے تھے اور سالم ثابت سیب ڈوڈو کی لپ سٹک سے اور بھی سرخ ہو گیا تھا۔میں نے غور سے دیکھتی سوزی کی توجہ ہٹانے کے لئے پوچھا"سوزی تم نے کوئی تماش بین نہیں پکڑا؟"تو وہ اس بات پر اونچے اونچے ہنسنے لگی اور اپنے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولی"تماش بین کوئی پکڑنے کے لئے تھوڑی ہوتے ہیں انکل،وہ تو چھوڑنے کے لئے ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا"تو میرا مطلب نہیں سمجھی ــــــ میرا مطلب ہے شادی کے لئے کوئی عقل کا اندھا پکڑا کہ نہیں؟"

وہ بڑی سنجیدگی سے بولی"ایک پکڑا تھا انکل لیکن وہ قابو نہیں آیا۔ہاتھ سے نکل گیا۔"

" کیسا تھا؟"

"بہت اچھا انکل، بلکہ بہت ہی اچھا ـــــــ تربیلا انجینئر تھا اور ہر ہفتے باقاعدگی سے مجھے ملنے آتا تھا۔"

"پھر؟"

"پھر کیا------ نہیں مانا"

"تمہارے جیسی خوبصورت لڑکی کے لئے بھی نہیں مانا؟"

"دل سے تو مانتا تھا لیکن ڈرتا بہت تھا ـــــــ کہتا تھا تم جیسی طوائف زادیاں شادی کے بعد اتنی شریف اور گھریلو قسم کی بن جاتی ہو کہ زندگی کا لطف ختم ہو جاتا ہے۔ تم ویسی ہوٹ اور پنجنٹ نہیں رہتی ہو، ڈپٹی نذیر احمد کی بی بیاں بن جاتی ہو ـــــــ یہ ڈپٹی صاحب کون ہیں انکل؟"

میں نے سوزی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور سیب کا کھیل دیکھنے لگا۔ اب مقابلے پر شاہد اور صائمہ آ گئے تھے۔ ڈھول زور زور سے بجنے لگے تھے اور لڑکے والے مہندی لے کر داخل ہو رہے تھے!

زرناب گل

جب ہم چھوٹے تھے تو دریائے ستلج کے اس کنارے پر رہتے تھے اور ہمارے گاؤں کا نام علی اولک تھا! لیکن جب ہم بڑے ہوئے تو دریائے ستلج کے اس کنارے پر آ کر آباد ہو گئے، اور ہمیں پتہ چلا کہ نہ تو دریائے ستلج کے کنارے پر آباد ہونے میں کوئی خوبی تھی اور نہ ہی ہمارے چھوٹے ہونے میں کوئی برتری تھی، صرف ہمارے ہونے میں ایک راز تھا جو خالی اسی کو معلوم تھا جس نے ہمیں ہونا عطا کیا تھا۔

علی اولک کے پنساں نویس کی ایک لڑکی تھی، جس کا نام نجمہ تھا۔ نجمہ میری چھوٹی بہن زاہدہ کے ساتھ پڑھتی تھی اور زاہدہ کی ٹانگ میں ایک پیدائشی نقص تھا جس کی وجہ سے وہ لنگڑا کر چلتی تھی۔ نجمہ کی ناک پر بھورے رنگ کا ایک سیپی جیسا نشان تھا جس کو اس کی ماں لہسن کہتی تھی۔ نجمہ کا باپ اس نشان کو تولہ کہتا تھا۔ چونکہ وہ دونوں ان پڑھ تھے، اس لئے نہ لہسن کا مطلب جانتے تھے نہ تولے کا۔

ہمارے اس گاؤں میں صرف تین گھرانے پڑھے لکھے تھے ___ ایک سردار ہرپال سنگھ ریٹائرڈ صوبیدار میجر کا، جس کا لڑکا مڈل پاس تھا اور بی بی سرجیت کور گورمکھی کی کتاب اٹھا لیتی تھی۔ دوسرا مولوی امیر الدین فاضل دیوبند کا اور تیسرا ہمارا۔ لیکن ہم لوگ سب سے زیادہ پڑھے لکھے تھے۔ میرے بڑے بھائی جو ایف ای ایل کی تیاری کر رہے تھے، ان کے پاس آٹھ جلدوں میں بک آف نالج تھی اور میری آپا کے پاس "تہذیب النسواں"، "عصمت" اور "خاتون" کی جلد بندھی فائلیں موجود تھیں۔ میرے والد شاعر تھے اور خسروی تخلص کے ساتھ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ انگریزی ڈپٹی کمشنروں کو جتنے بھی سپاس نامے پیش کئے جاتے، وہ میرے والد کے لکھے ہوئے اور میرے بڑے بھائی کے دیکھے ہوئے ہوتے تھے لیکن میری آپا اس میں بھی املا کی غلطیاں ڈھونڈھ لیتی تھیں کیونکہ وہ اس زمانے میں بھی پتہ کو پتا لکھتی تھیں۔

نجمہ نے جب مڈل پاس کر لیا تو اس کے ابے نے اسے بنگلے فاضلکا کے ہائی سکول میں داخل کرا دیا جہاں مس محسنین اس کی ہیڈ مسٹریس تھیں۔ بائیس ہزار کی آبادی کے بڑے شہر نے نجمہ کو چار چاند لگا دیئے اور اس کی شخصیت پنسال نویس کی بیٹی سے پھسل کر افسر مال کی بیٹی پر اتر آئی اور وہ دورے سے یوں دکھائی دینے لگی جیسے کسی بڑے سیاست دان کی بیٹی ہو۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں جب وہ گھر واپس آئی تو سارے گاؤں میں ایک لہلہا سا ہو گیا اور وہ پرندے بھی منڈیروں پر اترنے لگے جو ہواؤں میں اوپر ہی اوپر سے گزر جاتے تھے۔ اس

کی رنگ دار قمیصوں کی پھبن اور آستینوں کی جھالر کا چڑھاؤ ایسا تھا کہ گلیوں کے دہانے پر وہ ایک ٹیڑھی سی دکھائی دیتی جو اپنی جوانی کی تپش میں مینہہ مانگ رہی ہو۔ یوں تو علی اولک میں بادل کے اور بھی بہت سے ٹکڑے تھے لیکن میری ٹھنڈک اور میرا پانی ان سے زیادہ تھا اور میں ہر وقت برسن ہار سا رہتا تھا۔

جس دن وہ زاہدہ سے مل کر اور اپنے سکول کے نہ ختم ہونے والے قصے بیان کر چکنے کے بعد ہماری حویلی کی کچی سیڑھیوں کے نیچے سے گزری تو میں اس کی جھالر دار کلائی تھام کر اتنا برسا، اتنا برسا کہ اس کا سارا وجود جل تھل ہو گیا۔ ہماری مشکی پچھیری نے سانی سے منہ نکال کر گردن موڑی اور ہمیں حیرانی سے دیکھنے لگی کہ اب یہ اتنے گہرے پانیوں سے باہر کیسے نکلیں گے!

میں نے تین مرتبہ گورنمنٹ کالج لاہور سے آدھا پیریڈ چھوڑ کر فاضلکا بنگلے کا سفر اختیار کیا لیکن تینوں مرتبہ مجھے اس سے ملنے میں ناکامی ہوئی۔ مس محسنین کے اصول کچھ اس قدر تنی ہوئی کینوس کے تھے کہ جس قدر زور سے کوئی اس سے ٹکراتا تھا، اسی قدر دور جا گرتا تھا ____ اکوئل اینڈ اپوزٹ ____ پتھر کی دیوار سے سر ٹکرانا بڑا آسان تھا کہ اس سے ایک گونج بھی پیدا ہوتی تھی اور ارتعاش سے ماحول بھی لرزہ براندام ہو جاتا تھا، خوب بھی نکلتا تھا اور آسودگی اور شہرت بھی عطا ہوتی تھی ساری شعر و شاعری پتھر کی دیوار سے انا کے دو دو ہاتھ کی وجہ سے تھی لیکن کینوس کی تنی ہوئی دیوار ہر مرتبہ مجھے اپنی غلیل میں بھر کر آٹھ آٹھ کیاریاں، دو دو لان اور تین تین سڑکیں پرے پھینک دیتی تھی۔ اس میں ذِلت بھی تھی، ہزیمت بھی، شرمندگی بھی اور خواری بھی!

گاؤں پھر بھی اچھا تھا۔ پھر بھی کیا، بہت ہی اچھا تھا۔ لیکن گرمیوں کی چھٹیاں پورے ایک سال بعد آتی تھیں اور ڈھائی مہینے کی مدت میں اتنا وقت ہی کہاں ہوتا ہے کہ باتیں کھل کر ہو سکیں، ساری کی ساری ہو سکیں اور کہنے اور سننے کی کوئی حسرت باقی نہ رہے۔

نجمہ میں ایک خرابی تھی کہ وہ سنتی زیادہ تھی اور بولتی کم تھی۔ کچھ کہنا چاہتی تو ہاتھ تھامے بغیر کہہ نہ سکتی۔ ہاتھ تھام لیتی تو پھر اس کی زبان رک جاتی۔ جس طرح مشین میں ایک ہوڑے کے اندر دوسرا ہوڑا آنے سے رولر لاک ہو جاتا ہے، یہی حال اس کا تھا۔ میں اس سے شرارت کی کوئی بات کہتا تو وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے مجھے یوں پرے دھکیل دیتی جیسے کاغذ چھپ جانے کے بعد پریس کے کمانچے اسے پرے دھکیل کر بڑے قرینے سے انبار پر رکھ دیتے ہیں۔ اس کا بھی یہی قرینہ تھا۔ پرے دھکیل کر وہ مجھے اپنی ذات کے انبار میں مجتمع کر لیتی تھی۔

میٹرک میں وظیفہ پانے کے بعد وہ فیروز پور کے "مہاودیالاء" کالج میں داخل ہو گئی اور اس سے ملنا قدرے آسان ہو گیا۔ مگر اتنا آسان بھی نہیں کہ سال میں تین چار ملاقاتوں سے زیادہ ہو سکیں۔ مہاودیالاء کی ڈیوڑھی میں دو کرسیاں آمنے سامنے ڈال کر اور اپنی اپنی کتابیں گود میں رکھ کر آدھ گھنٹہ کی ملاقات کا وقت ملتا تھا۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر اپنی کتابوں پر ہاتھ رکھ کر انسان زیادہ سے زیادہ بیان حلفی دے سکتا ہے، اس سے زیادہ نہیں۔

ایک روز اپنی کتابوں پر ہاتھ رکھے رکھے اس نے نظریں اوپر اٹھائے بغیر بڑی آہستگی سے کہا "مجھے تو اس لفظ کے کوئی معنی نہیں ملے"!

"کون سے لفظ کے؟" میں نے اسی آہستگی سے پوچھا۔

"وہی جو تم بولا کرتے ہو۔"

"میں تو بہت سے لفظ بولا کرتا ہوں۔"

"وہ سارے نہیں، وہ اکیلا لفظ جو تم بولا کرتے ہو۔"

"میں نے تو آج تک کوئی اکیلا لفظ نہیں بولا۔"

"جس میں گل آتا ہے!"

"گل تو بہت سے لفظوں میں آتا ہے: گل گلاب، گل اندام، گل فردہ، گل چراغ، گل تازہ، گل بکاؤلی----- پتہ نہیں تم کون سے گل کو پوچھ رہی ہو۔"

اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور خاموش ہوگئی۔ میں نے پھر پوچھا تو اس نے اسی طرح آنکھیں بند کئے جواب دیا "وہی بچے کے نام والا!"

"اوہ" میں نے خوش ہو کر کہا "زرناب گل؟"

نجمہ نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر تھوڑی دیر کے لئے ہم دونوں خاموش ہوگئے۔

پھر اس نے ہمت کر کے کہا "مجھے تو زرناب کے معنی کسی ڈکشنری میں بھی نہیں ملے۔"

میں نے مسکرا کر کہا "مس! آپ کے کالج کی لائبریری میں معمولی قسم کی ڈکشنریاں ہیں۔ ان میں یہ لفظ نہیں ملے گا۔"

"تو پھر کہاں ملے گا؟" اس نے آنکھیں کھول کر پوچھا۔

"یہاں" میں نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا " اس ڈکشنری میں۔ یا پھر اس گود جس میں تم کتابیں رکھ کر بیٹھی ہو۔" وہ خوشی کے بھرپور لمحے سے بوکھلا سی گئی اور اس کا چہرہ اس شخص کا سا ہو گیا جس کا مسکراتے وقت رونا نکل جائے اور وہ بے اختیار سسکیاں بھرنے لگے۔

میں نے نجمہ کو بتایا تھا کہ جب ہماری شادی ہوجائے گی اور ہمارا بیٹا پیدا ہوگا تو ہم اس کا نام زرناب گل رکھیں گے اور اس کو تیراندازی کا فن سکھائیں گے۔ جب وہ جوان ہوگا تو ہم اس کو خشک ناچ سکھائیں گے۔ اس کی ماں تو اپنے چہرے پر آئی ہوئی لٹ کو پھونک مار کر اوپر اٹھاتی ہے، وہ جھٹکا دے کر اپنے زلفوں کو واپس لایا کرے گا۔

"ناں! ہم نہیں سکھائیں گے اس کو خشک ڈانس۔"

"کیوں؟"

"پتہ ہے کتنے چکر آتے میں اس ناچ میں! سارا دماغ گھوم جاتا ہے۔"

"وہ کوئی ہماری عمر کا تھوڑی ہوگا نجمہ، وہ تو جوان ہوگا نجمہ، وہ تو جوان ہوگا ____ منہ زور بچھیرا۔ اس کو چکر کدھر سے آئیں گے۔"

"نہیں' کوئی ضرورت نہیں" اس نے سختی سے کہا اور یہ کہہ کر ایسی کچی پڑ گئی جیسے اپنے ہی گھر کے فریج سے باسی مٹھائی نکال کر کھا

تے ہوئے شوہر کو اس کی بیوی آ کر کہے "ہائے میرے اللہ یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟"

نجمہ کے ہاتھ میں بھی باسی باتوں کا کٹورہ تھا اور وہ ادھ کھلے منہ کے ساتھ فرش کو دیکھ رہی تھی۔

پچھلے سال یہی دن تھے، یہی موسم تھا، ایسی ہی سیاسی فضا تھی اور آسمانوں کے ایسے ہی رنگ تھے۔ کراچی سے میرے بڑے بیٹے کی منگیتر آئی ہوئی تھی۔ آصفہ سینئر کیمبرج کا امتحان دے کر دسمبر والے داخلوں کا انتظار کر رہی تھی کہ سب نے مجھ سے پوچھے بغیر بلو کی ہیڈ جانے کا پروگرام بنا لیا۔۔۔۔ وہ ٹوکریاں، تھرموسیں، باربی کیو کی مشین جو پانچ سال پہلے ہم ولایت سے لائے تھے، باہر نکال کر ڈکی میں بھری گئیں۔ پینے کے پانی کی صاف اور مصفا بوتلیں نکالیں گئیں۔ تامیاں لپیٹی گئیں اور ہمارا قافلہ منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

بھائی پھیرو سے ذرا پہلے ایک زناٹے دار جیپ نے ہمیں اوورٹیک کیا۔ اس مین زمیندار اور زمینداروں کے جوان بیٹے سوار تھے۔ سر پر طرح دار پگڑیاں اور تن پر شیشے والی واسکٹیں تھیں، ہاتھوں میں رائفلیں اور چہروں پر نوکیلی مونچھیں۔ لیکن جب جیپ ذرا آگے نکلی تو ہم نے ایک انوکھا منظر دیکھا۔ اس جیب کے پیچھے ایک موٹے سے رسے کے ساتھ براؤن رنگ کا ایک کتا بندھا تھا جو پچاس پچپن کی سپیڈ پر تیز دوڑتی کار کے پیچھے بڑے عبرت ناک انداز میں گھسٹ رہا تھا۔ دس پندرہ فٹ بھاگتا، پھر ٹانگوں پر ساکت ہو جاتا۔ جب نیچے سڑک کی رگڑ سے جلتے تو پیٹھ اور پہلو کے بل سڑک پر گھسٹنے لگتا۔ پھر تڑپ کر اٹھتا اور بھاگنے لگتا۔ بڑے جھبرے کا کتا تھا اور اس کی گردن اور سر پر لمبے لمبے بال تھے۔ جان کنی کی اذیت میں جب وہ سڑک سے اوپر اچھلتا تو اس کا سارا بدن سپرنگ کی طرح کھلتا اور بند ہوتا اور اس کیفیت میں اس کے سر کے بال پہلے آگے کو اور پھر پیچھے کو جاتے۔ یوں لگتا جیسے موتکے اس ناچ میں وہ اپنے بالوں کو خود جھٹک رہا ہے۔ ہم اس جیپ سے چند فٹ کے فاصلے پر تھے اور میرا بڑا بیٹا آگے بڑھ کر رائفل بردار سرداروں کو روکنا چاہتا تھا لیکن ہم سب اس کو منع کر رہے تھے۔ میری بیوی اور میری ہونے والی بہو اپنی آنکھوں کے گرد دوپٹے لپیٹ کر کافی اونچی آواز میں رو رہی تھیں اور ہم پتھر کے بت بنے اس خونی ناچ کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنے بیٹھے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر موٹر روکوالی اور جیپ ہماری نگاہوں کے سامنے اوجھل ہو گئی۔

جب ہم پک نک منانے کی غرض سے ہیڈ بلو کی اترے تو کسی نے بھی سامان ڈکی سے نہ اتارا۔ کسی نے کوئی بات نہ کی۔ سب یوں کھڑے تھے جیسے اپنے کسی عزیز کو دفن کرنے کے بعد قبرستان کے کنارے واپس لوٹنے والے کھڑے ہوں۔

پھر ہم نے دیکھا دریا کنارے سوکھے سرکنڈوں کے بل کھاتے سمندر میں آگ اور دھوئیں کا ایک ستون اٹھا اور بڑے بڑے آتشیں لانبوؤں نے ایکڑ بھر رقبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہم سب ادھر دوڑے۔ بہتے دریا کے کنارے آگ کا دریا بھڑک رہا تھا اور آسمان کو لپکتے شعلوں کے اوپر ایک گٹاری غوطہ مار کر آگ کی تہہ میں اترنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سرکنڈوں کے اندر اس کا گھونسلا تھا اور اس کے بچوں نے کل ہی اڑنا سیکھا تھا۔ بھڑکتے ہوئے شعلے بے سرے ڈھولوں اور ٹوٹی ہوئی نوبتوں کی طرح چیخ رہے تھے۔ ہم نے دیکھا گٹاری کے دونوں بچے آخری مرتبہ، آخری زور لگا کر اوپر ابھرے اور پھر ڈھیلوں کی طرح بھڑکتی ہوئی آگ میں گر گئے۔

ہم سب اس چتا کے سامنے سر جھکائے کھڑے تھے اور ہمارے ارد گرد کسی قریبی سکول سے پک نک پر آئی ہوئی لڑکیاں اونچے اونچے رو رہی تھیں گٹاری زمین سے آگ کی طرف اور آگ سے آسمان کی طرف پرواز کرتے ہوئے اپنی پوری طاقت سے چیخ رہی تھی۔

www.hallagulla.com

میں نے اس سے پہلے کسی جانور کو اتنی اونچی آواز میں کفر کے کلمات کہتے نہیں سنا تھا۔

ایک لڑکی نے روتے ہوئے کہا" مس دونوں بچے جل کر راکھ ہو گئے"۔

مس نے بڑے تحمل کے ساتھ بڑی ملائم آواز میں کہا" ہاں کلثوم، دونوں زرناب گل ہو گئے۔"

میں نے چہرہ گھما کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ جو گلابی لہسن ہوتا تھا، اب بالکل سیاہ ہو گیا تھا اور موٹے فریم کی عینک کے نیچے سے ہو کر آگے نکل گیا تھا۔ اسکا چہرہ اب بھی ویسا ہی تھا۔ کاش اس نے اپنے بال رنگ لئے ہوتے!

میں نے اپنی بیوی سے کہا" ان سے ملو، یہ نجمہ ہیں"۔

وہ میری بیوی سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولی" میں رادھا رام سکول میں ہیڈ مسٹریس ہوں اور یہ میری ملازمت کا آخری سال ہے"۔

پھر اس نے زور کی تالی بجا کر کہا" بچیو! واپس واپس واپس!!!"

لڑکیاں بس کی طرف لپکیں اور نجمہ ہم سے خدا حافظ کہے بغیر انہیں لے کر بس میں سوار ہو گئی۔

گٹاری اب بھی اسی طرح جھلسی ہوئی فضاؤں میں چیخ رہی تھی حالانکہ اب چیخنے والی کوئی بات ہی نہ رہی تھی!

دم بخود

مادھو کے مرنے میں صرف چند گھنٹے رہ گئے تھے اور اس کی جوان بہن پکی سڑک پر ننگے پاؤں کھڑی تھی____ گود میں مادھو تھا، آنکھوں میں آنسو، کانوں میں پیتل کے بندے اور ہاتھ میں پانی کی بھری ہوئی شیشی۔ وہ مرتے ہوئے مادھو کو اپنے سینے سے لگائے اور پانی کی شیشی پر نگاہیں جمائے کسی ایسی دردناک فلم کا اشتہار سی لگتی تھی جس کا آج آخری شو ہو!

جب ہم مغرب کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے تو سب سے پہلے گاگو کسائی نے گافتری کے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑی محبت سے اسے ہلایا اور پھر کہنے لگا" کیا حال ہے پتر مادھو بیٹھے کا؟" گاتری سسکیاں بھر کر رونے لگی تو گاگو بولا" ہے ناں بے قوف، تھڑدلی____ اللہ مولیٰ نے کل سویر تک فضل کر دینا ہے اور اس نے بھاگے پھرنا ہے۔" پھر اس نے بسم اللہ پڑھ کر شیشی کے کھلے منہ میں پھونک ماری اور مادھو پر دم کر کے آگے بڑھ گیا۔

دوسرے نمازیوں میں سے بھی چند ایک بزرگوں نے شیشی پر دم کیا اور گافتری کے سر پر پیار کر کے آگے چلے گئے۔ میرے ابا چونکہ بوٹ پہن کر مسجد میں آتے تھے اور سیڑھیوں پر بیٹھ کر آرام سے تسمے کھولتے اور باندھتے تھے اس لئے سب سے آخر میں ہم باہر نکلے۔ ابا جی نے آیت الکرسی پڑھ کر شیشی پر دم کیا اور تین مرتبہ یا حی یا قیوم اونچی آواز میں کہہ کر مادھو پر پھونک ماری۔

ہمارے قصبے میں اکثر، مغرب کے وقت بہت سی غیر مسلم عورتیں اور لڑکیاں پانی پر دم کرانے کے لئے مسجد کے دروازے پر موجود ہوتیں۔ نمازی ایک ایک کر کے ان کے گلاسوں، کٹوروں اور بوتلوں پر دم کرتے اپنی اپنی راہ نکل جاتے۔ میں اس وقت نویں جماعت میں پڑھتا تھا اور اگر میرا ایک سال مارا نہ گیا ہوتا تو میٹرک پاس کر چکا ہوتا، لیکن میری کبھی یہ جرات نہ ہوئی کہ ابا جی سے پوچھوں کہ مغرب کے وقت یہ عورتیں کہاں سے آ جاتی ہیں اور ان کے گھروں پر کیا مصیبت ٹوٹی ہے جو انہیں ہر روز ہی پانی دم کرا کے لے جانا پڑتا ہے۔ پھر دم کئے پانی سے یہ ضروری تو نہیں کہ مریض اچھا ہی ہو جائے۔ کئی مر بھی جاتے ہیں۔ کچھ دائم المرض بھی ہو جاتے ہیں۔ کئی ایک تھوڑا عرصہ تجربہ کرنے کے بعد چھوڑ بھی جاتے ہیں۔ لیکن یہ ساری باتیں میرے استفسار کا حصہ نہ تھی۔ میں اپنے ابا جی سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ لوگ دم کرانے آتے کیوں ہیں؟ مجھے ان کے چھوڑ جانے پر اعتراض نہیں تھا، ان کے چلے آنے پر تعجب تھا کہ سب کچھ ہوتے ہوئے وہ ہمارے

طرف ہی کیوں چلے آرہے ہیں۔لیکن آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے اپنے ابا جینوں سے ایسے سوال پوچھے نہیں جاسکتے تھے۔وہ غیر ترقی یافتہ زمانہ تھااس لئے اپنے بڑوں سے غیر ضروری باتیں نہیں کی جاسکتی تھیں۔

اگلی شام مین گاتری کو پھر مغرب کے وقت مسجد کے دروازے پر کھڑے پایا۔مادھوابھی تک زندہ تھااور ایک جونک کی طرح اس کے سینے سے؛ چپٹا ہوا تھا۔میرا ے حساب سے اسے رات کے وقت فوت ہوجانا چاہیئے تھالیکن وہ بدستور سانس لے رہا تھااور باقی تھا،گو اس کے تن بدن میں زندگی کے آثار موجود نہ تھے۔نمازیوں نے ایک بار پھر مادھو پر اور اس کے ساتھ آئی ہوئی شیشی پر دم کیا اور آگے نکل گئے۔

گاتری ہمارے قصبے کے دید جی ماتھر صاحب کی بیٹی تھی اور مادھو اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ان کا چھوٹا سا گھرانا ایک چھوٹے سے گھر میں قیام پذیر تھااور ماتھر صاحب اپنے گھر پر ہی مریضوں کا علاج کرتے تھے۔میں نے ان کے گھر کے آگے سے گزرتے ہوئے کئی مرتبہ دور دراز سے لائے ہوئے مریضوں کو چار پائیوں پر اور ڈولیوں میں پڑے دیکھا تھا۔ان کے لواحقین گلی میں زمین پر بیٹھے یا دیواروں کے ساتھ ڈھولگائے کھڑے ہوتے اور ان کے چہروں پر مایوسی کے نقوش کے علاقہ اور کوئی لکھت نہ ہوتی اور ان کے بند گے ہوئے ہاتھو کے رخ آسمان کے سوااور کسی طرف نہ ہوتے۔

گاتری کی عمر مشکل سے پندرہ برس کی ہوگی۔وہ سبز کناری کی میلی سی دھوتی باندھے اور بالوں میں پیتل کے کلپ لگائے مسجد کے دروازے پر کھڑی تھی اور اس کی گود میں زندہ بچ جانے والا مادھو تھا جس کے سر پر کیسری ٹوپی،پاؤں میں نیلے رنگ کے موزے اور گلے میں پرانی دھجی سے بندھا ایک میلا سا تعویذ تھا۔آج گاتری نے اپنا چہرہ پورااوپر اٹھایا ہوا تھااور اس کی ٹھوڑی کے نیچے سفید گردن کرتی کے گریبان تک صاف عیاں تھی۔آج اس کے ہاتھ میں شیشی کے بجائے پیلے کانچ کا ایک چھوٹا سا گلاس تھااور پاؤں میں سلیپروں کے بجائے اپنے سائز سے ذرا سی بڑی چپل تھی۔اس روز اباجی کسی وجہ سے مسجد نہ آسکے تھےاور میں اکیلا ہی مغرب پڑھنے آیا تھا۔

جب سب نمازی گاتری کے گلاس پر دم کرکے آگے نکل گئے تو مسجد کے دروازے پر میرے قدم من من کے ہوگئے اور زمین نے میرے قدموں کو چنبک کی طرح پکڑ لیا۔سب نمازیوں کے چلے جانے کے باوجود گاتری اپنی جگہ پر اسی طرح کھڑی رہی۔میں نے زور لگا کر اپنی منمنی آواز میں کہا" اباجی تو آج نہیں آئے"۔

مادھو ذرا ساٹھنکا تو اس نے اپنے بھائی کو گودی میں جھلا کر اپنا گلاس میرے آگے کر دیا۔مجھے آتا تو بہت کچھ تھالیکن پیلے کانچ کے بڑھے ہوئے گلاس کو دیکھ کر مجھے سب کچھ بھول گیا۔میں نے پورا زور لگا کر ہولے سے گلاس میں "پھو" کیا تو اس نے پہلو پھر کر مادھو کو میرے آگے کر دیا۔مادھو کمزور تو اب بھی تھالیکن اس کی صحت بحال ہوگئی تھی۔کیسری ٹوپی میں وہ چھوٹا سا بوزنہ دکھائی دیتا تھا،جو اپنی بازی گرماں کے کرتب دکھا چکنے کے بعد اس کے پیٹ سے دوبارہ چمٹ گیا تھا۔میں نے الحمد شریف پڑھ کر مادھو کے سارے وجود پر لمبی سی چھو کی تو گاتری کی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔میں نے کچھ پڑھے بغیر ایک زور کی پھونک گاتری کے چہرے پر ماری تو اس کی دونوں آنکھیں روشن ہو کر چہرے کو لودینے لگیں۔پہلے وہ کبھی اتنی خوب صورت نہیں تھی جتنی مغرب کے بعد ہوگئی تھی۔میں نے اپنی راہ پر جاتے ہوئے اسے واپس مڑ کر دیکھا۔وہ اور مادھو ابھی تک وہیں کھڑے تھے۔

دوسری مرتبہ جب میں گاتری سے ملا تو اس نے پھر سبز کنی والی دھوتی باندھی ہوئی تھی مگر اس مرتبہ اس کی دھوتی پہلے کے مقابلے میں زیادہ کسی ہوئی تھی اور اس کے پاؤں ایک نرتکا کے انداز میں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ اس کے بائیں گال پر ایک چھوٹا سا پھاہا لگا تھا جس کے نیچے ایک طاقت ور کیل کا ابھار تھا۔ یہ گرمیوں کی چھٹیوں کی بات ہے اور میں شہر کے بڑے کالج سے تین مہینے کی چھٹیاں گزارنے گھر آیا تھا۔ جب میں آہستہ روی کے ساتھ ان کے دروازے کے اندر جھانکتا ہوا آگے بڑھا تو ماتھر جی نی آواز دے کر مجھے پکارا۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا۔ ماتھر جی نے گرج دار ہانک لگا کر کہا" میاں ادھر کدھر دیکھ رہے ہو، میں نے تمہیں پکارا ہے"۔

ماتھر جی ایک بڑے سے تسلے میں گرم گرم کاڑھا بانس کی کھچی سے ٹھنڈا کر رہے تھے۔ گاتری ان کے پاس پیڑھی پر بیٹھی تھی اور اس کے ہاتھ میں ململ کا ایک بڑا سا ٹکڑا تھا۔ مجھے آہستگی سے اندر آتے دیکھ کر انہوں نے کہا" سارا دن آوارہ گردی کرتے ہو، کچھ کام بھی کیا کرو۔ اس ڈبے پر بیٹھو اور ادھر سے یہ کپڑا پکڑو۔" گاتری نے اپنی پیڑھی چھوڑ کر کہا" آپ ادھر آجائیں، ڈبے پر میں بیٹھ جاتی ہوں"۔

"جس کو میں نے جہاں کہہ دیا ہے، وہی جگہ اس کے لیے ٹھیک ہے"۔ ماتھر صاحب نے کھچی باہر نکال کر گاڑھی دھار کو اپنی انگلی اور انگوٹھے سے چھپایا اور پھر بولے" گھبرانا نہیں، گرم نہیں ہے۔ اور کنارا چھوڑنا بھی نہیں ہے۔ پلو پکڑتے ہیں تو خوب مضبوطی سے پکڑتے ہیں۔ سمجھے!"

میں نے "جی سمجھ گیا"۔ ڈبے پر بیٹھ کر ایک طرف سے ململ کا کنارا میں نے پکڑا اور دوسری طرف سے گاتری نے۔ ماتھر جی نے کاڑھے کا ایک ڈونگا بھر کر ململ کی جھولی میں ڈالا اور بولے "یہ چبن پراش ہے۔ اس کا نسخہ مگھنٹو میں بھی نہیں ملتا۔ ہمارے گھرانے کا خاص کمال ہے۔ بنگالیوں کو بھی اس کا علم نہیں۔"

گاتری نے مسکرا کر کہا" بابو جی کے گھرانے کا ہر کمال خاص کمال ہوتا ہے۔"

بابو جی نے ڈونگا روک کر کہا" پوچھ لے اپنی ماں سے کہ اس کے مقابلے میں ہمارا گھرانہ کیسا تھا۔ میرے بابا تو یہاں نیوتہ نہیں دیتے تھے پر گاؤں والوں نے انہیں مجبور کر دیا"۔

میں نے حوصلہ کر کے کہا" ماتھر جی مجھے تو چاچی جی کے قدبت سے ان کا گھرانہ بڑا معلوم ہوتا ہے"۔

ہنس کر بولے" اس کا قدبت تو ہمارے گھر آکر بڑا ہوا ورنہ گاتری کی پیدائش سے پہلے تو یہ بالکل چڑیا سی تھی تمہاری چاچی"۔

گاتری نے کہا" باتوں میں نہ پڑ جائیں، کپڑے کی طرف بھی دھیان رکھیں۔ آپ کے ہاتھ سے پلو پھسلا جا رہا ہے"۔ میں نے چونک کر دیکھا تو واقعی میری طرف کے کونے کی ایک چنٹ ڈھیلی ہو کر اوک سی بنائے کھڑی تھی۔ میں نے جلدی سے اوک کی طناب کھینچی اور چوکس کے ساتھ کنارا مضبوطی سی پکڑ لیا۔

مادھو گلی ڈنڈا ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوا تو ماتھر جی نے کہا" اوئے ٹڈے سلام کر بھیا کو جس کی پھونک سے تم کو نیا جیون ملا ہے"۔

میں نے کہا" ناں ماتھر جی، ناں۔ میں کون ہوتا ہوں جیون کو ہینڈل کرنے والا۔ اس کو نیا جیون تو اسی نے دیا ہے جس نے پہلا جیون دیا تھا"۔

"پر آپ لوگوں نے پانی پر بھی تو سی کا نام پڑھ کر پھونکا تھا۔" گاتری نے کہا" آپ لوگ نہ ہوتے تو اس وقت مودھو بھی نہ ہوتا!"

"یہ لوگ بھی نہ ہوتے اور تیری دھروتا بھی نہ ہوتی تو میرا گھر اندھیرا گھپ ہو جانا تھا۔جس بینتی کی مورت بن کر تو ہر شام مسجد کے دوارے کھڑی ہوتی رہی ہے،اس پر تو بھگوان کو ترس آنا ہی تھا____میں تجھے برگد کی اوٹ سے ہر شام دیکھتا تھا اور روتا تھا۔"

"پھر تو آپ کے آنسو کام آئے بابو جی" گاتری نے چمک کر کہا۔

"میں مادھو کے لئے تھوڑی روتا تھا مورکھ" ماتھر جی نے چڑ کر کہا" میں تو تیرے لئے روتا تھا کہ بھائی کے لئے کس طرح ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے"۔

"اتنی دیر کھڑے ہونا کون سا مشکل ہے ماتھر جی" میں نے شرارتاً کہا "مغرب کی نماز تو بہت مختصر ہوتی ہے"۔

ماتھر جی نے اچھی بھلی باتوں کے رخ کو موڑ کر اچانک مجھ سے پوچھا" اچھا جی،تم کیا پڑھ کے دم کرتے تھے مادھو پر؟"

میں نے معذرت بھرے لہجے میں کہا" ماتھر جی میں تو ہمیشہ الحمد شریف پڑھ کر ہی دم کیا کرتا تھا۔"

الحمد شریف کا نام سن کر انہوں نے ڈونگا واپس کاڑھے میں ڈال دیا اور کانوں کو ہاتھ لگا کر بولے "میرے پتا جی رات کو سوتے وقت الحمد شریف کا ورد کیا کرتے تھے اور پھر ورد کرتے کرتے سو جاتے تھے۔مجھے بھی انہوں نے یہ سورۃ یاد کرانے کی کوشش کی لیکن ایک تو میری زبان نہیں پلٹی اور دوسرے مجھے داھرمک باتوں کا کوئی شوق بھی نہیں تھا۔بات بیچ ہی میں رہ گئی۔کپڑا کھینچ کے رکھو،سارا ماوا بنا چھٹے اندر گر رہا ہے"۔

میں نے کپڑے کا کونہ پھر سے ٹھیک کیا اور کھسیانا سا ہو کر پوچھنے لگا" ماتھر جی!دم درود کا واقعی کوئی اثر ہوتا ہے یا انسان نے اپنے دل کی تسلی کے لئے یہ سہارا ڈھونڈ لیا ہے؟"

"ہمارا مودھو تو آپ کے سامنے ہے۔" گاتری بولی" مہینہ بھر بابو جی نے اس کا علاج کیا۔پھر شہر لے جا کر ٹیکے لگواتے رہے۔جو دوا جس نے بتائی،اس کو دی پر یہ تو نگھرتا ہی چلا گیا"۔

"بات یہ ہے" ماتھر جی نے ہماری جھولی میں کھچی پھیرتے ہوئے کہا" یہ سب بھگوان کے بھید ہیں اور اصل علم اسی کے پاس ہے۔پر جب کوئی اس کی چوکھٹ پر گھٹنے ٹیک کے اور سیس نوا کے اپنا آپ____پورے کا پورا____اس کے حوالے کر دیتا ہے تو وہ اپنی مرضی بھی تبدیل کر لیتا ہے۔ہم سے تو یہ کام نہ ہو سکا۔نہ مجھ سے نہ اس کی ماں سے،پر گاتری نے بینتی کر کر کے بھگوان کی اچھیا بدلوا لی"۔

میں ابھی کچھ دیر اور وہاں بیٹھتا لیکن کاڑھا سارے کا سارا چھن گیا اور میرے کرنے جوگا اور کوئی کام باقی نہ رہا۔میں اٹھنے لگا تو گاتری نے کہا" میں آپ کے لئے مالٹے لاؤں؟ہمارے گھر بہت ہی اچھے مالٹے آئے ہیں،ریڈ بلڈ۔"

میں نے کہا" مجھے کل سے زکام ہے اور-----"

"زکام ہے!" ماتھر جی نے کڑک کر کہا" تو پھر تمہارے لئے ہر کھٹ چیز منع۔سنگترے،مالٹے اور نیبو کے تو قریب بھی نہیں جانا۔نام تک نہیں لینا ان کا۔مالٹا تو ریشہ بڑھا دیتا ہے،سر اور گردن پکڑ لیتا ہے۔اس کو اندر سے املتاش کی اوولیہ لا کر چٹاؤ"۔

گاتری املتاش کی جوارش لے کر آ گئی تو میں نے ماتھر جی کی آنکھ بچا کر اپنا منہ چمچ کے آگے کر دیا۔ وہ ٹھٹھکی۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ بابو جی سر نیچے جھکائے پونچھا پانچھی کر رہے ہیں تو وہ مجھے جوارش چٹانے لگی اور ہر چاٹ کے بعد چمچ گھما کر آگے کرنے لگی۔

پرسوں جب میری پوتی کی حالت بہت ہی خراب ہو گئی تو میں گھر سے کانچ کا ایک گلاس لے کر مسجد چلا گیا۔ وضو کی ٹونٹی سے اس میں پانی بھرا اور نماز کے بعد ہر نمازی سے اس پر دم کروایا۔

واپسی پر جب میں نے پڑھا ہوا پانی اپنی بہو کو دیا تو اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور بڑی محبت سے کہا "ابو وائرس اور جراثیم پر یہ پانی کس طرح سے اثر انداز ہو سکتا ہے، اس میں تو اپنے بہت سے جراثیم ہوں گے۔ میں نینا کو ابلا ہوا پانی دیت ہوں، وہ بھی نکال دیتی ہے۔ یہ پانی تو اس کے لئے بہت ہی خطرناک ہو گا۔"

جب میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو وہ احتراماً بولی "میں اس کو زمین پر نہیں گراؤں گی، اپنی منی پلانٹ کے پودے میں ڈال دوں گی۔ مجھے پتہ ہے پڑھے ہوئے پانی کو زمین پر نہیں پھینکا کرتے"۔

میں چپ چاپ اس کے کمرے سے یوں باہر نکل گیا جیسے میں آخری مرتبہ گاتری کے گھر سے نکلا تھا!

بدلی سے بدلی تک

اس وقت رات کے بارہ ساڑھے بارہ ہوں گے جب ایک بدلی دبے پاؤں آگے بڑھی اور بستی پر برسنے لگی۔ چھتوں کی بتیاں روشن ہو گئیں۔ چارپائیاں گھسٹنے کی صدائیں بلند ہوئیں۔ بچے زور زور سے چلانے لگے۔ محمود جلدی سے اٹھی اور بو کو گود میں اٹھا کر ننگے پاؤں برساتی میں جا کھڑی ہوئی۔ اس نے ہولے سے اپنے خاوند کو پکارا اور پھر ٹھنکتے ہوئے بچے کو تھپکنے لگی۔ اس کا خاوند جو گرمیوں میں بھی چادر اوڑھ کر سونے کا عادی تھا، چادر بھیگ جانے سے ہڑ بڑا کر اٹھا اور نیند میں اپنی چارپائی گھسیٹتا ہوا برساتی میں آ گیا۔ محمود نے ہولے سے کھنکار کر کہا "میری چارپائی بھی کھینچے لائیے گا۔ میں بو کو لئے کھڑی ہوں۔" اس نے سوئی ہوئی آواز میں " کیا" کہا اور باہر جا کر اس کی چارپائی بھی گھسیٹ لایا۔ پھر وہ بورے کی طرح اپنی چارپائی پر گرا اور وہی سیلی چادر لپیٹ کر دراز ہو گیا۔ محمودہ بو کو کندھے سے لگائے اپنے بستر پر جھکی اور گیلے بستر پر ہاتھ پھیر کر پھر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ بو کو تھپکتے ہوئے اس نے اپنی نگاہیں بہت دور ایک چوبارے کی دیوار میں جلتی ہوئی بتی پر جما دیں، جو برستی ہوئی بوندوں کے پیچھے دیوالی کے آخری چراغ کی طرح جھلملا رہی تھی۔ بو اب کافی بھاری ہو گیا تھا، اس لئے محمودہ یکے بعد دیگرے ایک ٹانگ پر جسم کا بوجھ ڈال کر اسے تھپکتی رہی۔ پیلا سا قمقمہ چھینٹوں کے پیچھے ٹمٹا رہا تھا اور وہ اوپر کے دھڑ کو دائیں بائیں جھلاتے، زبان ہلائے اور لب کھولے بنا اپنے بچے کو لوری دے رہی تھی۔ جب وہ تھک گئی اور اس کے ٹخنوں سے پٹھوں کے کڑکنے کی آواز آنے لگی تو اس نے آگے بڑھ کر اپنے خاوند کا کندھا چھوتے ہوئے کہا "بو کو اپنے ساتھ لٹا لیجئے۔ میرا بستر بالکل بھیگ گیا ہے۔" کندھے پر دباؤ محسوس کر کے اس کے خاوند نے ہی اوں اوہ کرتے کروٹ بدلی اور تین چار مچاکے مار کے پھر خاموش ہو گیا۔ بچے کو اس کے پہلے میں لٹا کر محمودہ اپنی چارپائی کی طرف لوٹ آئی اور بستر پر ایک مرتبہ پھر ہاتھ پھیر کر برساتی میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کونے میں ٹین کی کرسی پر ایک کھٹولی کو جھلنگا پڑا تھا۔ بان کے ڈھیر کو آہستہ سے اٹھا کر اس نے کرسی نکالی اور اپنی چارپائی کے قریب ڈال کر اس پر بیٹھ گئی تھیں۔

اس نے اپنے پاؤں چارپائی کی پٹی پر رکھ لئے، دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبا لیا اور سوچنے لگی کہ اب تو پیٹ میں کوئی خاص درد نہیں اٹھا۔ بو کو اٹھائے رکھنے سے یونہی ذرا سی تھکن محسوس ہونے لگی ہے، ورنہ پیٹ تو بالکل ٹھیک ہے۔

پانچ سال پرانی ایک رات گر بہ پانی سے برساتی میں در آئی اور محمودہ کے گرد بحر ظلمات کی دھند بن کر لپٹ گئی۔ اس رات جب گھر

کے جملہ افراد چھت پر سو رہے تھے، وہ آہستہ سے اٹھی تھی اور بیٹھک کا دروازہ کھول کر گلی میں سوئے ہوئے لوگوں کی چار پائیوں سے بچتی بچاتی ناصر کے یہاں پہنچ گئی تھی۔ ناصر بھی اپنی چار پائی چھوڑ کر نیچے آ گیا تھا کیونکہ اس نے محمودہ کو اپنے بستر سے اٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اس کا ارادہ بھی بھانپ گیا تھا۔

تین دن پہلے محمودہ برآمدے میں ناصر کی ماں سے باتیں کر رہی تھی اور کھیرے کی قاش ایسے ہاتھ میں پنکھی کی ڈنڈی گھما گھما کر اسے ہوا کر رہی تھی۔ ہر مرتبہ وہ پنکھی ذرا روک کر گوشہ چشم سے ناصر کی طرف دیکھتی، جو کوٹھڑی میں کرسی پر بیٹھا اسے تکے جا رہا تھا۔ ناصر کی ماں قرآن شریف پر سبز رنگ کا نیا غلاف چڑھا رہی تھی، محمودہ پنکھی جھل رہی تھی اور ناصر ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنا سر میز پر مارا۔ اس کھڑاک پر محمودہ نے پھر اس کی طرف دیکھا اور ماتھے پر بل ڈال کر سمجھایا کہ ناں، یوں نہ کرو۔ مگر ناصر نے اس کی تحکمانہ التجا پر کوئی توجہ نہ دی اور کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کتنی دیر تک محمودہ نے اسے نہ دیکھا اور وہ اسی طرح چپ چاپ کھڑا رہا۔ جب اس کی ماں سوئی میں دھاگہ ڈالنے کی کوشش کرنے لگی تو محمودہ نے کنکھیوں سے ادھر دیکھا اور اس کے ادھر دیکھتے ہی ناصر نے دیوار میں ٹکر ماری۔ محمودہ سہم گئی اور پنکھی چار پائی پر رکھ کر کہنے لگی "لاؤ خالہ، میں دھاگہ ڈال دوں۔"

خالہ نے سوئی اور دھاگہ اسے دے دیا اور خود کتریں سمیٹنے لگی۔ دھاگہ لے کر محمودہ نے کہا "خالہ یہ تو نسواری رنگ کا ہے، کپڑے پر تو برا لگے گا۔ سبز یا زہر مہرے رنگ کا نہیں ہے؟" خالہ نے دھاگہ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "بھوبل پڑے میری عقل پر، اپنی طرف سے تو میں سبز دھاگہ میں نکال کر لائی تھی اور یہ بن گیا نسواری______بیٹا اب رنگ بھی تو نہیں پہچانا جاتا۔" وہ آہستہ سے اٹھیں اور سبز دھاگہ تلاش کرنے ٹرنکوں والے اندر چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی محمود لپک کر ناصر کے پاس پہنچ گئی اور دانتوں سے انگوٹھا کاٹ کر کہنے لگی "جاؤ، میں نہیں تمہارے ساتھ بولتی۔"

محمودہ نے باہر جھانکی لگا کر کہا "یوں نہ کیا کرو۔ اچھے ہوئے نا۔ ایسے کرو گے تو میں یہاں آیا ہی نہیں کروں گی۔"

ناصر نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور کرسی پر بیٹھ کر سر میز پر ڈال دیا۔ محمودہ کوٹھڑی سے کھسک کر پھر چار پائی پر آ بیٹھی اور سوئی کے ناکے میں پھونکیں مارنے لگی۔

ناصر نے جب آہستہ سے دروازہ کھولا تو محمودہ دہلیز پر کھڑی تھی۔ جب وہ اندر ڈیوڑھی میں داخل ہو چکی تو ناصر نے پھر دروازہ بھیڑ دیا اور وہ بغیر کچھ کہے بیٹھک کے بیچ قالین پر جا کر کھڑے ہو گئے۔

محمودہ نے ہولے سے کہا "آخر کب تک یہ حلیہ بنائے رکھو گے؟"

ناصر بے حد جذباتی ہو گیا اور رونی آواز میں بولا "مجھے مار کیوں نہیں دیتی؟ مجھے ختم کیوں نہیں کر دیتی ہو؟ میرا گلا کیوں نہیں گھونٹتی؟" محمودہ نے مسکرا کر کہا "اچھی بات ہے۔ ابھی لو۔ ابھی تمہارا گلا دبائے دیتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے قاش سا ایک ہاتھ اس کی گدی پر رکھا اور دوسرا گلے پر۔ دونوں ہاتھوں کو ہولے سے دبایا۔ پھر اس کا سر اپنی طرف کھینچ کر اور ایڑیاں اٹھا کر اپنے ہونٹ ناصر کی پیشانی پر رکھ دیئے----اور اتنی حوصلہ مند لڑکی کی مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں پانی بن گئی۔ صوفے پر بیٹھ کر اس نے ناصر سے کہا "میں نے پرسوں تم

سے کہا تھا کہ ایسے نہ رہا کرو، مگر تم مانے ہی نہیں۔ ذکیہ کہہ رہی تھی کہ دو دن تم کالج بھی نہیں گئے اور کمرے میں ہی بیٹھے رہے۔ کیوں نہ گئے بھلا؟"

ناصر نے کہا" مجھے پڑھنا اچھا نہیں لگتا" اور صوفے سے کھسک کر اس کے پاؤں میں بیٹھ گیا۔

محمودہ نے کہا" کالج نہیں جاؤ گے اور اسی طرح بھوت پریت بن کر کمرے میں بند رہو گے تو آخر کب تک؟"

"جب تک تم بٹھائے رکھو گی۔" ناصر نے اس کے گھٹنوں پر سر ڈال دیا اور کہا" جب تک تم بٹھائے رکھو گی محمودہ۔"

"تو پھر تم کہہ کیوں نہیں دیتے؟" محمودہ نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سرگوشی کی۔

"تم اباجی کو نہیں جانتی ہو۔" اس نے سر اٹھا کر کہا" وہ بڑے ظالم ہیں، بڑے ظالم----"

ابھی اس نے فقرہ مکمل بھی نہیں کیا تھا کہ ایک بدلی دبے پاؤں آگے بڑھی اور بستی پر برسنے لگی۔ چھتوں کی بتیاں ایک ایک دو دو کر کے جل اٹھیں اور گلی میں سوئے ہوئے لوگ اپنی اپنی چارپائیاں اٹھا کر اندر بھاگنے لگے۔ اس اچانک گڑبڑ سے گھبرا کر محمودہ اور ناصر ڈیوڑھی میں آ گئے۔ اور جب محمودہ کو معلوم ہوا کہ بوندیں برسنے لگی ہیں تو اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھا اور وہ درد سے دوہری ہو کر فرش پر بیٹھ گئی۔ اپنی دونوں مٹھیاں کس کر اس نے پیٹ میں دے لیں اور نچلے ہونٹوں کو دانتوں میں دبا لیا۔ ایک تیز دھار فولادی چھری اس کے پیٹ میں آہستہ آہستہ گھومنے لگی اور اس کے ماتھے پر ٹھڈے پسینے کے قطرے قطار اندر قطار جمع ہونے لگے۔ بیٹھے بیٹھے اس ے پیٹ کی گٹھڑی سے ایک ہاتھ نکالا اور ناصر کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لی۔ آہستہ آہستہ اس کے ناخن ناصر کی جلد میں دھنسنے لگے اور درد سے بے تاب ہو کر وہ کنگرو کی طرح زانوؤں کے بل کھڑی ہو گئی۔ خوف بھری ملتجیانہ نگاہوں سے اس نے ناصر کی طرف دیکھا، مگر اندھیرے میں اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ اس کا گلا خشک ہوتا جا رہا تھا اور ڈر کے پھندے کی گرہ ہولے ہولے پچکتی جا رہی تھی۔ چھت پر ناصر کی والدہ اور بہن چارپائیاں اندر برساتی میں کھینچ رہی تھیں۔ جونہی چھت سے چارپائیاں گھسٹنے کی آواز نکلتی محمودہ کے پیٹ میں بھی ویسی ہی صدا بلند ہوتی اور اس کے ناخن ناصر کی جلد میں اور گہرے اتر جاتے۔

مگر بدلی جم کے نہ برسی اور ہوا اسے اپنے کاندھوں پر اٹھا کر بستی سے دور لے گئی۔ محمود گرتی پڑتی ایک ایک قدم پر خارزار کا دھوکہ کھاتی اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ گئی اور جب اس نے بیٹھک کے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا تو وہ کھلا ہی تھا۔ اس نے آہستہ سے کھٹکا چڑھایا اور بیٹھک میں صوفے پر لیٹ کر دامن سے اپنے آپ کو ہوا کرنے لگی۔

☆☆☆

جب محمودہ کی منگنی کا سوال پیدا ہوا تو ناصر ڈرا نہیں اور اس نے اپنی ماں سے جی کی بات صاف صاف کہہ دی۔ حسب توفیق ہلکی سی دھمکی بھی دے ڈالی۔ اس کے ظالم اباجی بھی گھبرا گئے اور ناصر کے بڑے بھائی کو تار بھیج کر بلوایا گیا۔ کئی دن تک اس معاملے کو سلجھانے کے لئے گھر میں چھوٹی بڑی نشستیں منعقد ہوتی رہیں، لیکن ناصر کے منہ کی لوئی اتر چکی تھی اور معاملہ جوں کا توں رہا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ اسے

بھائی کے ساتھ بھیج دیا جائے تا کہ بستی سے پرے جا کر اس کی طبیعت بہل جائے۔ چونکہ بڑے بھائی کے اس فیصلہ کے سامنے اسے گردن پھیرنے کی ہمت نہ پڑی اس لئے وہ سگ باش برادر خرد مباش کہتا ہوا ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ بزرگوں کے خیال کے مطابق اس کا جی بہل گیا اور بھائی صاحب کی نگرانی میں اسے کالج داخل کروا دیا گیا۔

ایک سال بعد محمودہ کی شادی ہو گئی۔ اس کی نگاہیں اس ناصر کو تلاش کرنے لگیں جو دیواروں سے سر ٹکرایا کرتا تھا، اس کے پاؤں پر آنکھیں ملا کرتا تھا اور لفظ " محمودہ " کو متعدد روشنائیوں سے لکھ کر چوما کرتا تھا۔ محمودہ کے خاوند میں اور ناصر میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اپنے خاوند کو دیکھ دیکھ کر اسے بار بار ناصر یاد آنے لگا جو بڑا ہی سادہ لوح، الہڑ، غصیل اور بات پر روٹھ جانے والا محبوب تھا۔ شام کے وقت جب وہ اور اس کا خاوند سیر کے لئے نکلتے تو پارک کی روشوں پر وہ کئی مرتبہ مڑ کر دیکھتی کہ اختر کے شعروں کی طرح نتھری ہوئی کرب ناک چاندنی میں آہنی تاروں کی باڑ کے پاس شاید کہیں ناصر ہی کھڑا ہو، جو اسے چھپ کر دیکھنے آیا ہو۔ لیکن اسے اپنے اس خیال پر خود ہی ہنسی آ جاتی اور جب اس کا خاوند پوچھتا تو کہہ دیتی " کوئی خاص بات نہیں۔ سکول کے زمانے کی ایک یاد ابھر آئی تھی۔ " اور اس طرح اس کے خاوند کو محمودہ کے سکول اور اس کی یادوں پر غصہ آنے لگتا۔

محمودہ کا اندازہ تھا کہ اس کی شادی کے بعد ناصر نگری نگری پھرے گا اور گھر کا رستہ بھول جائے گا۔ مگر ناصر گھر کا رستہ نہ بھول سکا اور ان نگریوں کو بھول گیا جو محمودہ نے بسائی تھیں۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ شادی کے بعد اس کی داستان محبت کا ایک آدھ باب اس کے خاوند تک ضرور پہنچے گا۔ وہ عمر بھر ساری کہانی سننے کے لئے اصرار کرتا رہے گا اور وہ مکرتی رہے گی۔ زبان سے انکار کرتی جائے گی لیکن آنکھوں سے بیان کرتی رہے گی۔ اور جہاں اس کے خاوند کو جذبہ رقابت سے تکلیف پہنچے گی، وہاں مسرت بھی ہوگی میری بیوی کوئی معمولی عورت نہیں، لوگ اس کے آستان ناز پر سر نیاز بھی جھکاتے رہے ہیں۔ لیکن یوں نہ ہو سکا۔ اس کے خاوند نے اس سلسلے میں کبھی گفتگو ہی نہ کی۔ اور اگر کی بھی تو اس میں استفسار کا پہلو نہ پیدا ہوا۔ محمودہ کا خاوند نہ الہڑ تھا نہ غصیل اور نہ ہی بات بات پر روٹھنے والا محبوب۔ وہ تو اول سے آخر تک سرکاری ملازم تھا۔ سر سے پاؤں تک سنٹرل ایکسائز انسپکٹر! ہاں کبھی کبھار چھٹ کے دن تھوڑی دیر کے لیے وہ خاوند بھی بن جاتا۔ اور اگر ذرا اور فرصت ملتی تو بو کو ابا بھی! ____ کبھی کبھی تو محمود کے جی میں ایسی بری بات بھی آئی کہ اگر اب کہیں ناصر مل جائے تو اپنے خاوند اور بو کو چھوڑ کر اس کے ساتھ بھاگ جائے۔ مگر یہ بات، بات ہی رہی کیونکہ شادی کے بعد تو اسے ایک مرتبہ بھی ناصر سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا اور نہ ہی ناصر اس کی طرف ملتفت ہوا۔ اسے ناصر کی ٹھنڈی گرمیوں پر رہ رہ کر غصہ آنے لگا اور وہ بڑی قطعیت کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ مرد کی ذات بے وفا ہی ہوتی ہے۔

آج اس واقعہ کے پورے پانچ سال بعد محمودہ ٹین کی کرسی پر بیٹھے ہوئے سوچ رہی تھی کہ یہ کیا ہوا! آج میرے پیٹ میں درد کیوں نہیں اٹھا؟ آج میرے ماتھے پر ٹھنڈا پسینہ کیوں نہیں آیا؟ اور آج ناصر میرے لئے کیوں لرز نہیں رہا؟ حالانکہ ____ حالانکہ ______ اس نے بوندوں کی ٹپاٹپ کو غور سے سنتے ہوئے جی میں کہا آج تو بدلی برسے چلی جاتی ہے، آج تو گلی میں سوئے ہوئے لوگ بڑی شدت سے ہڑ بڑا کر بھاگے تھے اور آج تو چھتوں کی بتیاں کتنی دیر تک جلتی رہی تھیں۔ پھر یہ کیا ہوا؟ آج ویسا خوف کیوں طاری نہیں ہوا؟ وہ روح

فرسا طرب آ گیں خوف! حالانکہ بوندیں ویسی ہی موٹی ہیں اور موسم ویسا ہی بگیلا ہے۔اس کا جی چاہا کہ وہ دروازہ کھول کر پیٹ میں مٹھّیاں دیتی، گرتی پڑتی ناصر کے ساتھ بھاگ جائے------اور پھر لوٹ کر نہ آئے۔مگر وہ کیسے جاتی اور کس کے ساتھ بھاگتی! ناصر تو اس کی ساتھ والی چارپائی پر چادر لپیٹ کے سو رہا تھا اور نیند میں مچا کے مار رہا تھا۔

چاند کا سفر

گورنمنٹ کالج کی طرف مراجعت کے کئی راستے ہیں اور سارے راستے اپنے اپنے رخ پر چل کر اس منزل تک پہنچتے ہیں جو ہر راوین کے من کا مندر ہے۔اس منزل تک پہنچنے کے لئے سب سے مشہور، شیر شاہی اور جرنیلی سڑک تو برتری، تحفظ، منفعت اور پاور کی سڑک ہے جس پر جم غفیر رواں ہے۔لیکن کچھ راستے جذباتی وادیوں سے ہو کر بھی اس منزل طرف جاتے ہیں ______ ہم دونوں کا گورنمنٹ کالج سے بندھن ایک بہت کمزور اور کچے سے دھاگے سے بندھا ہے۔ایک گم نام اور بے نام پگڈنڈی ہے جو خود رو جھاڑیوں اور گھنگیر لے رستوں سے الجھ الجھ کر بڑی مشکل سے من مندر تک پہنچتی ہے اور پھر وہاں سے تب تک اٹھنے کو جی نہیں چاہتا جب تک کہ کوئی وہاں سے اٹھا نہ دے! نکال نہ دے!!

بونو قدسیہ نے اور میں نے گورنمنٹ کالج کو کبھی بھی ایک درس گاہ نہیں سمجھا۔نہ کبھی ہم اس کی علمی روایت سے متاثر ہوئے اور نہ کبھی اس کے استادوں کے تجرعلی سے مرعوب ہوئے۔اس کی قدامت، اس کی عمارت اور اس کی شخصی وجاہت بھی ہمیں مسحور نہیں کر سکی ______ اس سے کبھی کچھ لیا نہیں، مانگا نہیں، دیا نہیں، دلوایا نہیں ۔پھر بھی اس کے ساتھ ایک عجیب سا تعلق قائم ہے جسے ہم آج تک کوئی نام نہیں دے سکے۔دراصل ہم دونوں گورنمنٹ کالج کو درس گاہ نہیں مانتے ______ اس میں "سین" کے حرف کو وافر سمجھتے ہیں!

جب ہمارا پہلا بیٹا پیدا ہوا تو ہم سمن آباد میں رہتے تھے اور اپنے مکان کا کرایہ بڑی مشکل سے ادا کرتے تھے۔میں ریڈیو میں ملازم تھا اور بانو پشاور کے لئے درسی کتابیں لکھ کر ساتھ، ستر روپے مہینہ گھر بیٹھے کما لیتی تھی۔بچے کے دودھ کا ڈبہ بیالیس روپے میں آتا تھا اور وہ ایک مہینے میں تین ڈبے ختم کر جاتا تھا۔اس زمانے میں مٹی کے تیل کا چودہ بتیوں والا چولہا آ گیا تھا اور ہمارا ایندھن کا خرچ کم ہو گیا تھا۔بانو جب گورنمنٹ کالج کی سٹوڈنٹ تھی تو اس کی روٹی پکانی نہیں آتی تھی۔میں جب گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا تو گھر کا سودا لانے کے علم سے ناواقف تھا۔شادی کے بعد ہم دونوں نے یہ دونوں فن سیکھ لئے اور ہنسی خوشی رہنے لگے۔جب انیق ڈیڑھ سال کا ہوا تو جون کے مہینے میں سخت بیمار ہو گیا۔اسے اسہال اور قے کی شکایت ہوئی جو تین دنوں کے اندر اندر بڑھ کر خطرناک صورت اختیار کر گئی۔محلے کی بڑ بوڑھیوں کے کئی نسخے آزمائے لیکن کسی سے افاقہ نہ ہوا۔بچے کی حالت تشویش ناک ہو گئی تو ہمیں کسی نے بتایا کہ اسے ڈاکٹر بروچہ کے پاس لے جاؤ۔بڑی گرمی میں سہ پہر کے چار بجے ہم "سالم تانگہ" کرا کرا سے ڈاکٹر صاحب کے کلینک پر میکلوڈ روڈ لے گئے۔

ڈاکٹر صاحؒ نے بچے کو الٹا پلٹا کر دیکھا۔اس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں کے پپوڑے کھول کر معائنہ کیا اور پھر بانو سے مخاطب ہو کر بولے "بابا تم لوگ کیسا پیرنٹ ہے جو اب اس کو ہمارے پاس لایا ہے۔اس کا میں کیا ٹریٹ منٹ کروں؟" بانو زور زور سے رونے لگی اور جاہل فقیرنیوں کی طرح ہاتھ باندھ کر سسکیاں بھرنے لگی۔اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکلتی تھی اور وہ خوف کے مارے روئے جا رہی تھی____

ڈاکٹر صاحب نے کاؤنٹر پر جا کر پانچ چھ دواؤں کے امتزاج سے دودھیا رنگ کا ایملشن تیار کیا۔اپنی میز کی دراز سے دس پڑیاں نکال کر دیں اور پھر ایملشن کی ایک خوراک مین ایک پڑیا گھول کر مجھے بچے کو مضبوطی سے پکڑ کر گود میں لٹانے کا حکم دیا۔بڑی بے دردی کے ساتھ انہوں نے انیق کے جبڑے میں انگلیاں کھبو کر اس کا منہ کھولا اور دوائی اس کے منہ میں انڈیل دی۔بچہ اپنی نحیف آواز میں بڑے کرب کے ساتھ رویا تو میں نے اسے کندھے سے لگا دی۔گود میں لے کر تو میں اسے کھڑا تھا لیکن بانو قدسیہ خوف سے کانپتی ہوئی اسے تھپکے جا رہی تھی ۔اتنے میں بچے نے منہ بھر کر قے کی------ گرم اور بدبودار تھوڑی سی میرے کندھے پر گری اور باقی ساری فرش پر۔

ڈاکٹر صاحب نے جھلا کر کہا "بابا تم کیسا پیرنٹ ہے، بچے کو سنبھالنا نہیں جانتا۔سارا فرش خراب کر دیا۔یہ کلینک ہے،کوئی تم لوگ کا گھر نہیں۔" ہم دونوں ہی ڈاکٹر صاحب کی ڈانٹ سے گھبرا گئے۔ہمیں ڈاکٹروں کا اور ہسپتالوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔پھر ہماری مالی حالت بھی معمولی سی تھی۔شکل وصورت سے بھی ہم سہم ہی سہم تھے اور بچہ کافی بیمار تھا۔بانو قدسیہ نے اپنا آدھا دوپٹہ تو سر پر محفوظ رکھا اور باقی کے آدھے دوپٹے سے ڈاکٹر صاحب کا فرش صاف کرنے لگی۔

اس نے دونوں گھٹنے زمین پر ٹیکے ہوئے تھے اور بائیں ہاتھ کو آگے بڑھا کر جھکے ہوئے بدن کا سارا بوجھ اس پر تول رکھا تھا وہ روئے بھی جا رہی تھی،شرمندگی سے سر بھی جھکائے جا رہی تھی اور سسکیوں سے اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔اس نے نارنجی اور کاسنی پھولوں والی قمیض پہنی ہوئی تھی۔سبز رنگ کی شلوار تھی اور پاؤں میں ہوائی سلیپر تھے جس میں سے ایک فرش پر ٹاکی مارتے ہوئے اتر گیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا فرش پرانی اینٹوں کا تھا جن کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا۔کچھ اینٹیں نیچے کو ہو گئی تھیں،کچھ سیم کی وجہ سے اوپر کو ابھر آئی تھیں۔اس اونچ نیچ کے درمیان دوپٹے سے جگہ صاف کرنا مشکل کام تھا لیکن بانو نے اپنے روزمرہ تجربے کے زور پر ساری جگہ اچھی طرح سے صاف کر دی۔ڈاکٹر صاحب نے چور آنکھ سے اپنے فرش کو اس کی اصل حالت میں دیکھ کر کہا "بابا تم کیسا لڑکی لوگ ہے،سارا دوپٹہ خراب کر لیا۔اب اس کو باہر جا کر دھوؤ۔اچھی طرح سے صاف کرو،اس میں جراثیم چلا گیا ہے۔بچے کے پاس نہیں لانا یہ کپڑا۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب باہر نلکا ہے؟"

کہنے لگے " کیوں نہیں ہے۔یہ ساتھ باجو میں گھوڑوں کے پانی پینے کا حوض ہے نئیں،اس میں پانی ہی پانی ہے۔جا کر دھوؤ۔"

میں بچے کو کندھے سے لگا کر کھڑا رہا۔بانو نے آدھا دوپٹہ کھیل میں ڈال کر کھنگال لیا۔

ایسے وقت میں اور اس قدر شدید گرمی میں سڑک کنارے پیدل چلنا تو شاید اس قدر مشکل نہیں تھا لیکن ایک بیمار بچے کو کندھے سے لگا کر کلینک سے ذلیل وخوار ہو کر اور زمین سے بوٹ کے پرانے ڈبے کا گتا اٹھا کر اس سے مریض بچے کے چہرے کو چھاؤں کر کے چلنے میں ہم دونوں ایک دوسرے سے کچے پڑے ہوئے تھے اور شرمندگی کی وجہ سے ہمارے سر اوپر نہیں اٹھتے تھے۔

سڑک پر کوئی سواری نہیں تھی اور ہمیں بس پکڑنے کے لئے ابھی بہت دور تک چلنا تھا۔ بچے کا بخار گرمی کی وجہ سے بڑھ رہا تھا اور بانو بار بار اس کے ماتھے اور لٹکتی ہوئی بے جان ٹانگوں کو چھو رہی تھی کہ بخار ہو رہا ہے یا بڑھ رہا ہے۔

اس دھوپ اور گرمی میں ہم اسی طرح سے چلتے رہے---- تھکے تھکے، خوف زدہ، مایوس، بے مراد اور اکیلے۔ بیمار بچے نے کئی مرتبہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن گرمی کی شدت اور روشنی کی چلکورنے اس کے پپوٹے کھلنے نہ دیئے۔ ہم چلتے چلتے، سوچتے سوچتے، چپ چپاتے جی پی او کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں تار گھر کے پاس کئی تانگے کھڑے تھے۔ درخت کی چھاؤں تلے بیمار بچے نے آنکھیں کھول کر ایک سفید گھوڑے کو بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا ڈولتا ہوا سر ساکن کر لیا۔ میں نے تانگے میں بیٹھتے ہوئے کہا" گورنمنٹ کالج "اور بانو حیرانی سے میرا منہ تکنے لگی۔

کالج چھٹیوں کی وجہ سے بند تھا۔ پرندے شاخوں میں چھپے ہوئے تھے۔ اونچی بلڈنگ کے سائے دور دور تک پھیل کر درختوں کے سائے سے مل گئے تھے۔ سارے میں ایک خوشگوار خاموشی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہم اپنے کلاس روم کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ انیق بانو کی گود میں لیٹا ہوا ایک اونچے درخت کی شاخوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے جھک کر اس کی آنکھوں کو قریب سے دیکھنا چاہا تو مجھے بانو کے دوپٹے سے کھٹی کھٹی بو سی آئی۔ میں نے بچے کے چھوٹے سے ماتھے پر اپنا بڑا سا تھکا ماندہ چہرہ رکھا تو مجھے ایک پیاری سی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ بچے نے مسکرا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا تو ماں کی جنت گم گشتہ لوٹ کر اس کی جھولی میں آ گئی۔ بانو نے اس کے پاؤں کو، ماتھے کو اور گلے کو چھو کر خوشی سے میری طرف دیکھا اور کہا" بالکل خواجہ منظور کی طرح مسکرایا ہے "خواجہ صاحب اپنی ساری زندگی میں صرف ایک بار مسکرائے ہوں گے لیکن بانو کے ذہن میں ان کی مسکراہٹ ہمیشہ کے لئے سٹل ہو کر ایک فریم میں جڑی جا چکی تھی۔ پھر ہمارے ذہنوں میں اپنے ایام طالب علمی کا ایکشن ری پلے شروع ہو گیا اور طوطے اپنی چونچوں میں ڈالیا پکڑ کر ہاتھ چھوڑ کر کرتب دکھلانے لگے۔

بیمار بچہ اپنی ماں کی گود سے پھسل کر پہلے ایک سیڑھی پر کھڑا ہوا۔ پھر ہاتھ پکڑ کر دوسری پر اترا اور پھر خود ڈگمگاتے قدموں سے روش پر چلا گیا۔ وہ کوئی ڈیڑھ گز تک ایک طرف اور کوئی دو گز کے قریب دوسری جانب چلا اور پھر تھک کر زمین پر بیٹھ گیا۔

ابھی ہمیں سیڑھیوں پر بیٹھے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ نیلی پگڑی باندھے اور ہارھ میں چابیوں کا موٹا سا گچھا اٹھائے ایک شخص ہمارے طرف آیا اور قریب آ کر پوچھنے لگا" کون لوگ ہو تم"

میں نے کہا" ہم لوگ ہیں۔"

اس نے کہا" یہاں آنے کا اور بیٹھنے کا حکم نہیں ہے۔"

میں نے کہا" کس کا حکم نہیں؟"

" پرنسپل صاحب کا"اس نے درشت لہجے میں کہا اور ہمیں ہاتھ کے اشارے سے اٹھانے لگا۔ میں کہنے والا تھا کہ بانو نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کر دیا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر زمین پر بیٹھے ہوئے اپنے بچے کو اٹھایا اور آہستگی سے چلنے لگی۔ میں بھی خاموشی سے اس کے ساتھ ہو لیا اور ہم تینوں آہستہ آہستہ پھاٹک کی طرف بڑھنے لگے۔ ہم آگے کو جا رہے تھے اور گورنمنٹ کالج پیچھے کو ہٹا جا رہا تھا۔ ہم

نے پیچھے مڑ کر تو نہیں دیکھا لیکن ہمیں پتہ چل رہا تھا کہ ہمارے درمیان فاصلہ بڑھ رہا ہے۔کئی بے ہودہ، نکمے، بدہیت اور بے کار لوگ در گاہوں سے اٹھا دیئے جاتے ہیں اور ان کے بعد فرش دھلا دیئے جاتے ہیں------ لیکن ان کے دلوں کے فرش پر درگاہوں کی مورتیں ویسے ہی قائم رہتی ہیں۔

اصل میں گورنمنٹ کالج تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں۔اس کی طرف رخ نہ بھی ہو تو بھی یاتری اسی کی طرف کا سفر ہی کر رہے ہو تے ہیں۔کہتے ہیں جب Space Shuttle زمین سے چاند کی طرف چھوڑا جاتا ہے تو اس کا رخ چاند کی طرف نہیں ہوتا، پھر بھی اس کا سفر چاند ہی کا ہوتا ہے اور اس کی منزل چاند ہی ہوتی ہے۔

سہیل کی سالگرہ

بڑی مارکیٹ کے سامنے، سڑک کے دونوں طرف بیٹھے ہوئے سینکڑوں لوگوں میں سے وہ یوسف کے سامنے آ کر رکا اور بولو "بارہ چودہ کے کمرے پر ایملشن کروانا ہے۔ گراؤنڈ تیار ہے۔ مال موجود ہے۔ شام تک کر لو گے؟"

یوسف نے مسکرا کر جواب دیا" کیوں نہیں سر۔ پندرہ برس سے یہی کام کر رہا ہوں۔ میرا باپ مشہور سفیدی والا تھا۔ ہمارا خاندانی پیشہ ہے۔ کروں گا کیوں نہیں۔"

ابرار صاحب نے کہا" چالیس روپے ملیں گے۔"

یوسف نے کہا" آپ چالیس بھی نہ دیں۔ کام ملنا چاہئے اور ہاتھ کی صفائی دیکھنی چاہئے۔ باقی اس دنیا میں کیا رکھا ہے سر جی ____!"

سر جی جب اس کو اپنی کار میں سوار کرانے لگے تو یوسف کا کلیجہ کانپ گیا۔ ایسی نئی اور خوبصورت کار اس نے نہ تو کبھی سڑک پر دیکھی تھی اور نہ ہی اس کو خواب میں نظر آئی تھی حالانکہ یوسف جب بھی دیکھتا تھا، کار ہی کے خواب دیکھتا تھا۔ اور یہ شاید اس کے ماموں کی وجہ سے تھا جو کافی مشہور ڈینٹر تھا اور جس کے پاس بہت سی کاریں آتی تھیں۔

ابرار صاحب کی کار میں بیٹھتے ہوئے یوسف نے اپنا ڈبہ بچے کی طرح سینے سے چمٹا لیا اور اس کے اندر کے دونوں برش بالوں کے رخ کھڑے کر دیئے۔ موٹر میں احتیاط کے ساتھ بیٹھنا تو بڑے بڑوں کو نہیں آتا، یوسف بے چارے کا تو یہ صرف چوتھا موقع تھا کہ وہ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ کر اپنا آپ سنبھال کے رکھے اور اپنے گندے ڈول کو سوائے اپنے کپڑوں کے یا اپنے وجود کے اور کسی شے سے لگنے نہ دے۔

گاڑی سٹارٹ کر کے جب ابرار صاحب نے بٹن دبا کر شیشے اوپر چڑھائے تو انہوں نے مسکرا کر پوچھا" پہلے بھی کبھی اتنی بڑی گاڑ میں بیٹھے ہو؟"

یوسف نے کہا" نہیں سر جی۔" اور پھر شرمندہ سا ہو گیا۔

کمرہ بارہ چودہ سے ذرا بڑا تھا اور اس کی گراؤنڈ اتنی تیار نہ تھی جتنی یوسف کو بتائی گئی تھی۔ برش کی کھینچ سے دیواروں پر کہیں کہیں لس آتی تھی اور یوسف کو ریگ مال لگا کر وہ جگہ پھر سے تیار کرنی پڑی تھی۔

سورج غروب ہونے کے بعد جب یوسف نے کمرہ تیار کر دیا تو بیگم صاحب اس کے کام کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ ابرار صاحب کو بھی اس کی آرٹسٹک صلاحیتوں پر کچھ فخر سا ہوا۔ انہوں نے چالیس روپے یوسف کو تھما کر بڑے خوشگوار انداز میں " تھینک یو" کہا اور اس کا کندھا تھپک کر بولے "اسی جگہ بیٹھتے ہوناں ہر روز آ کر۔" یوسف نے کہا........ "بیٹھتا تو اسی جگہ ہوں سر جی، مگر مجھے واپس چھوڑنے کا کوئی بندوبست کرا دیجئے۔ میرا گھر اس جگہ سے بہت ہی دور ہے۔"

ابرار صاحب نے کہا "اگر تم تیز تیز قدم اٹھاتے نہر کا پل کراس کر کے دائیں بائیں دیکھے بغیر بڑے ٹاور تک پہنچ جاؤ تو تمہیں آدھ گھنٹے میں بس سٹاپ مل جائے گا"۔

یوسف نے کہا" آج میرے بیٹے کی سالگرہ ہے سر جی اور اس نے گھر پر اپنے دوستوں کو بلایا ہوا ہے۔ اگر میں وقت پر نہ پہنچا تو اس کی فنکشن رہ جائے گی۔ مجھے ابھی راستے میں کیک بھی خریدنا ہے۔"

بیگم ابرار نے انگریزی میں اپنے شوہر سے کہا" ہمارا کلچرل پیٹرن کتنی تیزی سے بدل رہا ہے ابرار! اب مزدور لوگ بھی کیک کاٹ کر اپنے بچوں کی سالگرہیں منانے لگے ہیں۔ کس قدر خوشی کی بات ہے کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ساتھ ترقی کر رہے ہیں ____!"

ابرار نے کہا" اس وقت نہ تو کوئی ڈرائیور ہے اور نہ ہی چھوٹے صاحب گھر پر ہیں اور نہ ہی میں شام کے بعد گاڑی چلا سکتا ہوں۔ اس لئے تم کو ایسے ہی جانا پڑے گا۔"

بیگم ابرار نے پھر انگریزی میں کہا کہ "ابرار! واپس چھوڑ کے آنا تو ہماری ذمہ داری نہیں ہے ناں" تو ابرار نے جواباً کہا "سویٹ ہارٹ! دراصل ہماری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس کو ہینڈسم معاوضہ ادا کر دیا گیا ہے، پسینہ سوکھنے سے پہلے۔"

جب یوسف گھر پہنچا تو رات کے ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ بازار میں ابھی کچھ لوگ دوکانوں کے سامنے بیٹھے تھے، لیکن اس کے گھر کی گلی بالکل سنسان ہو چکی تھی ______ جب یوسف نے ڈرتے ڈرتے دروازے پر دستک دی تو اس نے کیک کا ڈبہ آگے کر لیا تا کہ سہیل ڈبہ دیکھ کر اسے کچھ کہے نا۔ رضیہ نے دروازہ کھولتے ہی کہا" ابھی روتے روتے سویا ہے۔"

یوسف نے کہا" میں تو سارا راستہ بھاگتا آیا ہوں۔ نہ کوئی بس نہ لاری۔ کام ہی اتنی دور ملا۔ رکشے کے میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ کیک تو بہت ہی مہنگا ہوتا ہے رضیہ!"

رضیہ نے کہا" اب یہ کیک کس کام کا! سہیل بے چارے کی جو بے عزتی ہونی تھی، وہ تو ہو گئی۔"

"اس کے دوست آئے تھے؟" یوسف نے پوچھا۔

" کیوں نہیں آئے تھے۔ سارے ہی تھے۔ نو دس ____ اور جب انہوں نے تالیاں بجائیں تو سہیل میرے ساتھ چمٹ کر زور زور سے رونے لگا۔ میں نے کہا، ہائے ہائے! کوئی اپنی سالگرہ کے دن بھی روتا ہے۔ وہ مجھے دھکا دے کر اندر کوٹھڑی میں بھاگ گیا اور اندر

سے دروازہ بند کرلیا۔"

"اگر مجھے دیر ہو گئی تھی تو تو ہی کچھ کرلیتی رضیہ۔"

"لو میرے پاس کون سے پونڈ رکھے تھے جو میں کوئی بندوبست کرلیتی!"

" کسی سے ادھار سدھار ہی لے لیتی۔"

"اسی طرح سے تو کیا میں نے۔" رضیہ نے فخر سے کہا "جب سارے لڑکے تپائی کے گرد کھڑے ہو گئے تو اللہ نے میرے دماغ میں اپنے فضل سے ایک بات ڈال دی۔ میں کے کاندروں کی دوکان سے ایک ڈبل روٹی ادھار لے آئی۔ چھری تو سہیل صبح سے دھو کے، صاف کر کے، چمکا کے بیٹھا تھا۔"

"بڑی ڈبل روٹی لائی تھی۔" یوسف نے بات کاٹ کر کہا۔

"ہا! تو میں کوئی بیوقوف ہوں جو چھوٹی لاتی، بڑی لائی تھی۔ ساڑھے چار روپے والی ____ پر اس کو پتہ نہیں کیا ہوا۔ جب میں نے ڈبل روٹی تپائی پر رکھ کر اسے کاٹنے کو کہا تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس کے دوست اللہ رکھے تالیاں بجائیں اور یہ روئے جائے۔ الو کہیں کا!"

"تو پھر کس نے کاٹی ڈبل روٹی؟"

"میں نے کاٹی، اور کس نے کاٹنی تھی۔ سب سے دو دو سلائس کھائے بڑے شوق سے...... اور........"

"اور سہیل نے؟"

"یہ تو بھاگ کر اندر گھس گیا کوٹھڑی میں۔ اور اندر سے دروازہ بند کرلیا ____ میں ماسے رفیق کو بلا کر لائی تو انہوں نے آ کر دروازہ کھلوایا ____ سچیں بڑا ہی رویا ساری شام ____ ٹھر میں تیرے لئے لاون گرم کردوں۔"

"رہنے دے! دفع کر!" یوسف نے چڑ کر کہا "میری بھوک ہی ماری گئی ہے۔"

"ہا ____ تیری بھوک کیوں ماری گئی یوسف! صبح اٹھ کر جب کیک دیکھے گا تو آپی سب کچھ بھول جائے گا۔"

یوسف اسی طرح منہ تھتھائے دروازہ کھول کر چپ چاپ باہر گلی میں نکل گیا اور تین سوئے ہوئے کتوں کے آگے کیک رکھ کر بولا "لو کتو کھاؤ۔ موج اڑاؤ۔"

پھر اس نے ہر کتے کی طرف اشارہ کر کے تین مرتبہ زور زور سے کہا:

" کتا! کتا!! کتا!!!"

اور صبح پھر کام پر جانے کے لئے گھر واپس آ کر سو گیا ____

www.HallaGulla.com
پاک سوسائٹی
Virtual Home for Real People
ڈاٹ کام